AUGUST 2011

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

# شعاع

سالگرہ نمبر

## ناولٹ



## انٹرویو



## افسانے



## ناول



## نظمیں، غزلیں



## مکمل ناول

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 5000 روپے


## مستقل سلسلے




اگست 2011
جلد 25 شمارہ 12
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: ۲۰۱، بی ۶، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی



Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

## پہلی بات

شعاع کا سالگرہ نمبر اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ کے بے کراں خلوص اور گہری محبتوں کے ساتھ روشنی کے سفر کا ایک اور سال اختتام پذیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم اور مہربانی سے شعاع نے کامیابی کے 26 سال مکمل کر لیے۔ آج شعاع بے شمار گھروں میں، ذہنوں میں اُجالا بکھیر رہا ہے۔ روشنی پھیلا رہا ہے۔

شعاع کی اس کامیابی میں ——— ہماری مصنفین کا بڑا حصہ ہے۔ جنہوں نے دلچسپ، بامقصد اور شائستہ تحریریں لکھیں۔ ذہنوں کو نکھارنے سنوارنے اور بنانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کی حق دار ہیں۔ ہم اپنی مصنفین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہم اپنی قارئین کو بھی پورے دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔ شعاع کی کامیابی آپ کی کامیابی ہے۔ شعاع آپ ہی کا پرچا ہے۔ آپ کے مشورے تعریف و تنقید ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ مصنفین کا تعاون اور آپ کی پُرخلوص محبتیں ہمارے ساتھ رہیں اور شعاع کامیابی سے آگے بڑھتا رہے۔ آمین۔

اگست کے مہینے سے ایک اور خوشی وابستہ ہے۔ سب سے بڑی خوشی۔ پاکستان کا یوم آزادی۔ 14۔اگست 1947ء وہ تاریخ ساز دن، جب برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی علیحدہ شناخت، ایک وطن حاصل ہوا اور دنیا کے نقشہ پر پاکستان نے جگہ پائی۔

14۔اگست اس بار بھی رمضان المبارک کے مہینے میں آ رہا ہے۔ سچے دل سے اپنے آپ سے ایک سوال پوچھیے۔ کیا مسلمان اور پاکستان کے علاوہ کوئی اور شناخت ہمارے لیے باعثِ عزت ہو سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ ہمارے پاک وطن کو سلامت رکھے۔ آمین۔

### عید نمبر،

شعاع کا ستمبر کا شمارہ عید نمبر ہے۔ عید نمبر میں مستقل سلسلوں کے ساتھ عید سے متعلق تحریریں بھی شامل ہوں گی۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل ہو سکیں۔

### عید سروے،

عید نمبر میں حسب روایت عید سروے بھی شامل ہوگا۔ عید سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ جو روایتی انداز سے منایا جاتا ہے۔ آپ کو یہ تہوار اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو کیسے منائیں گی؟

2۔ اپنی کسی یادگار عید کا احوال لکھیے۔ شادی کے بعد پہلی عید کچھ یاد ہے کیا تحفہ ملا تھا اور کیسے مبارک باد دی گئی تھی؟

3۔ آپ کے گھر میں عید کی کوئی ڈش بنتی ہے؟ آپ کے ہاں عید کیسے منائی جاتی ہے؟

ان سوالوں کے جواب اس طرح لکھیں کہ 18 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

شعاع کا سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا اور ایک بار پھر ہمیشہ کی تاکید۔ ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔



## حمد باری تعالیٰ

اندھیرے چیر کر اُن میں اُجالا تُو ہی کرتا ہے
ہر ایسا کام اے اللہ تعالیٰ تُو ہی کرتا ہے

شکستِ فاش دیتا ہے ہمیشہ تُو ہی باطل کو
ہر اک موقع پہ حق کا بول بالا تُو ہی کرتا ہے

جہاں میں وقت پیدائش سے لے کر آخری دم تک
ہر انسان اور ہر حیوان کو پالا تُو ہی کرتا ہے

بسا اوقات ہم مایوس ہو جاتے ہیں گھبرا کر
ہر ایسے وقت میں مشکل کو ٹالا تُو ہی کرتا ہے

زمیں پر گُل شگفتہ، آسماں پر نجم رخشندہ
ہے یہ کام تیرے کرنے والا تُو ہی کرتا ہے

یہ نرمی اور اس جیسے کروڑوں ہی بشر ہوں گے
بچا کر جن کو گرنے سے سنبھالا تُو ہی کرتا ہے

خالد بن حمی

## نعت رسولِ مقبول

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس نے خون کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اس پر کہ دشمن کو حیاتِ جاوداں دے دی
سلام اس پر ابوسفیان کو جس نے اماں دے دی
سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اس پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں
سلام اس پر وطن کے لوگ جس کو تنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ گھر والے بھی جس سے جنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا
سلام اس پر جو دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اس پر کہ جس کی ذات فخرِ آدمیت ہے
سلام اس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی
سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں
سلام اس پر بروں کو جس نے فرمایا کہ میرے ہیں

ماہر القادری

ادارہ

# پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

## حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ چھوڑنا

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ یہ صحابی قبیلہ بنو عبدالاشہل کی شاخ بنو عبداللہ بن کعب سے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑ سوار دستے نے ہمارے قبیلے پر حملہ کیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کھانا کھا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آجاؤ' کھانا کھالو۔" میں نے کہا' میرا روزہ ہے۔ فرمایا "بیٹھ جاؤ! میں تمہیں روزے کی بات بتاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کردی ہے اور مسافر' حاملہ اور دودھ پلانے والی کو روزہ یا روزے معاف کردیے ہیں۔" اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں لفظ فرمائے یا ان میں سے ایک لفظ فرمایا۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں شریک نہ ہوا۔"

## رمضان کے روزوں کی قضا سے متعلق احکام و مسائل

1 جس وقت یہ واقعہ پیش آیا' اس وقت حضرت انس بن مالک کعبیؓ مسلمان ہوچکے تھے' جبکہ ان کا قبیلہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔

2 مسافر کو آدھی نماز معاف ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جن نمازوں میں چار رکعت فرض ہیں' ان میں دو رکعت فرض نماز ادا کی جائے۔ فجر اور مغرب کی نماز سفر میں بھی پوری پڑھی جاتی ہے۔

3 روزے دار کو کھانے کی دعوت دی جائے تو وہ اپنے روزے کا اظہار کرسکتا ہے' یہ ریا میں شامل نہیں۔

4 مسافر' بچے کو دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لیے رعایت ایک ہی سیاق میں بیان ہوئی ہے' مگر تفصیل میں فرق ہے کہ مسافر کو روزہ معاف ہے' مگر قضا ادا کرنا واجب ہے۔ اور مرضعہ اور حاملہ کی بابت علماء کی چار آراء ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ایک رائے تو یہ ہے کہ ان کے لیے فدیہ ہی کافی ہے' بعد میں قضا نہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ان پر قضا ہے نہ فدیہ۔ یہ رائے حافظ ابن حزم کی ہے جو انہوں نے "المحلی" میں بیان کی ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ فدیہ طعام کے علاوہ بعد میں وہ قضا بھی دیں۔

چوتھی رائے یہ ہے کہ وہ مریض کے حکم میں ہیں' وہ روزہ چھوڑ دیں' انہیں فدیہ دینے کی ضرورت نہیں اور بعد میں قضا دیں۔

مولانا محمد علی جانباز نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ نیز سعودی علماء کی بھی یہ ہی رائے ہے۔

## رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میرے ذمے رمضان کے روزے ہوتے تھے تو میں ان کی قضا نہیں دیتی تھی حتیٰ کہ شعبان آجاتا۔"

1 رمضان میں عذر شرعی کی بنا پر جو روزے چھوٹ جائیں' ان کی قضا سال بھر میں کسی وقت بھی دی جاسکتی ہے' ضروری نہیں کہ وہ روزے شوال ہی میں رکھے جائیں۔

2- حیض روزے کے منافی ہے' اس لیے ان ایام میں روزہ رکھنا منع ہے۔

3- اگر روزہ رکھا ہوا ہو اور دن کے وقت حیض شروع ہوجائے تو روزہ ختم ہوجائے گا' وہ روزہ شمار نہیں ہوگا۔

4- حیض و نفاس کے عذر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح بیماری یا سفر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزے بعد میں رکھے جاتے ہیں۔

## جس نے بھول کر روزہ کھول دیا (اس کے لیے کیا حکم ہے؟)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھایا' اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے' اسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔"

## فوائد و مسائل

1- اسلام کے احکام میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بھول جانا انسان کی فطرت ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھول کر کیے ہوئے کام کو گناہوں میں شمار نہیں کیا۔ روزے کے بارے میں مزید رحمت فرمائی کہ کھانے پینے کے باوجود روزے کو قائم قرار دیا۔ اللہ کے کھلانے پلانے کا یہ ہی مطلب ہے۔

2- بھول کر کھانے پینے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ گناہ ہو یا نہ ہو' روزہ تو قائم نہیں رہا' کیونکہ روزہ تو کھانے' پینے سے پرہیز کا نام ہے اور وہ پرہیز ٹوٹ گیا ہے۔ روزہ دار کو چاہیے کہ روزے کا باقی وقت اسی طرح گزارے جس طرح عام حالات میں روزے کی پابندیوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس کا یہ روزہ شرعاً صحیح ہوگا' لہٰذا اس کی قضا لازم نہیں ہوگی' نہ کوئی کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

## روزے کی حالت میں قے سے متعلق احکام و مسائل

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ابر آلود دن میں ہم نے روزہ کھول دیا۔ (یہ سمجھے کہ سورج غروب ہوچکا ہے) لیکن پھر (بادل ہٹ گئے اور) سورج نکل آیا۔"

(ابو اسامہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔) میں نے ہشام بن عروہ رحمت اللہ علیہ سے کہا۔ کیا انہیں (روزے کی) قضا کا حکم دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا۔ یہ تو ضروری تھا۔

### فائدہ

1- حدیث میں مذکورہ صورت بھول کر کھانے پینے سے مختلف ہے کیونکہ انہوں نے بھول کر نہیں کھایا پیا بلکہ ارادے سے اپنے خیال میں روزہ کھولا تھا۔ اگرچہ غلط فہمی کی بنا پر وقت سے پہلے کھول دیا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ گناہ گار تو نہیں ہوئے' لیکن روزہ یقیناً "ناقص" ہوگیا۔ ایسے روزے کی قضا کی بابت علماء میں اختلاف ہے' تاہم جمہور علماء کے نزدیک ایسی صورت میں افطار کیے ہوئے روزے کی قضا واجب ہے۔

## روزے دار کو قے آجائے (تو کیا حکم؟)

حضرت فضالہ بن عبید انصاریؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دن ان کے پاس تشریف لائے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پانی کا) برتن طلب فرمایا اور پی لیا۔ ہم نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو وہ دن ہے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔ فرمایا' ہاں' لیکن مجھے قے آگئی تھی۔"

### فائدہ

1- روزے کے دوران میں قے کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے' اگر کسی وجہ سے قے کرنی پڑے تو اس سے

روزہ ٹوٹ جاتا ہے، خواہ روزہ فرضی ہو یا نفلی، تاہم فرضی روزے کی قضا دینا ضروری ہے۔

## روزے میں مسواک کرنا اور سرمہ لگانا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "روزے دار کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل مسواک بھی ہے۔"

1۔ یہ روایت اگرچہ سنداً "ضعیف ہے۔ تاہم صحیح روایات سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا ثابت ہے۔ اس سے روزے میں فرق نہیں آتا۔ امام بخاری رحمت اللہ علیہ نے صحیح البخاری میں کتاب الصوم میں ایک باب کا عنوان اس طرح درج کیا ہے۔

"روزے دار کا تازہ یا خشک مسواک کرنا۔" اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عامر بن ربیعہؓ سے مذکور ہے، انہوں نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے اتنی بار دیکھا ہے کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔

## روزے دار کے لیے غیبت اور فحش گوئی (کی ممانعت) کا بیان

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے جھوٹ اور بے ہودہ باتوں اور بے ہودہ اعمال سے اجتناب نہ کیا، اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص کھانا پینا ترک کردے۔"

## فوائد و مسائل

1۔ روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ کا حصول ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔"

2۔ تقویٰ کے حصول کے لیے صرف کھانے پینے سے پرہیز کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی شعوری کوشش مطلوب ہے۔ روزہ رکھ کر ہم اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے بھی اللہ کے حکم کے مطابق پرہیز کرتے ہیں تو جو کام پہلے بھی ممنوعہ ہیں، ان سے بچنا زیادہ ضروری ہے، تاکہ مومن ان سے پرہیز کا عادی ہوجائے۔

3۔ شریعت اسلامیہ میں روزے کے دوران بات چیت کرنا جائز ہے بلکہ چپ کا روزہ شرعاً "منع ہے۔

4۔ عبادات انسان کے روحانی اور جسمانی فائدے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ان اعمال پر آخرت میں بھی عظیم انعامات عطا فرماتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بعض روزے داروں کو روزے سے بھوک کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بعض قیام کرنے والوں کو قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

## فوائد و مسائل

1۔ اخلاص کے بغیر نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔

2۔ عبادت میں جس طرح ظاہری ارکان کی پابندی ضروری ہے اسی طرح باطنی کیفیات اخلاص، اللہ کی محبت، اللہ کا خوف، اللہ سے امید وغیرہ بھی مطلوب ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ظاہری عمل بے فائدہ ہے۔

3۔ اگر کسی موقع پر مطلوبہ باطنی اور قلبی کیفیت موجود نہ ہو تو نیکی کو ترک نہیں کردینا چاہیے، کیونکہ اس کا کم از کم یہ فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا کہ فرض کا تارک شمار نہیں ہوگا اور وہ نیکی مسلسل انجام دینے سے امید کی جاسکتی ہے کہ دل پر تھوڑا بہت اچھا اثر لازما" ہوجائے گا۔

4۔ عبادات میں ان کے آداب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

## جواب

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم میں سے کسی کا دن کو روزہ ہو تو وہ فحش گوئی نہ کرے اور ناروا حرکت نہ کرے، اگر کوئی اس



سے بدتمیزی کرے تو کہہ دے، میں روزے دار آدمی ہوں۔"

## فوائد و مسائل

1۔ روزے کے فوائد کما حقہ حاصل کرنے کے لیے آداب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

2۔ جہل (ناروا حرکت) سے مراد لڑائی جھگڑے کی بات ہے، یعنی روزے دار کو لڑائی میں پہل بھی نہیں کرنا چاہیے اور اگر کوئی دوسرا شخص ایسی بات کرے یا ایسی حرکت کرے جس سے روزے دار کو غصہ آجائے تب بھی روزے دار کو جواب میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ اپنے روزے کا خیال کرتے ہوئے برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہوئے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

3۔ یہ کہنا کہ میں روزے سے ہوں، اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دل میں اپنے روزے کا خیال کرے تاکہ جھگڑے سے بچنا ممکن ہوسکے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جھگڑنے والے سے کہہ دے کہ میں تمہاری غلط حرکت کا جواب تمہارے انداز میں اس لیے نہیں دے رہا کہ میرا روزہ مجھے اس سے روکتا ہے۔ امید ہے اس سے اس کو شرم آجائے گی اور وہ روزے دار کے روزے کا احترام کرتے ہوئے جھگڑا ختم کردے گا۔

## سحری کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔"

## فوائد

1۔ السحور کا لفظ سین کی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے اور پیش سے بھی۔ سین کی زبر سے سحور کا مطلب وہ طعام ہے جو روزہ شروع کرنے سے پہلے کھایا جاتا ہے اور سحور (سین کی پیش سے) کھانے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کھانا کھانا باعث برکت ہے۔ اس کا ثواب بھی ملتا ہے کیونکہ یہ ایک مسنون عمل ہے اور اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی بھی ہوتی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کھائے جانے والے کھانے میں ایک خاص برکت ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق سنت نبوی سے ہے اور اس کی وجہ سے غیر مسلموں کی مشابہت سے بچاؤ بھی ہوجاتا ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ سحری نہیں کھاتے۔

2۔ ثواب کا تعلق مشقت سے نہیں، احکام شریعت کی پابندی سے ہے۔ سنت کے مطابق تھوڑا اور آسان عمل اس سے زیادہ اور مشقت طلب عمل سے بہتر ہے، جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سحری کے کھانے کے ساتھ دن کے روزے کے لیے مدد حاصل کرو، اور قیلولے کے ذریعے سے قیام اللیل (نماز تہجد) کے لیے مدد حاصل کرو۔"

## سحری دیر سے کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا۔

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر اٹھ کر نماز کی طرف چلے۔" (حضرت انسؓ نے فرمایا) میں نے کہا: "ان دونوں کاموں کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟" حضرت زیدؓ نے فرمایا۔ "پچاس آیتوں کی تلاوت جتنا۔"

1۔ اگرچہ سحری کا کھانا صبح صادق سے کافی پہلے بھی کھایا جاسکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ رات کے آخری حصے میں صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے کھایا جائے۔

2۔ فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کے بعد مختصر وقفہ دے کر فجر کی نماز ادا کی۔

## روزہ کھولنے میں جلدی کرنا

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔"

### فوائد

1۔ عبادت میں شریعت کی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھنا دنیا اور آخرت کے نقصان کا باعث ہے۔
2۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔ روزہ جلدی کھولا کرو' کیونکہ یہودی دیر کرتے ہیں۔"

## روزہ کس چیز سے کھولنا مستحب ہے؟

حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب کوئی روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ خشک کھجور سے روزہ کھولے' اگر (کھجور) نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لے' کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔"

### فوائد

1۔ تمر خشک کھجور کو کہتے ہیں۔ جامع الترمذی کی دوسری حدیث میں تمر (خشک کھجور) کے علاوہ رطب (تر کھجور) سے روزہ کھولنا بھی مذکورہ ہے۔
2۔ کھجور سے روزہ کھولنا اس لیے افضل ہے کہ یہ بابرکت پھل ہے اور پانی کا تعلق طہارت اور پاکیزگی سے ہے۔ روزہ روحانی پاکیزگی کا باعث ہے اور پانی ظاہری پاکیزگی کا۔ اس مناسبت سے پانی سے روزہ کھولنا بھی مستحب ہے۔

## ہمیشہ روزے رکھنے کا بیان

حضرت عبداللہ بن شخیرؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے ہمیشہ روزے رکھے' اس نے نہ روزہ رکھا' نہ افطار کیا۔"

### فوائد

1۔ عبادت میں شرعی حد سے تجاوز کرنا منع ہے۔
2۔ ہمیشہ روزہ رکھنا منع ہے۔
3۔ "نہ روزہ رکھا' نہ افطار کیا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ اسے روزے رکھنے کا ثواب ملا' نہ روزے چھوڑنے کا آرام نصیب ہوا۔ گویا نہ اخروی اور روحانی فائدہ حاصل ہوا اور نہ دنیوی اور جسمانی فائدہ حاصل ہوا' بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرنے سے وہ صورت بن سکتی ہے کہ "نیکی برباد' گناہ لازم۔"
4۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ہمیشہ روزے رکھنے شروع کیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمادیا۔ ان کی بار بار کی درخواست پر زیادہ سے زیادہ جو اجازت دی' وہ داؤد علیہ السلام والے روزے کی تھی' یعنی ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا۔ جب حضرت عبداللہؓ نے فرمایا "میں اس سے افضل عمل کی طاقت رکھتا ہوں۔" یعنی اس سے زیادہ روزے رکھ سکتا ہوں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "اس سے کوئی افضل نہیں۔"
5۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے ہمیشہ روزہ رکھا' اس نے روزہ رکھا ہی نہیں۔"

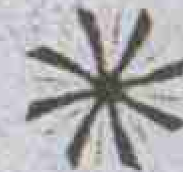





# انوارِ سہیلی (کلیلہ و دمنہ)

ترجمہ' پروفیسر معین الدین دردائی تبصرہ' آمنہ زریں

انسان کو متمدن بننے کے سفر میں حاصل ہونے والے تجربات' مشاہدات اور نتائج آنے والے لوگوں کے لیے سبق آموز بن جاتے ہیں اور یہ ہی حکمت کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ حکمت لوک دانش بھی ہو سکتی ہے.... جس کے حامل بغیر کسی سند کے اپنی زندگی میں درپیش معاملات سے نمٹتے ہیں اور یہ بلند درجہ معاملات میں بھی اتنی ہی مطلوب اور کارگر ثابت ہوتی ہے' یعنی معاملات ریاست۔

"انوار سہیلی۔" کلیلہ و دمنہ کے نام سے بھی معروف ہے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہوئے ہمارے لیے اردو میں اسے "پروفیسر معین الدین دردائی" نے ترجمہ کیا ہے اور وہ اس کے پیش لفظ میں تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کئی ہزار سال پہلے بیرپائے نامی ایک پنڈت نے ہندوستان کے ایک راجا دابشلیم کے لیے ایک کتاب لکھی تھی اور کوشش کی تھی کہ بادشاہوں کے لیے حکمرانی' عدل گستری' اعیان مملکت کی وفاداری اور دشمنوں سے نجات حاصل کرنے میں یہ کتاب مشعلِ ہدایت کا کام دے اور سوائے حکمران کے کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

آہستہ آہستہ کسریٰ نوشیرواں کو اس کی خبر ملی کہ ہندوستان کے ایک راجا کے پاس ایک ایسی نادر کتاب ہے جس میں آئین جہاں داری کو بہت دلکش انداز میں چرند و پرند کی زبان سے پیش کیا گیا ہے تو وہ اس کو دیکھنے کا مشتاق ہوا اور اپنے دربار کے ایک مشہور ماہر السنہ حکیم برزویہ کو اس مقصد کے تحت ہندوستان بھیجا۔ حکیم برزویہ ایک عرصے تک ہندوستان میں رہا' مختلف حیلوں اور تدابیر سے اس کتاب کی نقل حاصل کرکے واپس ہوا اور سنسکرت سے پہلوی زبان میں ترجمہ کرکے نوشیرواں کی خدمت میں پیش کی۔"

ایک بادشاہ کے ذکر سے کتاب کا پہلا باب کھلتا ہے۔

اس بادشاہ کو لوگ ہمایوں خال کے نام سے پکارتے تھے' کیونکہ اس کے عدل سے رعایا خوش اور اس کی بخشش سے سخاوت سے بوڑھے' مجبور اور محتاج سب ہی چین کی بنسی بجاتے تھے۔ اس بادشاہ کا ایک وزیر تھا جس کی صائب رائے سے امور سلطنت کی گتھیاں آسانی سے سلجھ جاتی تھیں اور اس کی تدبیر سے سلطنت میں اٹھنے والے بہت سے فتنے دب جاتے تھے۔

اسی وزیر کی ہمراہی میں بادشاہ شکار کو نکلا۔۔۔ واپسی کے سفر میں کسی پہاڑ کے سبزہ زار میں آرام کی خاطر رکنا اور اس دوران وزیر اور بادشاہ کی آپس کی گفتگو دراصل اس کتاب کے رازوں سے پردہ اٹھانے کے موجب بنے۔

"ہمایوں خال نے پوچھا کہ "یہ زبردست حاکم کیسا ہونا چاہیے اور ملک و ملت کے کاموں کی بجا آوری میں اس کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟"

جمستہ رائے نے جواب دیا کہ اس حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ انصاف کی باریکیوں اور سیاست کے قوانین سے پوری طرح واقف ہو' ورنہ ملک زوال سے قریب تر ہو جائے گا اور سلطنت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ جس بادشاہ نے اپنے امور کا دارومدار حکمت اور سیاست پر رکھا اس کی مملکت کے آباد اور رعایا کے دل شاد ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

وزیر کے بیان کے مطابق عظیم ہندوستان میں ایک

بیدار مغز اور رعایا پرور راجا تھا جس کی سلطنت میں انصاف کا دور دورہ تھا۔

ایک دن وہ اپنے دربار میں جشن شاہانہ منا رہا تھا۔ لطف اندوز ہونے کے بعد اس کو نصیحت آمیز باتوں کے سننے کی رغبت ہوئی چنانچہ حکماء علماء فضلاء نے اچھے اخلاق پر گفتگو شروع کی۔

آخر بات جود و سخا پر آکر رکی اور تمام حکماء اس بات پر متفق ہو گئے کہ سخاوت تمام اخلاق اور صفات میں کامل اور بہتر ہے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ چنانچہ سارا دن زر و جواہر تقسیم ہوتا رہا۔ شام ہوئی راجا اپنی خواب گاہ میں جا کر سو رہا.... نیند میں اسے اپنے عمل کی قبولیت کا اشارہ ملا اور ساتھ ہی ایک مدفون خزانے کی بشارت بھی۔

بادشاہ سفر کر کے اس جگہ تک پہنچا۔ زر و جواہرات کے بھرے ہوئے صندوق اور ڈبے اس کو عطا ہوئے۔ مگر ایک ڈبے کا تالا کسی طور نہ کھلا.... آخر کار جب کھلا تو اس میں سے خوب صورت ڈبیا نکلی، جس میں سفید ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا اور اس پر اجنبی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس تحریر کو پڑھنے والے کی تلاش شروع ہوئی اور تمام ہوئی۔ حکیم نے اس نوشتہ کو لیا اور تھوڑی دیر تک حروف کو غور سے دیکھتا رہا، پھر ادب سے عرض کیا کہ....

"اے راجا! یہ بڑی مفید تحریر ہے اور حقیقی معنوں میں گنج نامہ یہ ہی ہے۔" اس تحریر کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"میں ہوشنگ بادشاہ اس خزانے کو رائے دابشلیم کے لیے امانت چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے غیب سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خزانہ اسی عظیم راجا کے نصیب کا ہے، اس لیے زر و جواہر کے ساتھ وصیت نامہ بھی اس کے لیے رکھ رہا ہوں کہ جب وہ اس خزانے کو پائے تو میری ان وصیتوں کو بھی پڑھے۔

راجا نے اگر میرے بیان کردہ چودہ اصولوں کو نہ مانا تو اس کی سلطنت کی بنیاد ہمیشہ ہلتی رہے گی اور مملکت غیر مستحکم رہے گی۔

پہلی وصیت یہ ہے کہ اپنے ملازموں میں سے جس کو اپنا مقرب خاص بنائے، اس کے خلاف دوسروں کی شکایت ہرگز نہ سنے، کیونکہ کسی کے مقرب خاص ہو جانے کے بعد لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بادشاہ کی طبیعت کو اس سے برگشتہ کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ لگائی بجھائی کرنے والے، بات چننے والے اور چغل خوروں کو اپنی مجلس میں نہ آنے دے، کیونکہ یہ لوگ فسادی، جھگڑا کرنے والے اور برے ناپسندیدہ عناصر ہوتے ہیں۔ اگر کسی میں یہ عیب دیکھے تو جلد سے جلد اس آگ کو سیاست کے پانی سے بجھا دے۔

تیسری وصیت یہ ہے کہ اپنے ارکان سلطنت اور امرا سے ربط ضبط اور مراعات کے ساتھ پیش آئے، کیونکہ مخلص دوستوں کی موافقت اور متحد مصاحبوں کی مدد سے ہی سارے کام مکمل طور پر انجام پذیر ہوتے ہیں۔

چوتھی وصیت یہ ہے کہ دشمن کی مہربانی اور خوشامد پر مغرور نہ ہو۔ وہ کتنی ہی چاپلوسی اور منت سماجت کرے، اس پر بھروسا نہ کیا جائے، کیونکہ دشمن سے کبھی بھلائی سرزد نہیں ہوتی۔

پانچویں وصیت یہ ہے کہ جب گوہر مراد مل جائے تو اس کو معمولی سمجھ کر حفاظت میں کمی نہ کرے اور اپنی غفلت سے اس کو ضائع نہ کرے، کیونکہ پھر اس کے حاصل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور پشیمانی سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

چھٹی وصیت یہ ہے کہ کاموں کی انجام دہی میں بے توجہی اور عجلت نہ کرے، بلکہ رک رک کر نرمی اور آہستگی سے انجام دے، کیونکہ جلدی کرنے میں بہت سے نقصانات اور صبر و سکون میں بے حساب فائدے پوشیدہ ہیں۔

ساتویں وصیت یہ ہے کہ کسی وجہ سے تدبیر کو ہاتھ سے نہ جانے دے، اگر دشمنوں کی جماعت اس کے قتل پر متفق ہو جائے اور وہ مصلحت اس میں دیکھے کہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی طرف ملا کر چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے تو ایسا کرنے میں ہرگز نہ ہچکچائے۔

آٹھویں وصیت یہ ہے کہ کینہ پرور اور حاسد لوگوں سے پرہیز کرے اور ان کی چرب زبانی اور خوشامد پر پھول نہ جائے، کیونکہ کینے اور حسد کا پودا جب کسی سینے میں نصب ہو جاتا ہے تو پھر نقصان اور ایذا کا پھل دیے بغیر نہیں رہتا۔

نویں وصیت یہ ہے کہ عفو اور درگزر کو اپنا شعار بنائے، ملازموں کو معمولی خطا اور تقصیر پر مورد عتاب نہ بنائے۔

دسویں وصیت یہ ہے کہ کسی شخص کے درپے آزار نہ ہو، مبادا "بدلہ برائی کا برائی ہے" کے اصول پر اس کو ضرر پہنچ جائے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے احسانات کی بارش سے لوگوں کو سیراب کرے تاکہ "کر بھلا ہو بھلا" کے مطابق وہ بھی اپنی مراد کو پہنچے۔

گیارہویں وصیت یہ ہے کہ جو کام طبیعت اور مزاج کے مطابق نہ ہو اس کو ہرگز اختیار نہ کرے، کیونکہ لوگ اپنی طبیعت کے خلاف کام میں ہاتھ تو ڈال دیتے ہیں، لیکن درمیان میں ہی اسے نا تمام چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا کے مطابق نشانہ ملامت بنتے ہیں۔

بارہویں وصیت یہ ہے کہ بردباری اور استقلال کو اپنا شعار بنائے، کیونکہ بردبار کا دل بڑا پیارا ہوتا ہے۔

تیرہویں وصیت یہ ہے کہ امانت دار اور قابل اعتماد ملازموں کا انتخاب کرے اور خیانت کرنے والے غدار لوگوں کو اپنے گرد پھٹکنے نہ دے، کیونکہ سلطنت کے مقربین اور کارندے امانت دار ہوں گے تو نہ صرف راز مملکت کی حفاظت کریں گے بلکہ عوام کو بھی دکھ نہ پہنچائیں گے۔ اگر خدانخواستہ یہ سیاہ دل اور خائن ہوں اور بدقسمتی سے بادشاہ ان پر اعتبار بھی کرتا ہو تو ملک کی تباہی اور بربادی یقینی ہے اور برے نتائج کا جلد از جلد مرتب ہونا بھی ضروری ہے۔

چودھویں وصیت یہ ہے کہ ستم دوراں اور گردش ایام سے گھبرا کر بددل نہ ہو اور ہمت نہ ہارے، کیونکہ یہ دنیا ایسا ہے کہ عقل مند اور دانش ور لوگ ہی اکثر مصائب کا شکار رہتے ہیں اور ناکارہ اور غافل لوگ عیش کیا کرتے ہیں۔ آدمی کو یقین رکھنا چاہیے کہ بغیر فضل باری تعالیٰ کے کوئی اپنے مقصد اور مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک فضل باری نہ ہو، فضل و ہنر سب بے کار پڑے رہ جاتے ہیں۔

ان چودہ وصیتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک داستان اور واقعہ وابستہ ہے۔ اگر رائے دابشلیم کو ان کی تفصیل معلوم کرنے کی خواہش ہو تو وہ کوہ سراندیپ جہاں آدم علیہ السلام نے نزول فرمایا تھا کی طرف روانہ ہو، یہ گتھی وہیں سلجھے گی اور رائے اپنے مقصد کو پہنچے گا۔

راجا نے حکیم کی زبانی جب اس سفید کاغذ پر لکھا ہوا پیغام سنا تو اس تحریر کو عزت سے چوما اور اپنے بازو سے باندھ لیا اور کہا کہ خواب میں بتایا گیا اصل خزانہ یہ ہی ہے جس کے اسرار زر و جواہر سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ اس عہد نامے کے شکرانے میں تمام خزانہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، تاکہ اس کا ثواب ہوشنگ بادشاہ کو پہنچے اور مجھ کو بھی کچھ صلہ مل جائے۔

یوں اصل قصہ شروع ہوا، بادشاہ نے سفر کا قصد کر لیا۔ اس سفر سے پہلے کی گئی مشاورت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں، مگر آگے بھی چلنا ہے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ اصول تو جہاں بانی کے امور کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور ان سے عام آدمی کو کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ تو یہ بھی ٹھیک ہے۔

مگر ہر فرد کا اپنا اک جہاں ہے۔ ہر فرد ایک نظام میں داخل اور موجود ہے۔ اس کو وہاں خوش اسلوبی سے چلنے کے لیے رہنما اصولوں کی ضرورت پڑتی ہی ہے اور یہ اصول ہر فرد خود پر لاگو کر سکتا ہے۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہر فرد بذات خود ایک جہان ہے۔ ایک نظام کا نگراں ہے۔ وہ اپنے ذہن و دل، زبان، ہاتھ پیروں کی مصاحبت اور رفاقت سے ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ تو یہ اصول ہر طور سے فرد کی اصلاح احوال اور ترقی کے لیے پیش نظر رکھے جا سکتے ہیں۔

اور رہ گئے حکمران؟ حق ہا.... مجھے یقین اور امید واثق ہے کہ جتنی دفعہ آپ حکمرانوں کی رعایا پروری اور انصاف پسندی کا تذکرہ سنیں گی، آپ کا دل...

"تڑسے" گا۔ یہ پنجابی کا لفظ ہے، جس کا سلیس ترجمہ مچلے یا تڑپے گا" کرلیں۔

اب نصیحتوں سے وابستہ داستانوں کی طرف چلیں....

پہلی نصیحت سے وابستہ داستان دو گیدڑوں کی ہے۔

"دو مکار گیدڑ شیر کے خادموں میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک کا نام کلیلہ اور دوسرے کا نام دمنہ تھا۔ دونوں ہی بڑے چالاک، ذہین اور عیار تھے، لیکن دمنہ، کلیلہ سے بڑھ کر تھا اور اس کو عزت و جاہ کی بڑی ہوس تھی۔ اس نے اپنی فراست سے پتا چلا لیا کہ شیر پر کس چیز کا خوف غالب ہے، چنانچہ ایک دن اس نے کلیلہ سے کہا کہ "اپنے بادشاہ شیر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے چلنے پھرنے اور گھومنے پھرنے کو کیوں خیرباد کہہ دیا ہے؟"

کلیلہ نے جواب دیا کہ "تجھ کو ان باتوں سے کیا کام۔ کہاں تو اور کہاں مملکت کے راز۔ عقل کے ناخن لے۔"

دمنہ نے کہا "میرے دوست! بادشاہ کی قربت پیٹ بھرنے کے لیے نہیں حاصل کی جاتی۔ کھانا تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔ بادشاہ کے مقرب ہونے میں تو عزت جاہ اور مرتبے کا فائدہ ہے۔ اس کے ذریعے دوستوں کی بھلائی اور دشمنوں کی گوشمالی خوب اچھی طرح کی جاسکتی ہے۔"

غرض کلیلہ اور دمنہ کی مدلل بحث ہوئی جس میں آخر کار دمنہ جیت گیا اور بلند مرتبہ کی ہوس لیے بادشاہ کے دربار جا پہنچا۔ اپنی عیار فطرت اور موقع شناسی کی بدولت جلد ہی بادشاہ کے خوف کا کھوج لگانے اور اس کا سدباب کرنے میں کامیاب ہو کر منظور نظر بن گیا، مگر بادشاہ کو جس کے خوف سے نجات دلائی وہ "شتربہ" ایک بیل تھا جو اپنی دانش مندی اور عالی ہمتی کی بنا پر جلد ہی سپہ سالار بن گیا اور شیر ہر کام اس کے مشورے سے کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر دمنہ کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگے اور وہ شتربہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے انتہائی اقدام پر اتر آیا۔

دونوں طرف بے بنیاد باتوں کی لگائی بجھائی سے آخر کار دونوں کو آمنے سامنے لڑوا دیا... اور شیر کے ہاتھوں اس کا وفادار، جانثار ساتھی شتربہ مارا گیا۔

شتربہ کو مارنے کے بعد شیر غم زدہ رہنے لگا اور ندامت حد سے سوا ہو گئی۔"

یہ ہوئی پہلی نصیحت۔ دوسری داستان دمنہ کے انجام پر ہے۔ دوسری نصیحت کے مطابق داستان شیر کے بار ندامت کو کم کرنے میں چیتے کی معاونت سے شروع ہوتی ہے۔

"ایک رات شیر چیتے سے اپنے قلب کی بے چینی کو ظاہر کر رہا تھا جس سے متاثر ہو کر چیتے نے کہا۔

"اے بادشاہ کسی ایسے کام میں جو دسترس سے باہر ہو، بہت زیادہ فکر و تردد کرنا جنون کو دعوت دیتا ہے۔"

غرض چیتے نے شیر کی دلجوئی کی اور معاملے کی تہہ تک پہنچ کر اصل راز معلوم کرنے کا تہیہ کیا۔ اور پہلی ہی پیش رفت میں اس پر دمنہ کا راز کھل گیا۔ مگر ایک خاص مصلحت اور حکمت کے تحت اس نے بادشاہ کے سامنے دمنہ کے مکر و فریب کے وار چلنے دیے اور مناسب موقع پر اس راز کو افشا کر دیا۔

دمنہ واقعتاً "شتربہ کے قتل کی سازش کا ذمہ دار تھا اور بادشاہ کے بار قلب کا بھی.... مگر اپنے اوپر لگنے والے ہر الزام کا جس دیدہ دلیری سے اس نے جواب دیا ... وہ انگشت بدنداں کر دینے والا معاملہ تھا.... اور یہی وہ موقع تھا جب حقیقت کو گمان سے الگ کرنے کے لیے حکمت درکار تھی اور وہی غالب آئی....

دمنہ نے کہا کہ "جہاں پناہ سے بڑھ کر کون حاکم اور قاضی ہو سکتا ہے۔

اگر میں جرم کرتا تو یہاں بیٹھا رہتا اور بلاؤں میں پھنسنے کا منتظر رہتا؟ کسی دوسرے ملک نہ بھاگ جاتا؟"

شیر کی ماں نے کہا کہ "اے دمنہ! تیری گفتگو تیرے دل کے بد ارادے کو ظاہر کر رہی ہے۔ تو اپنی چالاکی سے اپنے کو بے قصور ثابت کرنا چاہتا ہے، لیکن اب تیری خلاصی مشکل ہے۔"

دمنہ نے کہا "بادشاہ سلامت اچھی طرح جانتے ہیں کہ خائن دلیر نہیں ہوتا۔ میں مجرم ہوتا تو اتنی دلیری سے گفتگو نہ کرتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا فیصلہ عجلت میں نہ کیا جائے۔"

چودہ نصیحتیں جنہیں بیان کیا گیا ہے، وہ اپنے آپ میں ایک مکمل سبق رکھتی ہیں مگر ان سے وابستہ حکایتیں جس طرح ان معاملات کی حقیقت کو الگ الگ بیان کرتی ہیں، وہ بھی حیرت کا طلسم کدہ ہے۔

پند و نصائح پر مشتمل اس کتاب کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دونوں طرف سے برابر دلائل دائغے جاتے ہیں یعنی مباحثہ چھڑے۔ جیت غالب دلائل کی ہوتی ہے اور یوں اس نصیحت کو پُر سبق ثابت کرنے کے لیے منطقی راستہ اختیار کیا جاتا ہے... اور یہی داستان کی خوبی ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کا وزن زور جواہر سے کہیں زیادہ ہے اور دلچسپ اتنی کہ شروع کرلیں تو ایک ہی نشست میں ختم کریں۔

مگر کیا کتابیں صرف وقت گزاری اور لطف اندوز ہونے کے لیے ہوتی ہیں؟

ان سے سیکھنے اور عمل پیرا ہونے کا عمل کب شروع ہوگا؟

"حکایتیں، روایتیں کہنے کا رواج ختم ہونے کو ہے ضرور۔ مگر زوال پذیر.... ان کی اثر پذیری سے کس کو انکار ہے؟ مگر ایک چھوٹا سا ڈبہ جس کو اب انسانی کوششوں نے کافی بڑا کر کے آسائش کی دنیا میں نیا جہاں متعارف کروا دیا ہے.... اس نے ہماری بصیرت، بصارت اور حکمت پر پُر فریب پردے ڈال رکھے ہیں۔

کوئی ہے جو ان پردوں کو چاک کر کے ہمارے اصل کی شناخت کرے؟ اور ہمیں خود سے ملنے کا موقع فراہم کرے؟

وہ داستانیں آپ نے سن لیں۔ یاد رہے کہ وہ مختصر [illegible] والی بارہ میں سے [illegible] اور [illegible] آفرین حملے آپ کی خدمت میں پیش کر سکتی ہوں۔

"اے راجا، دوستی اور دشمنی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ یہ اکثر عارضی ہوتی ہے اور بہت جلد ختم ہونے والی... بلاشبہ بہت سی دوستیاں اور دوستانہ مراسم زود ایام سے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی دشمنیاں بھی زمانے کی رفتار کے ساتھ کم ہوتے ہوتے دل سے بالکل محو ہو جاتی ہیں۔"

"ابابیل نے کہا کہ کینہ اور بغض سینے میں پوشیدہ رہتا ہے، آدمی اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ نہیں سکتا، اس لیے صرف زبان کے کہنے پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"ابابیل نے کہا اے بادشاہ! دنیا والوں کا کام ان کی تقدیر کے مطابق انجام پاتا ہے، اس میں کمی بیشی یا آگے پیچھے کا کسی کو اختیار نہیں۔ کوئی شخص اپنے متعلق نہیں جانتا کہ اس کا انجام سعادت پر ہوگا یا شقاوت پر۔ لیکن اس کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے اور اپنی سمجھ، عقل اور تدبیر کے مطابق فرائض دنیوی انجام دیتے رہنا چاہیے کیونکہ اگر تقدیر نے بھی تدبیر کا ساتھ دیا تو پھر اس کی ترقی، کامیابی اور اقبال کی بلندی یقینی ہے اور اگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا تو لوگ اس پر الزام نہ رکھیں گے اور اسے معاف کر دیں گے۔"

غرض یہ کہ کتاب کا حرف حرف چنا ہوا موتی ہے۔ اور جوہر کی پہچان صرف جوہری کو ہے (یعنی ہمارے حکمرانوں کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔)

آخر میں اگر آپ کو یاد ہو تو یہ داستان ہمایوں خال کا وزیر اسے سنا رہا تھا، جسے سن کر اس نے کہا۔

"تم نے اس نصیحت آمیز اور دل کش داستان سے میری روح کو تازگی بخشی ہے۔"

وزیر نے دست بستہ عرض کی۔

"جہاں پناہ نے بجا فرمایا۔

ریاکار اور جھوٹے انسان کی بات گھاس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ مخلص اور سچے انسان کی بات آفتاب کی طرح روشن رہتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روشن تر ہوتی جاتی ہے۔"

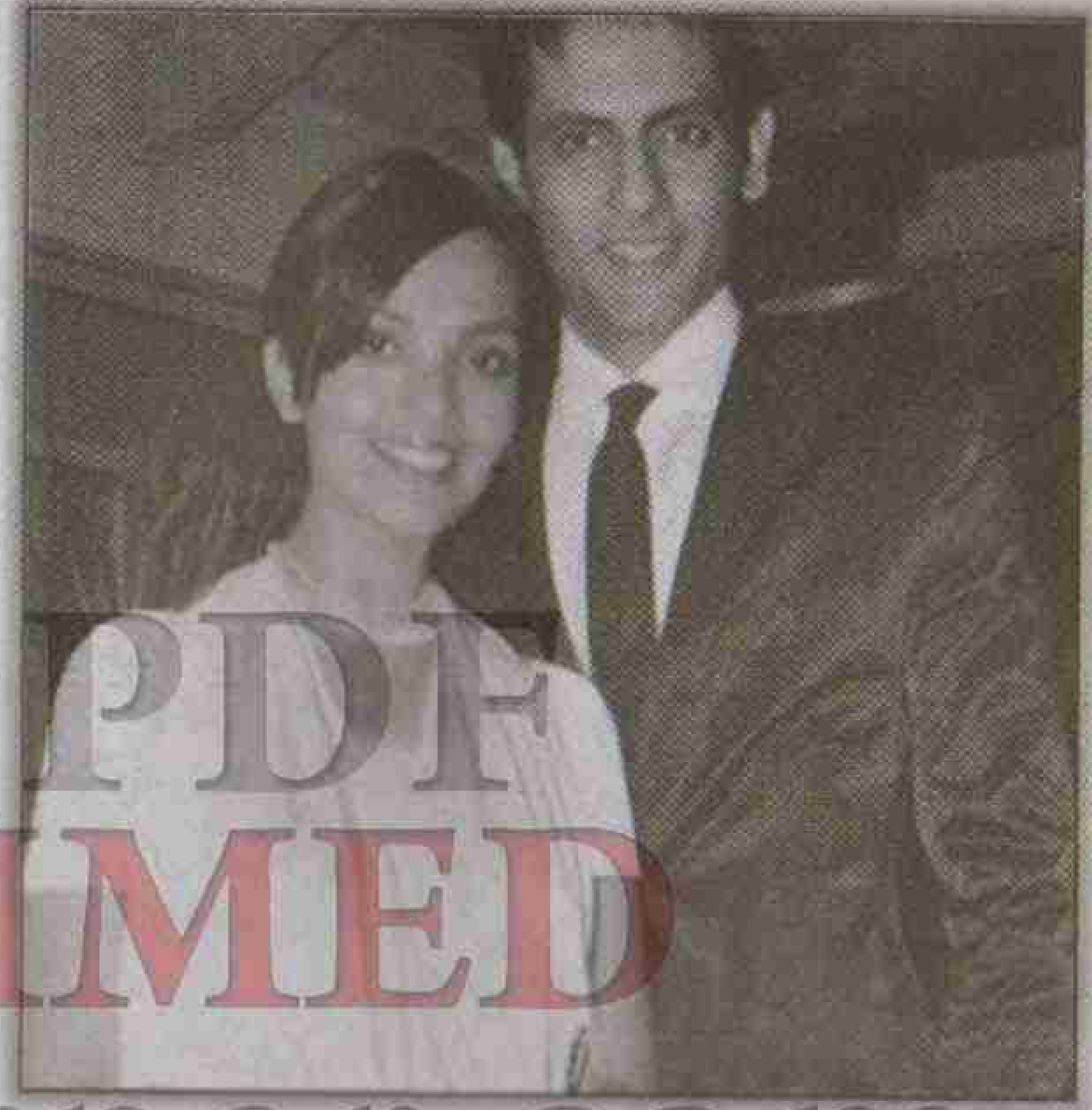

بندھن

# آمنہ شیخ اور محب مرزا

شاہین رشید

## آمنہ محب۔ محب مرزا

ہمارے ہاں زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ شوبز کی فیلڈ میں آنے کے لیے خوب صورتی بہت ضروری ہے اور ہو سکتا ہے اس میں کچھ صداقت ہو' لیکن یہ ضروری نہیں' شبانہ اعظمی اور انڈیا کی ہی کئی فنکارائیں بالکل بھی حسین ـــــ نہیں ہیں' مگر اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں ٹی وی کے میڈیا میں سنیتا مارشل' عروسہ صدیقی اور آمنہ محب اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے چھائی ہوئی ہیں۔

خاص طور پر آمنہ محب کی اداکاری میں بہت گہرائی ہوتی ہے اور حقیقت کے بے انتہا قریب' ان کی فیلڈ کے حوالے سے بھی ہمیں ان کا انٹرویو کرنا ہے لیکن فی الحال تو "بندھن" کے سلسلے میں ان سے بات ہوئی۔ آپ کو یہ بتادیں کہ آمنہ محب آج کل ایک "میک اپ" برانڈ کی برانڈ ایمبیسیڈر ہیں اور انہیں انٹرویو دینے کی اجازت نہیں ہے مگر اتفاق دیکھیں کہ ان کے ایمبیسیڈر بننے سے کچھ ہی عرصہ پہلے ہم نے ان کا انٹرویو کرلیا۔ اس لیے محب مرزا اور آمنہ محب کا انٹرویو پڑھیں اور انجوائے کریں۔

"کیسی ہیں آمنہ صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل آپ ہر دوسرے نہیں تو تیسرے ڈرامے میں تو ضرور ہی نظر آتی ہیں۔ اتنا زیادہ اسکرین پہ نظر آنا کیسا لگ رہا ہے۔"

قہقہہ۔ "مجھے تو اچھا ہی لگ رہا ہے۔ اب ناظرین کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"ناظرین کو تو آپ کی پرفارمنس بہت پسند ہے' کسی آرٹ مووی کی فنکارہ کی طرح۔"

"ارے اتنا مت چڑھایئے مجھے۔ بس اللہ نے تھوڑی سی صلاحیت دی ہے' جس کا استعمال کر رہی ہوں۔"

"اتنی مصروفیات میں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کا وقت مل جاتا ہے۔"

"میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے گھر میں سب کام کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنے کام کی سیٹنگ ایسی کی ہوئی ہے کہ سب وقت پر آجاتے ہیں۔ شکلیں بھی دیکھ لیتے ہیں اور گپ شپ بھی کرلیتے ہیں۔"

"کیا مطلب سب کام کرتے ہیں؟"

"مطلب یہ کہ میری ساس بیوٹیشن ہیں اور سسر بھی کام کرتے ہیں اور ہم دونوں بھی کام کرتے ہیں۔"

"مزید سوالات سے پہلے اپنا تعارف کراوٗ۔"

"اوکے..... میں جی..... 29 اگست کو نیویارک سٹی میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے' اس لحاظ سے ہم پنجابی ہیں۔ میرے والد کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ لہٰذا وہ اعلا تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے گئے..... میرے والدین آپس میں کزن تھے۔ شادی کے بعد امریکہ شفٹ ہوگئے جہاں میں اور میرے دو بھائیوں نے جنم لیا۔ امریکہ میں میرے والدین نے تقریباً" تیرہ سال گزارے' پھر سعودی عرب چلے گئے اور کچھ عرصے کے بعد پاکستان شفٹ ہوگئے۔"

"اور تعلیم کہاں سے حاصل کی؟"

"جی..... پاکستان آنے کے بعد پاکستان میں ہی میں نے اے لیول کیا اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلی گئی اور وہاں سے پروڈکشن میکنگ میں گریجویشن کیا۔ پھر چھ ماہ تک نیویارک میں نوکری کی اور پھر پاکستان آگئی۔"

"محب مرزا سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی؟"

"میں جب پاکستان آئی تو مجھے ایک پروجیکٹ ملا کرنے کے لیے "بچے من کے سچے" اس کے میزبان محب تھے' تب ان سے ہیلو ہائے ہوئی پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ کئی پروگرام کیے۔ "بچے من کے سچے" کا پروگرام ختم ہوا تو میں کچھ اور پروگرام کرنے لگی اور پھر کچھ اور..... لیکن ملاقات رہتی تھی۔"

"پھر دوستی رشتے داری میں کیسے بدلی؟"

"پھر ہوا یہ کہ کچھ پروگراموں کی ریکارڈنگ محب کے گھر پر بھی ہوئی تھی۔ وہاں میری ان کے والدین سے بھی ملاقات رہتی تھی اور ایک ساتھ کام کرکے ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاجوں سے بھی واقف ہوگئے تھے۔ پھر ایک دن جب محب نے پروپوز کیا تو میں نے کچھ ٹائم مانگا اور اپنے والدین سے بات کی۔ ہم دونوں چونکہ ایک ہی فیلڈ سے تھے اور سب ایک دوسرے کو جانتے تھے' اس لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔"

"کتنے سال ہوگئے اور بچے؟"

"ماشاءاللہ تقریباً" چھ سال ہوگئے ہیں اور فی الحال تو بچے نہیں ہیں' ان شاءاللہ فیملی بھی ضرور بنے گی۔"

"ان شاءاللہ..... خوش گوار ازدواجی زندگی کا کیا راز ہے۔"

"یہ ہی کہ ہم دونوں دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور عروسی جوڑا کیسا تھا؟"

"جی بالکل' اور رسمیں بھی ساری ہوئی تھیں جو کہ میں نے بہت انجوائے کیں۔ مایوں' مہندی' سب بہت اچھا رہا۔"

"پنجابی اور اردو بولنے والوں کی رسموں میں کافی فرق ہوتا ہے' کوئی رسم جو آپ کو حیرت انگیز لگی ہو۔"

"جو رسمیں ان کے یہاں کی تھیں' ویسی رسمیں عموماً" میں نے انڈین فلموں میں دیکھی تھیں' جیسے کہ

آرسی مصحف کی اسی طرح جب دولہا اپنے کمرے میں جانے لگتا ہے تو دلہن کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور جب دولہا، دلہن کو گود میں اٹھاتا ہے تو سب دولہا سے پیسے مانگتے ہیں۔ مجھے بہت مزا آیا تھا ان رسموں میں اور جہاں تک عروسی جوڑے کی بات ہے تو میں نے اپنا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کیا تھا، تاکہ سب سے منفرد نظر آؤں۔"

"جب سے آپ اس فیلڈ میں آئی ہیں ہم آپ کو اسمارٹ ہی دیکھ رہے ہیں، کیا بچپن سے ہی ایسی ہو یا کبھی موٹی تازی بھی تھیں۔"

"میں ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی موٹی بھی ہوں گی، کیونکہ شاید میری ہڈی ایسی ہے کہ جو مجھے موٹا نہیں ہونے دیتی اور دبلا پتلا ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر لباس سج جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ پنجابی لڑکی اور اتنی دبلی... تو میں کہتی ہوں کہ مجھ پر اللہ کا خاص کرم ہے اس لیے دبلی اور اسمارٹ ہوں۔"

"ڈراموں میں تو ہر وقت میک اپ، نت نئے کپڑے، فیشن ہوتا ہے، عام زندگی میں کیسی ہیں آپ؟"

"عام لائف میں بہت سادگی پسند ہوں۔ نہ میک اپ ہوتا ہے، نہ جیولری، نہ فیشن والے کپڑے، گھر میں میرا پسندیدہ لباس پینٹ شرٹ ہے اور جب بازار جاتی ہوں تب بھی بغیر میک اپ کے اور انتہائی سادہ لباس میں اور بڑے آرام سے شاپنگ کر کے آجاتی ہوں۔"

"کیوں، لوگ پہچانتے نہیں کیا؟"

"میں اسکرین پہ نظر آنے والی آمنہ سے بہت مختلف ہوں۔ لوگوں نے ہمیں میک اپ میں اور فیشن ایبل ڈریسز میں دیکھا ہوا ہوتا ہے جبکہ میں ایک عام گھریلو لڑکی کی طرح گھر سے نکلتی ہوں، اس لیے لوگ آسانی سے نہیں پہچان پاتے اور جو پہچان بھی لیتے ہوں گے وہ خود ہی سوچتے ہوں گے کہ اس کی شکل تو آمنہ سے مل رہی ہے مگر یہ ہے کوئی اور۔"

"کیوں میک اپ انسان کو اتنا تو نہیں بدلتا۔"

"بدلتا ہے... آپ یقین کریں کہ جتنا میک اپ ہم لوگ کرتے ہیں، اس سے تو انسان بالکل ہی بدل جاتا ہے۔"

"اتنی مصروفیات میں کچن کون سنبھالتا ہے؟"

"جب میں پروڈکشن ڈائریکشن میں تھی، تب بھی اتنی ہی مصروف رہتی تھی جتنی کہ اب اداکاری میں آنے کے بعد ہوں۔ اس وقت بھی میں مکمل طور پر کچن کو ٹائم نہیں دے پاتی تھی اور اب بھی نہیں دے پاتی۔ لہٰذا کک کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔"

"ہوٹلنگ کا شوق ہے؟"

"بالکل ہے۔ چھٹی کا دن عموماً باہر گزرتا ہے اور اگر گھر پر بھی ہوں تو کھانا کھانے باہر ضرور جاتے ہیں۔"

"آپ پڑھی لکھی ہیں اور ایک خاص فیلڈ سے وابستہ ہیں اس لیے کماتی ہیں، لیکن آپ کے خیال میں ہاؤس وائف کو جاب کرنا چاہیے۔"

"ہاؤس وائف اگر پڑھی لکھی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ گھر کی گاڑی ایک بندہ نہیں چلا سکتا تو اسے ضرور، ضرور جاب کرنا چاہیے اور ویسے بھی اگر کوئی مجبوری نہیں بھی ہے تو بھی جاب کرنے میں کیا حرج ہے۔ تعلیم پہ خرچ کیا ہے تو ریٹرن لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ لڑکیوں میں خود اعتمادی آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو سیکور فیل (محفوظ محسوس) کرتی ہیں۔"

"اپنا دلہن کا روپ کیسا لگا تھا اور رخصتی کے وقت کیا کیفیت تھی؟"

"میرے خیال میں ہر لڑکی کو اپنا یہ روپ اچھا لگتا ہو گا کیونکہ یہ روپ ہی ایسا ہوتا ہے۔ ایک نئی زندگی کا آغاز ہونے والا ہوتا ہے۔ کچھ خوشی کچھ میکہ چھوڑنے کا غم... ملی جلی کیفیت چہرے پہ نمایاں ہوتی ہے اور میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔"

"محب محبت کا اظہار کھل کر کرتے ہیں یا دل میں رکھتے ہیں۔"

"محب بہت رومینٹک مزاج ہیں مگر کسی کے سامنے محبت کا اظہار نہیں کرتے۔ کہتے ہیں یہ میاں، بیوی کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔"

## محب مرزا

"جی محب مرزا! کیسے ہیں آپ... آپ اور آمنہ فیلڈ میں چھائے ہوئے ہیں۔"

"جی میں ٹھیک ہوں اور بس یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، آپ سب کی دعائیں ہیں۔"

"ڈراموں میں آپ، کمرشلز میں آپ، وائس اوور میں آپ... فارغ اوقات تو ملتے ہی نہیں ہوں گے۔"

"ملتا ہے، اب دیکھئے، آپ سے بات ہو رہی ہے نا، ویسے میں بھی اس مقام تک بہت آسانی سے نہیں پہنچا، بہت محنت کی ہے میں نے۔"

"جی... ہمیں پتا ہے "بچے من کے سچے" وہ پروگرام تھا جو کہ آپ کے لیے لکی ثابت ہوا؟"

"جی ہاں۔ "بچے من کے سچے" بھی یہ اور دیگر کچھ پروگرام بھی ہیں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"میرے والدین کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ میری پیدائش کراچی کی ہے۔ میری ایک بڑی بہن ہیں اور میں نے گریجویشن کیا ہے۔"

"آپ اردو اسپیکنگ اور آمنہ پنجابی... شادی میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"لوگ آپس میں برے نہیں ہیں، کچھ قوتوں نے انہیں برا بنایا ہوا ہے، اور پھر پنجابی بھی مائیگریٹ ہو کر پاکستان آئے اور اردو بولنے والے بھی تو اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

"آمنہ کو پہلی مرتبہ کہاں دیکھا تھا؟"

"میں اور میرے کچھ دوستوں نے ایک تھیٹر کیا تھا۔ "ون وے ٹکٹ" اس ڈرامے کو آرگنائز کرنے میں آمنہ کا بہت ہاتھ تھا۔ اس وقت ایک سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پھر چار سال کے بعد جب میں "بچے من کے سچے" کر رہا تھا اور آمنہ اس کو ڈائریکٹ کر رہی تھی، تب ہماری خاصی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور دوستی پسندیدگی میں بدل گئی۔"

"کیا بات پسند آئی تھی اور مانتے ہیں اس بات کو کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔"

"اس کی سادگی، محنت، خلوص... سب کچھ ہی اچھا لگا اور آج بھی مجھے اس کی سادگی ہی پسند ہے اور مجھے سادگی میں ہی اچھی لگتی ہے اور یہ سچ ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔"

"مزاج کس کا گرم ہے آپ کا یا آمنہ کا؟"

"مزاج کے ہم دونوں ہی تیز ہیں۔ ویسے تو لڑنے جھگڑنے کا زیادہ وقت نہیں ملتا، لیکن پھر بھی اگر کبھی کبھار لڑائی ہو جائے تو اگر ایک بول رہا ہو تو دوسرا خاموش ہو جاتا ہے۔"

"دونوں پڑھے لکھے ہیں، لڑائی تو تہذیب کے دائرے میں ہی ہوتی ہو گی۔"

"لڑائی اور تہذیب... ہاں بری زبان استعمال نہیں کرتے، توڑ پھوڑ نہیں کرتے، زیادہ تر خاموش رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اب تو مصروفیات نے ان جھگڑوں کو ختم کر دیا ہے۔"

"آمنہ کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"اچھی عادت تو یہ ہے کہ بہت خیال رکھنے والی اور پیار کرنے والی ہستی ہے اور بری یہ کہ تھوڑی ضدی اور تھوڑی جذباتی ہے۔"

"فضول خرچ کون ہے، آپ یا آمنہ؟"

"ہم دونوں فضول خرچ نہیں ہیں کیونکہ ہم دونوں ہی بہت محنت سے کماتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم کنجوس ہیں۔ جو چیز پسند آتی ہے، ضرور خرید لیتے ہیں۔"

"کن چیزوں پہ زیادہ خرچ کرتے ہیں؟"

"گھر کو سجانے سنوارنے میں کنجوسی نہیں کرتے اور اگر کوئی نئی الیکٹرونک چیز آجائے تو ضرور خریدتے ہیں۔ ایسی ویسی چیزوں پر خرچ نہیں کرتے۔"

"گھر کے کاموں میں آمنہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔"

"ہاں... جب آمنہ کچن میں ہوتی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ ضرور ہوتا ہوں، ویسے اتنا کوئی کام نہیں ہوتا کہ ہاتھ بٹایا جائے، ہماری فیملی ہی کتنی ہے۔"

اور اس جواب پر ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

خواب جب آئینہ دکھاتے ہیں
ان گنت لوگ یاد آتے ہیں
ایک تصویر بنتی جاتی ہیں
ایک تصویر ہم بناتے ہیں

زمانہ جتنا بھی جدید ہو جائے' انسان اپنی جبلت کی بنا پر قدیم ہی ہے۔ اس کے احساسات' اس کے جذبات صدیوں پہلے گزرے انسان سے مختلف نہیں ہو سکتے۔

کہانیاں سننے اور لکھنے کا سلسلہ بھی انسانی حیات کا ایک فطری تسلسل ہے۔ ہر فرد ایک کہانی ہے۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں جب ہم اپنے ساتھ رہنے والے انسانوں سے بے خبر ہیں' کہانی کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ کہانی اور اس کے کردار ہمارے لیے سوچ کے کئی در کھولتے ہیں۔

انسانی احساسات کی ترجمانی کرتے کردار آنے والے لوگوں کے لیے گزر جانے والے لوگوں کو جاننے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔

یہ کہانی کار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو' اپنی سوچ' مشاہدے اور فکر سے ایسے لفظوں میں تشکیل دیتا ہے کہ پڑھنے والے اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کہانی کار آپ کو اسی گھر' اسی ماحول اور اسی دور میں لے جاتا ہے' جہاں آپ خود کو اس کہانی کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کرداروں سے اپنائیت' لگاؤ اور محبت کا احساس دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ دل میں نفرت اور غصہ کے جذبات بھی اسی طرح ابھرتے ہیں' جسے وہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔

ہر کہانی میں ایک مرکزی کردار ہوتا ہے۔ پوری کہانی کا تانا بانا اسی کے گرد بنا جاتا ہے۔ کہانی کا یہ مرکزی کردار ہر مصنف پوری یکسوئی سے اپنے مشاہدے' مطالعہ یا تخیل کے لحاظ سے تخلیق کرتا ہے۔

خواتین کی کہانیوں میں یہ مرکزی کردار عموماً" کہانی کی ہیروئن ہوتی ہے۔ مختلف مصنفین کی کہانیوں میں یہ ہیروئن مختلف صفات لیے جلوہ گر ہوتی ہے اور پڑھنے والے اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ سروے کا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

1 آپ نے شعاع میں مختلف تحریریں پڑھی ہوں گی' کس ہیروئن یا مرکزی کردار کو اپنائیت کی نظر سے دیکھا' خود سے قریب محسوس کیا اور آپ کا اس سے دوستی کرنے کو دل چاہا اور کیوں؟ جس ناول' ناولٹ یا افسانہ سے آپ نے یہ مرکزی کردار منتخب کیا۔ اس کا نام اور اس کی مصنفہ کا نام بھی لکھیں۔

2 آپ کسی ایسی تقریب میں جائیں' جہاں شعاع کی ساری مصنفین کا اجتماع ہو تو آپ کس مصنفہ سے کیا سوال کریں گی۔

آیئے! دیکھتے ہیں' قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

# ایک تصویر بنتی جاتی ہے

ادارہ

### ام ثمامہ...... جھڈو

سروے کے سوالات اچھے تھے۔ دل نے مچل کر کہا کہ جوابات لکھے جائیں گو کہ ہمارا شمار اللہ کے فضل و کرم سے رائٹرز میں ہوتا ہے لیکن اصولی طور پر جو بھی رسالہ پڑھے' قاری کہلائے گا' اس لیے قارئین کے سروے میں جواب دینے کا حق ہم بھی رکھتے ہیں۔

(1) میں نے زیادہ کہانیاں نہیں پڑھیں مگر عمیرہ احمد کا من و سلوی پڑھ کر زینی پر بہت غصہ آتا تھا کہ ایک بے

مایہ شخص کی نام نہاد محبت کی خاطر اس نے اپنی نیکی' باپ کی تربیت اپنی زندگی سب داؤ پر لگا دیا۔ جب دل کرتا تھا' اسے ڈانٹ کر آؤں یا سمجھا کر آؤں اور اب نمرہ احمد کی کہانی "مصحف" پڑھ کر فرشتے اور محمل سے ملنے کو دل کرتا ہے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ ہدایت کے راستے کے لیے چن لیتا ہے۔

(2) مجھے ایسے کسی اجتماع میں جانے کا موقع ملے تو میں ایک سے نہیں' تین تین رائٹرز سے کچھ کہوں گی۔ وہ چاہے جواب دے نہ دے مگر میں ٹی وی شو کے اینکر ز کی طرح سوال ضرور کروں گی۔

پہلا سوال نمرہ احمد سے کروں گی کہ ماشا اللہ وہ اتنی کم عمری میں اتنا اچھا اور معلوماتی کیسے لکھ لیتی ہیں۔ کہانی کے متعلق ان کا ہوم ورک بہت اسٹرونگ ہوتا ہے۔ ان کی کہانی مصحف پڑھنے کے بعد میں نے قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھنا شروع کیا' آپ یقین کریں وہ سچ کہتی ہیں' یہ الہامی کتاب آپ سے باتیں کرتی ہے قرآن میں ہمارے تمام مسائل کا جواب موجود ہے۔

دوسرا سوال رخسانہ نگار سے کروں گی کہ ماشاء اللہ سے اللہ نظر بد سے بچائے کہ وہ اتنا زیادہ کیسے لکھ لیتی ہیں انہوں نے اس کام کے لیے موکل رکھے ہوئے ہیں کیا جبکہ وہ دو پھول سی گڑیوں کی اماں بھی ہیں۔

تیسری بات رائٹر سے معذرت کے ساتھ مگر میرا خیال ہے کہ دل میں جو ہو کہہ دینا چاہیے۔ اچھے لوگ اچھی تحریر کو مختلف انداز میں لیتے ہیں۔ ایک بہت اچھی رائٹر ہے نبیلہ عزیز' میرا ان سے کہنا ہے کہ پلیز وہ اپنی کہانیوں میں بیڈ روم سین اور ہزبینڈ وائف کا رومانس کچھ کم دکھایا کرے۔ میرے خیال میں یہ رسالہ پندرہ سے بیس کے درمیان والی عمر کی لڑکیاں زیادہ پڑھتی ہیں اور یہ نالج ان کے کچے ذہنوں کے لیے قبل از وقت ہے۔

### افیقہ اتا...... چکوال

1۔ اب میں نہ تو آسیہ رزاقی کی ہیروئن جیسی سنجیدہ و صابر' نہ فرحت اشتیاق کی ہیروئن جیسی اعلا تعلیم یافتہ ہوں۔ نہ رخسانہ نگار کی ہیروئن کی طرح ذہین اور سمجھ دار' نہ پنکچوئل' نہ پریوں سا حسن ہے نہ اعلا پائے کی ذہانت ہے۔ نہ قناعت پسند ہوں نہ سلیقہ شعار۔ پھر بھلا کس برتے پر ان سے دوستی کروں؟

بہرکیف وہ ناول' جس کی ہیروئن سے مجھے اپنائیت محسوس ہوئی۔ "امربیل" ہے اور اس کی مصنفہ سے کون واقف نہیں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہے عمر جہانگیر۔ علیزہ اور مجھ میں ایک ہی قدر مشترک ہے' وہ یہ کہ ہم دونوں کا عمر سے عشق (جنوں کی حد تک) میرا علیزہ سے دوستی کرنے کو اسی لیے دل چاہا کہ میں اس سے عمر کے بارے میں باتیں کروں۔

2۔ اگر کسی تقریب میں تمام مصنفین سے ملاقات ہو تو ...... پہلے پہل تو جھجک و تکلف آڑے آئے گا۔ جیسے ایک بار میں نگہت سیما سے ملی تو سلام دعا سے آگے کوئی بات ہی نہ ہو پائی تھی اور میں ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلی آئی تھی۔

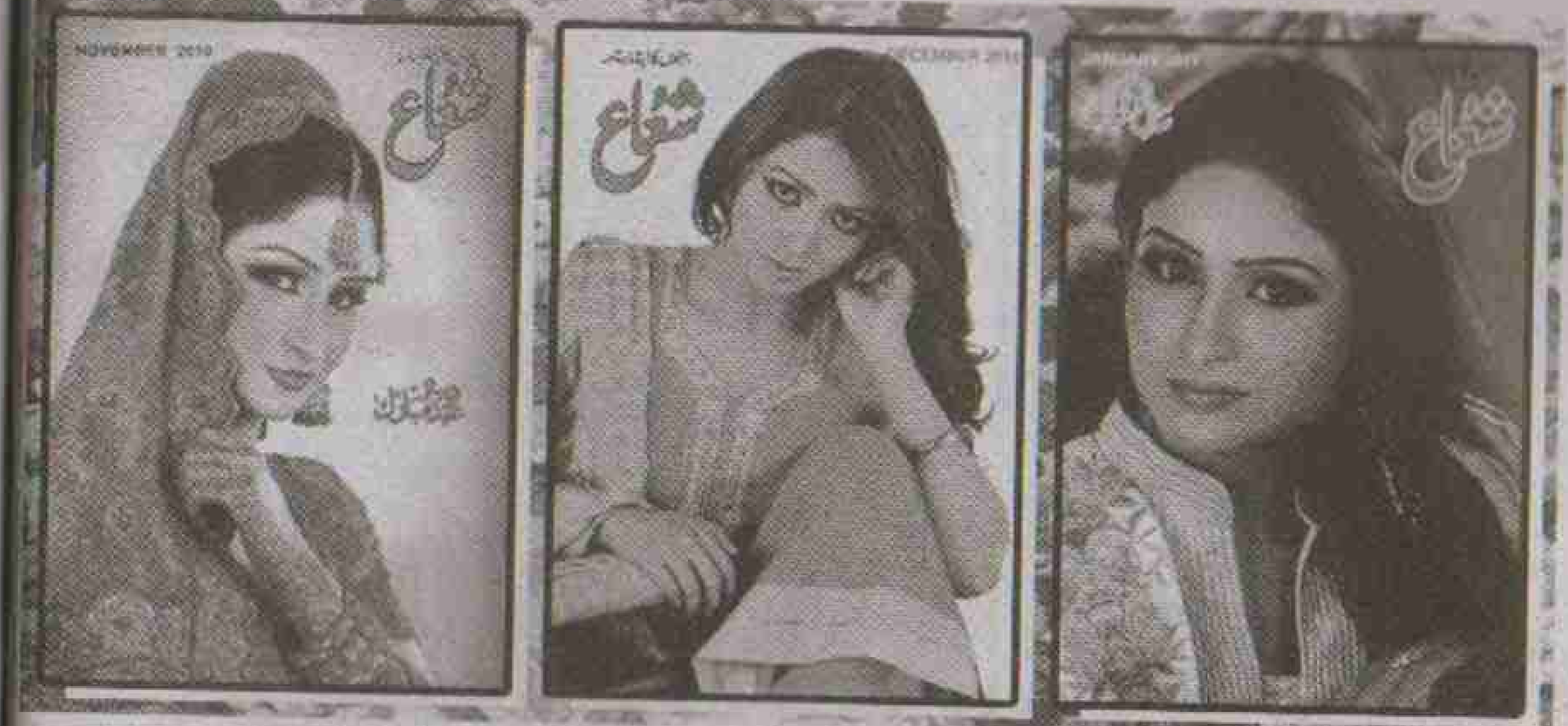


طویل فہرست ہے۔ ایک ایک کر کے تمام مصنفین سے سوال کرتے ہیں۔

رفعت سراج! ان کی ہر ہیروئن چندے آفتاب و مہتاب اور ہر ہیرو اپالو دیوتا سا کہ بڑھاپے میں بھی ان کا حسن ماند نہیں پڑتا۔ ان سے پوچھوں گی "آخر وہ اتنا بیش بہا حسن کہاں سے لے کر آتی ہیں؟"

عنیزہ سید! آپ کے ناول "شب گزیدہ" میں ایک فارسی غزل پڑھی تھی۔ اگر اس کا اردو ترجمہ ہو تا تو کیا بات تھی۔ اب ذرا اس غزل کا مفہوم ہی بتلا دیجئے۔

فرحت اشتیاق! سراپا محبت و سراپا ذہانت۔ میں ان سے پوچھنا چاہوں گی۔ "فرحت جی! آج کے دور میں جب اپنے ہی اپنوں کے خون کے پیاسے ہیں تو آپ اتنی محبت کیسے لاتی ہیں؟"

ثمرہ بخاری! آپ نے ایک طویل مدت سے پنجاب کی سرزمین پر کچھ نہیں لکھا کیوں؟

در ثمن! تنزیلہ ریاض! فاخرہ جبین! ان سب سے ایک ہی سوال کہ آپ نے شادی کے بعد لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟

فائزہ افتخار! ثروت نذیر! ماہا ملک! ڈرامے لکھتے لکھتے آپ ہم قارئین کو بھلا تو نہیں دیں گی؟

نبیلہ عزیز! نایاب جیلانی! سلوی علی! عنیقہ ناز! اتنا متواتر لکھتے لکھتے، بہت سی دوسری مصنفین کی طرح آپ بھی ایک دم منظر سے غائب تو نہیں ہو جائیں گی؟

رضوانہ خان..... کراچی

واہ! ایک اور شان دار اور منفرد سروے۔ کیا بات ہے میرے شعاع کی۔ جیو اور جیتے رہو "پیارے شعاع" جی جناب! اب آتے ہیں شاندار سروے کے منفرد سوالات کی جانب۔

1۔ جی ہاں! ایسا ہے اور سو فیصد ہے۔ یوں تو بہت ساری (متذکرہ بھی) مصنفات کی ہیروئنیں دل و جان سے پسند ہیں لیکن جس مصنفہ کے تخلیق کردہ کردار سے اپنائیت کی مہک آتی ہے۔ یوں لگتا ہے گویا میری روح سے قریب تر ہے اور میری سب سے بہترین دوست "راحت آپی" کے انداز تحریر میں (کوڑی ہیلی) ہے، وہ ہے "راحت جبیں آپی" کی رومانٹک اور فطرت کی رنگینیوں سے پیار کرنے والی، بے ساختہ ہنسنے اور باتیں کرنے والی ہیروئن اور میرے یہ جذبات اس لیے ہیں کہ میں خود ایسا ہی مزاج و انداز رکھتی ہوں۔ کسی ایک مخصوص تحریر میں نہیں بلکہ جب جب انہوں نے ایسا کردار تخلیق کیا، میرا شدت سے دل چاہا کہ اس سے ملوں اور دوستی کروں۔

2۔ ارے واہ! ایسی تقریب جہاں شعاع کی ساری مصنفات کا اجتماع ہو۔ پچھلے دنوں ایک ادبی نشست میں مجھے اپنی بچپن سے پسندیدہ ترین مصنفہ "نگہت عبداللہ" کو قریب سے دیکھنے، سننے، ملنے اور آٹوگراف لینے کا موقع ملا۔ سوال تو خیر کوئی کیا کرتی؟ ان کا متاثر کن انداز گفتگو مجھے گنگ کر گیا۔ بالکل میری امی کی طرح گفتگو کر رہی تھیں۔ ان کا شفقت اور محبت سے مجھے آٹوگراف دینا اور میرے نزدیک ہی ساتھ ساتھ نماز عصر ادا کرنا، میں تاحیات نہ بھولوں گی۔

تو جناب! جہاں ساری مصنفات ہوں گی اور مجھے موقع

ملا تو فوراً "سب سے ایک سوال کروں گی کہ آپ کے پاس اتنا پیار اور سبق آموز انداز تحریر کیسے آیا؟ یہ ہنر مجھے بھی سکھا دیں کہ میں بھی بچوں کی کہانیاں لکھتے لکھتے (شائع بھی ہوتی رہتی ہیں جناب.....) آپ سب کی طرح افسانے، ناولٹ، ناول لکھ سکوں۔

ثمینہ اکرم..... کراچی

1۔ پہلے سوال کے جواب میں، میں یہ کہنا چاہوں گی کہ ابھی تازہ تازہ میں نے جو کہانیاں پڑھیں اور اس میں جن کرداروں سے میں متاثر ہوئی، سب سے پہلے یہاں ان کا ذکر کروں گی مگر ایسا ہے کہ باوجود میرے پسندیدہ کردار ہونے کے میں ان سے دوستی نہیں کر سکتی (کیونکہ یہ سب میل کردار ہیں) جیسے کہ مصنفہ نبیلہ عزیز کے ناول "کردار" کا ہیرو "داد بخش" اپنے بلند کردار اور وفاداری کے سبب مجھے اچھا لگا۔ مریم عزیز کے ناول "سلطنت دل" کا ہیرو "ابراہیم" اپنی خوب صورتی، اچھی عادات و اطوار اور مشرقیت، نیک سیرت کی وجہ سے میرے من کو بھایا۔ سلوی علی بٹ کے ناول "دل کے رستے" کا اہم کردار "منصور" جو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرنے کی وجہ سے میرا پسندیدہ ٹھہرا اور فرحت اشتیاق کے تمام ناولز کے ہیرو "عباد" (متاع جاں ہے تو) "ہم سفر" کا شعر میری گڈ بک میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ ماہا ملک کا ناول "میرے خواب ریزہ ریزہ" کا مرکزی کردار "حسن" مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ اور رخسانہ نگار "زندگی اک روشنی" میں ہیرو کا کردار اور عالیہ بخاری کی "دیوار شب" کا معاذ، مجھے حد سے زیادہ یہ کردار پسند ہے۔ مگر یہ سب تو کردار ہیروز کے ہوئے جبکہ آپ نے ہیروئن کے متعلق پوچھا ہے۔

میں نے کافی عرصہ پہلے شعاع میں نگہت سیما کا ایک ناول پڑھا "ایک تھی علیزہ ایک تھا شہزاد" اس ناول کی ہیروئن "علیزہ" مجھے اپنے دل سے بہت قریب محسوس ہوئی۔ وجہ؟ علیزہ بہت سادہ دل، معصوم اور اعلا ظرف لڑکی تھی، جو اپنی کزن "بازغہ" کے مذاق کی بھینٹ چڑھ گئی اور جس نے صرف اپنی انا اور خودداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی محبت کی بھی قربانی دے ڈالی اور ہمیشہ کے لیے شہزاد کی زندگی سے نکل گئی۔

عالیہ بخاری کا سلسلہ وار ناول "دیوار شب" کی زری مجھے بہت دل سے قریب محسوس ہوئی اور میرا اس سادہ سی لڑکی سے دوستی کرنے کا دل چاہا

نبیلہ ابر راجہ کا ناول "ہم جو معتبر ٹھہرے" کا مرکزی کردار "آبدار" تمام کہانی جس کے گرد گھومتی ہے۔ آبدار جو سب کی نظروں میں بد کردار تھی اور ایک دن اس کی سچائی سب کے سامنے ظاہر ہوئی اور وہ سرخرو اور معتبر ٹھہری۔

آسیہ رزاقی میری پسندیدہ رائٹرز میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ ہمیشہ جوائنٹ فیملی سسٹم کا ایک مثبت اور روشن رخ روشناس کراتی ہیں۔ ان کے ناولز میں اخلاقی اقدار اور روایات دکھائی دیتی ہیں۔ آسیہ رزاقی کی ہیروئن بہت سنجیدہ صابر شاکر اور حالات سے سمجھوتا کرنے والی ہوتی ہے۔ جیسے کہ ناول "پہلی نظر کا

انعام "اس کی "آنسہ" جو اپنے گھریلو مسائل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہارتی۔ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے۔ آسیہ رزاقی کا ناول "تلاش ختم" کی "مہربانو" وہ بھی حالات کی ماری شوہر کی ستائی ہوئی۔ یہ کردار بھی اچھا لگا۔ نمرہ احمد کے ناول "بیلی راجپوتاں کی ملکہ" کی ہیروئن (مایا) اپنے حسن جہاں سوز اور اپنے رعب ودبدبہ کے باعث بہت پسند آئی۔

2۔ دوسرا سوال پڑھ کر تو میں چشم تصور میں ایسی تقریب میں جا پہنچی 'جہاں میری ساری فیورٹ رائٹرز موجود ہیں۔

"تجھ کو دیکھیں کہ تجھ سے بات کریں" والا معاملہ ہو گا۔ خیر جب حواس کچھ قابو میں آئیں گے تو میں مندرجہ ذیل رائٹرز سے کچھ اس طرح کے سوال پوچھوں گی۔

میرا پہلا سوال نمرہ احمد سے ہو گا..... پلیز یہ بتائیں کہ اب آپ کی شادی ہو گئی ہے گھریلو ذمہ داریاں بھی ہوں گی تو آپ لکھنے کے لیے کس طرح ٹائم نکالتی ہیں؟

فرحت اشتیاق! اب تو آپ اپنی تعلیم مکمل کر کے ماشاء اللہ کالج میں جاب بھی کر رہی ہیں مگر اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے قارئین کے لیے سلسلہ وار ناول نہ سہی 'صرف ایک طویل ناول ہی لکھ ڈالیں۔

شگفتہ بھٹی جی! آج کل جو ہمارے ملک کے حالات چل رہے ہیں 'اس میں ایک رائٹر کس طرح اپنا کردار ادا کر سکتا ہے؟

نگہت سیما جی! کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے کوئی پلاٹ سوچا ہو 'اس پر کہانی لکھنا شروع کی ہو مگر مصروفیت کے باعث مکمل نہ کر پائی ہوں اور اسی پلاٹ پر کسی اور رائٹر کی کہانی شائع ہو جائے تو آپ کو کیسا لگے گا؟

رخسانہ نگار! اگر آپ رائٹر نہ ہوتیں تو پھر کیا ہوتیں اور آپ نے کس سے متاثر ہو کر لکھنے کا آغاز کیا؟

راحت جبیں! اگست کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ پلیز ساون کے حوالے سے کوئی کہانی لکھیں۔ راحت جی سے میرا دوسرا سوال ..... اپنی تحاریر کے علاوہ اور کس کی تحریریں ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں؟ چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟

نمرہ بخاری سے میرا سوال..... کبھی ایسا ہوا کہ آپ اپنی کسی کہانی کو لکھ کر مطمئن نہ ہوں مگر جب وہ شائع ہوئی تو قارئین نے اسے بے حساب پسند کیا ہو..... اور غیر متوقع طور پر وہ بہت مقبول ہو جائے تو؟

رفعت سراج صاحبہ! میں آپ کی فین ہوں مگر آج کل آپ بہت کم کم لکھ رہی ہیں 'کیا وجہ ہے؟

نگہت عبداللہ جی! پھر سے لکھنا شروع کریں۔ ہم آج بھی آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

عنیزہ سید جی! "دل من مسافر من" جیسی کوئی دوسری کہانی نہیں لکھی 'کیوں؟ اور آپ فارغ وقت میں کیا کرتی ہیں؟

آمنہ مفتی جی..... محنت سے انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے یا قسمت سے..... آپ کس رائٹر سے متاثر ہیں؟

آمنہ مفتی جی..... ایک لفظ جو آپ کی شخصیت کی وضاحت کر دے.....



کنیز نبوی! دوسری رائٹرز کی طرح آپ بھی شادی کے بعد منظر عام سے غائب ہو گئی ہیں' آپ کی سندھ دھرتی سے محبت سے گندھی کہانی کو ہم بہت مس کر رہے ہیں۔ پلیز جلد ہی کسی اچھی سی سندھ کی لوک داستان کے ساتھ حاضر ہوں۔

عالیہ بخاری! آپ کی ہیروئن ہمیشہ سنجیدہ' سمجھ دار' دلکش اور ایک خاندانی لڑکی ہوتی ہے۔ کیا آپ کی ہیروئن میں آپ کی جھلک نظر آتی ہے؟

آسیہ رزاقی سے میرا سوال ہو گا۔ آسیہ جی! آپ نے ہمیشہ جو کہانیاں لکھی' ان میں بھرے پرے خاندان اور جوائنٹ فیملی سسٹم کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے۔ کیا آپ کو ذاتی طور پر مشترکہ خاندانی نظام پسند ہے یا فیملی سسٹم۔ اپنے پسندیدہ ترین ناول کا نام بتائیے؟

میرے خیال میں رائٹرز سے کیے جانے والے اتنے ڈھیر سارے سوالات کافی ہیں۔

رضوانہ شکیل راؤ..... لودھراں

1۔ ویسے تو ساری کہانیوں کے کردار پرفیکٹ ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسے خاص کردار ہوتے ہیں جو دل ودماغ پر نقش ہو جاتے ہیں۔ جیسے عنیزہ سید کے ناول "دل من مسافر من" کے "ماسٹر ہدایت اللہ"۔

بشریٰ سعید کے ناول "سفال گر" کی "حکیم بیگم" مجھے ان سے گہری انسیت محسوس ہوئی۔

کنیز نبوی کے ناول "آتش عشق" کے دو کردار "جانب علی شاہ اور سدوری" جن سے ملنے کو دل چاہا۔ جانب علی شاہ اور سدوری کی تیئس سالہ محبت..... نہیں وہ محبت نہیں 'شاید عشق کی انتہا یہی ہو سکتی ہے۔

اسی ناول کا ایک کردار جس میں مجھے بہت اپنائیت محسوس ہوئی وہ ہے "جیجی" ان کی نصیحت "بیٹا صبر وہ ہے جو شروع صدمے میں کیا جائے" ان لفظوں نے بہت متاثر کیا اور میرا واقعی دل چاہا کہ وہ اس کردار سے نکل کر سامنے آجائیں اور میں ان سے دوستی کر لوں۔

2۔ جی اگر ملاقات ہو جائے تمام رائٹرز سے کسی محفل میں تو.....تو

سعدیہ عزیز آفریدی سے پوچھنا چاہوں گی کہ آپ محبت کو اس گہرائی اور خوب صورتی کیسے لکھ لیتی ہیں کہ محبت کا ذکر بھی محبت کی محبت میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔

اب باری آتی ہے کنیز نبوی کی جی..... ان کے ناول "آتش عشق" کے حوالے سے کنیز جی حسن کا ایسا انجام صرف عشق کی تربیت کے لیے۔ کیا عورت محض اک شے ہے جسے مثال بنا کر مرد کی فہم کو پختگی کا شعور عطا کیا جاتا ہے۔ جانب علی شاہ نے ہجر سے حجرہ اور پھر اپنے پر سکون گھر گرہستی کا سفر طے کر لیا۔ اولاد کی منزل بھی پالی۔ ولی محمد نے مرشد کا حق ادا کر دیا۔ بابا صاحب نے اپنے مریدوں کے بھرم ٹوٹنے سے بچا کر اپنے سب ہی خواب جلا ڈالے اور بے چاری سدوری جس کے پاس نہ تو عقیدتوں کا ہجوم تھا اور نہ ہی کسی بھرم کے ٹوٹ جانے کا خوف۔ اس کے سب ہی خواب کیوں بھلائی بی اور وے کی تاریکیوں میں گم ہو گئے.....؟

عارفہ عنبرین..... نامعلوم شہر

1۔ ابھی تک کسی بھی کردار میں اپنی جھلک نظر نہیں آئی۔ اگر مجھے کسی ناول کے کردار کے ساتھ دوستی کرنے کا موقع ملتا تو وہ تھا عنیزہ سید کے ناول "دل من مسافر من" میں "ماسٹر ہدایت اللہ" کا کردار' وہ علم کا بہتا دریا ہے۔

ایک اور کردار جسے میں نے اپنے دل کے قریب محسوس کیا اور اس سے ہمدردی ہوئی' وہ تھا عالیہ بخاری کے ناول "دیوار شب" میں "نگینہ" کا کردار۔ نگینہ ایک ایکسٹرا گرل ہے لیکن اس کے سینے میں ایک ماں کا دل بھی ہے وہ اپنی بیٹی کو زمانے کے سرد و گرم سے بچانا چاہتی ہے لیکن وہ بے بس ہے۔

2۔ اگر مجھے کسی ایسی محفل میں جانے کا موقع ملتا' جہاں میری ساری پسندیدہ مصنفین جمع ہوتیں تو میں اس محفل میں جاتی' ان سب کو رک کے دور سے ایک نظر دیکھتی اور واپس آجاتی اور کسی سے کوئی سوال نہ کرتی کیونکہ ہم نے اپنے فیورٹ لوگوں کا ایک آئیڈیل بت بنایا ہوتا ہے۔ تو اگر ان لوگوں سے ملنے کے بعد ہم ان کو ویسا نہ پائیں تو ہمارے آئیڈیل کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔

بالکل ویسے جیسے چاند کو دور سے دیکھیں تو بہت خوب صورت نظر آتا ہے مگر قریب جائیں تو دھبے اس میں بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے فیورٹ لوگوں سے زندگی میں کبھی نہیں ملتی چاہے وہ کوئی رائٹر ہو یا شوبز کا کوئی اسٹار۔

سدرہ سعیدی..... بھکر

1۔ یادگار کردار تو بہت ہیں لیکن فرحت اشتیاق باجی

موسٹ فیورٹ رائٹر جن کا ہر لفظ مجھے اپنے دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر دوستی کرنے کا موقع ملے تو میں بنیہ سجاد "متاع جاں ہے تو" سے دوستی کرنا چاہوں گی اور یہاں دوستی کرنے کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بہت اچھی تھی یا عباد عذیر کی رفاقت نے اسے اچھا بنا دیا تھا اور اچھے لوگوں سے ملنے کا ان سے دوستی کرنے کا مجھے بہت شوق ہے۔

2۔ دوسرا سوال تو انتہائی پرجوش کر دینے والا سوال ہے۔ کاش کہ ایسا ممکن ہو پاتا۔ اگر کسی تقریب میں مجھے تمام مصنفین ایک ساتھ مل جائیں تو میں سب سے پہلے فرحت اشتیاق کو ڈھونڈوں گی اور ان سے یہی پوچھوں گی کہ آپ مجھے اتنا کیوں رلاتی ہیں؟ ان کی ہر تحریر مجھے پہروں رلاتی ہے اور میرے خیال میں وہ بہترین مصنفہ ہیں۔

نمرہ احمد جو ہمارے تھل کے علاقے کی نامور مصنفہ ہیں' ان سے تو میں بس ان کا ایڈریس لوں گی اور پھر تفصیلی ملاقات کر کے خوب انجوائے کروں گی۔ ان کے ناول "مصحف" سے تو میں ان سے بہت امپریس ہو گئی ہوں۔ اللہ ہم سب کو قرآن و حدیث کا علم سیکھنے کی توفیق دے۔ آمین

کنیز نبوی سے نہیں' ان کے ہزبینڈ سے پوچھوں گی کہ جتنی لونگ اور کیئرنگ ان کی کہانی کی ہیروئن ہوتی ہیں' یہ خود بھی ویسی ہیں کیا؟

آمنہ ریاض سے ریکویسٹ کروں گی کہ پلیز "ستارہ شام" کو اتنا طویل مت کیجیے گا کہ ہم بور ہو جائیں نبیلہ عزیز اور مریم عزیز کی ہلکی پھلکی اور رومانٹک اسٹوریز مجھے بے حد پسند ہیں۔ ان کو بہت بہت شاباش دوں گی۔

### سدرہ ایس ایم جی عبدالحکیم

1۔ سب ہی بہت اچھی اور دل کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ ہم ان ہی کے ساتھ روتے' ہنستے' خوشی مناتے اور رنگوں سے کھیلتے ہیں۔ بات تو ساری لکھاری کی ہوتی ہے کہ وہ انداز بیاں سے کیسے قارئین کو جکڑ لیتا ہے۔

مگر عالیہ بخاری کی "جویا" سے جو اپنائیت محسوس ہوتی ہے' ایسی آج تک کسی سے نہیں ہوئی۔ اس کا ہر ایک انداز' رویہ' سنجیدگی اور سمجھ داری سب دل کش محسوس ہوتی ہے۔

جویا اور معاذ کے درمیان ہونے والی ہر گفتگو اور پاکیزہ محبت کو میں نے اپنے دل سے قریب محسوس کیا۔ جی چاہا' جویا سے دوستی کر کے کہوں کہ جہاں اتنی ہمت کر کے شادی سے انکار کر دیا وہاں تھوڑی سی ہمت اور کر لو اور معاذ کی تمام غلط فہمیاں دور کر دو۔

2۔ اجتماع میں ہم موجود اور صرف ایک مصنفہ سے ایک سوال؟ نہیں نہیں ایسا ظلم ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ یوں ہے کہ سب مصنفین سے بہت سے سوالات لیکن۔

نمرہ جی! کیا اپر کلاس کی لڑکی ہی مہم جو بن سکتی ہے؟

کنیز! کیا وادی سندھ ہی عشق سے پر ہے' پنجاب نہیں؟ کبھی پنجاب کی محبت' اس کے ہیر رانجھا کے بارے میں بھی لکھیے نا۔

نگہت سیما! آپ کی کہانیوں کا اینڈ اداس کیوں کر جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں آپ کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ادھوری سی ہونے کے باوجود۔

### نمل..... ٹنڈو محمد خان

1۔ پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے کہوں گی کہ آسیہ رزاقی کی سنجیدہ صابر و شاکر حالات سے سمجھوتا کرنے والی' نگہت سیما کی سعادت مند' فرحت اشتیاق کی ایثار کا مجسمہ' نگہت عبداللہ کی عام سادہ سی پرکشش لڑکی' نمرہ بخاری کی خاموش طبع' راحت جبیں کی فطرت کی رنگینوں سے محبت کرنے والی' کنیز نبوی کی عشق حقیقی کی عارف' الحمدللہ یہ سب عکس مجھے اپنی ذات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان سب کرداروں کو میں اپنے قریب محسوس کرتی ہوں۔

آسیہ رزاقی کے ناول "آسان امتحان" جو اگست 2010ء میں شائع ہوا' کی "آمنہ" وجہ؟ دوسروں کے آرام و خوشی کے لیے اپنی ذات کی تکلیف بھلا دینے والی۔

رخسانہ نگار کے ناولٹ "کوئی دیپک ہو" کی "ثانیہ" جس کو پڑھنے سے محبت ہے' لگن ہے' جستجو ہے' مجھے دل سے قریب محسوس ہوئی۔

دوستی کا سوال ہے تو آسیہ رزاقی کے ناول کی ہر وہ عورت جو سلیقہ مند' گھریلو ہنر سے آراستہ' صبر و برداشت والی ہو' اس سے دوستی کرنے کو دل چاہتا ہے تاکہ وہ مجھے کمزور پڑنے پہ ہمت دلا سکے۔

2۔ دوسرے سوال کا جواب دینے کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔

بقیہ صفحہ 286 پر

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

آپ کی عافیت' سکون اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ پاک ہم سب کو' ہمارے پیارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے جو لوگ ہمارے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں۔ ان کے مذموم ارادوں کو ناکام کر دے اور انہیں دنیا اور آخرت میں نامراد رکھے۔ آمین۔

پہلا خط لکی مروت سے عابدہ بشیر مروت کا ہے' لکھتی ہیں

الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مسلمان بنایا' سب سے پیارا' اونچا اور عظیم الشان مذہب عطا فرمایا اور پھر اس کے بعد پیارا پاکستان.....

"اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

اگست کا مہینہ..... ماہ رمضان..... بہت کچھ یاد دلا رہا ہے یہ پیارا ملک جو ہمارے بزرگوں نے خون کی ندیاں عبور کر کے حاصل کیا یہاں ہمیں جان و مال کا تحفظ حاصل نہیں ..... کراچی جیسا شہر جس کو ہم مروت "قطر" کا نام دیتے ہیں ..... جس نے پاکستان بھر کے بے روزگاروں کو ایک ماں کی طرح اپنے دامن وسیع میں جگہ دی ..... یہاں روزانہ درجنوں افراد کی موت..... دل خون کے آنسو روتا ہے..... ایسے حالات میں کیسا جشن آزادی.....؟ بس دعا ہے کہ یا اللہ تو نے یہ ملک پاکستان کی نعمت عظمیٰ ہمیں عطا کی اس کی حفاظت میں ہم نے کوتاہی کی ..... معاف فرما اور آئندہ ہمیں اپنے مقصد کی طرف لوٹنے کی توفیق مرحمت فرما..... ہم پر رحم کر۔ آمین ثم آمین۔"

اب آتے ہیں شعاع کی طرف.....

سب سے پہلے "دل کے راستے" پڑھا ماہم کی سزا شروع ہو گئی۔ شاہم کا فیصلہ جذباتی سا لگا..... پھر اس کے دلائل نے قائل کر ہی لیا..... ویل ڈن سلویٰ علی بٹ۔

اس کے بعد "ستارہ شام" پڑھا معاذ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ پتہ تو چلے..... زری کا کیا ہو گا؟

باقی شعاع بھی بس ٹھیک ہی تھا..... "نہ برت یہ بے نیازی" کا شلی نام نے بہت متاثر کیا۔

پیاری عابدہ! آپ نے بالکل سچ لکھا' کراچی کے حالات سے ہر حساس دل رنجیدہ ہے پریشان ہے' خون کے آنسو روتا ہے۔ حکومت دہشت گردوں کے سامنے بے بس ہے۔ جو خطرات ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں ان کی ہمیں نہ فکر ہے نہ پروا۔ معیشت دن بہ دن بگڑتی جا رہی ہے' گیس بجلی اور پانی کا بحران حد سے زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔ لیکن ہم اپنے آپس کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

ہم کو صحن و بام کی تقسیم سے فرصت نہیں
بیٹھتی جاتی ہیں بنیادیں' مکان گرنے کو ہے

رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام دہشت گردوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دے' جو بے گناہ معصوم انسانوں کی جانیں لے رہے ہیں اور جو ان کو سپورٹ کرتے ہیں انہیں دنیا میں نشان عبرت بنا دے۔ آمین

سدرہ نے ایس ایم جی عبدالحکیم سے لکھا ہے

اس بار گیتی کی ہمت بہت اچھی لگی۔ سیدھی دل میں اتر گئی اور سالار کی تیزیاں ایکسیڈنٹ سمیت۔

یہ بے نیازی ہے۔ نبیلہ آپ نے اتنا اچھا لکھنا کیسے سیکھ لیا۔ مسلسل اور خوب صورت آپ بور نہیں ہونے دیتیں۔

مریم عزیز نے بھی اچھا لکھا۔

ع سے عورت م..... راشدہ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ظرف ظرف کی بات ہے عورت کا ظرف سمندر ہے۔

مجھے بات کرنا تھی آپ سے، نہیں جی کسی بھی شاخسار کی اوٹ میں نہیں بلکہ سرعام! بہت سی قارئین کا کہنا ہے کہ شعاع کا وہ معیار نہیں رہا یا پہلی کہانیوں جیسی بات نہیں رہی۔ اب! عام تجربے اور مشاہدے سے یہ بات اخذ کی گئی ہے کہ جب انسانی ذہن میں ذخیرہ مواد کم ہوتا ہے تو پڑھی یا سنی جانے والی چیزیں دیر تک یاد رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن میں سنی گئی کہانیاں ہمیں آج تک یاد ہیں جبکہ آج کل ہم ادھر خواتین، شعاع اور کرن پڑھ رہے ہوتے ہیں اور ادھر ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا ہے کہ فلاں کہانی شعاع میں ہے یا خواتین میں۔

میں نے اپنی پیدائش سے بھی پہلے کے تمام رسالے حفظ کر لیے جو میری پھپھو کے پاس ابھی تک محفوظ ہیں اور وہ ناول مجھے ازبر ہیں ان کے نام، کرداروں کے نام اور سن تک! جب کہ اب مصروفیت کی وجہ سے کہانی کا نام یاد رہا تو ہیرو، ہیروئن کا بھول گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مصروفیت کی وجہ سے ہم خود ناول یا کہانی کو وہ توجہ نہیں دے پاتے جو اس کا حق ہوتا۔ یقین کیجیے! یہ رسالے اور پیاری پیاری رائٹر موجودہ حالات کے حبس میں ہمارے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہیں سچ!

پیاری سدرہ! آپ نے تو ہمارے جواب کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ بہنوں کے اعتراض کا اتنا اچھا جواب دیا تہہ دل سے شکریہ۔

تحریم فاطمہ نے لیہ سے لکھا ہے

سب سے پہلے دل کے رستے دشوار بہت تھے، پڑھا۔ کیا زبردست ناول ہے۔ ویل ڈن سلوی جی۔ پلیز سلوی جی ارسل کے ساتھ برا مت کیجئے گا۔ ارسل میرا پسندیدہ کریکٹر ہے۔ ویسے ماہم کے ساتھ اچھا ہوا۔ وہ اسی قابل تھی۔ مریم عزیز کا ناول "تم سنگ مہکنے لگے راستے" بہت پسند آیا۔ عمرانہ مقصود کا ناولٹ "نمکین" کچھ خاص نہیں تھا "ستارہ شام" بھی زبردست جا رہا ہے۔

پیاری تحریم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کا تبصرہ ان سطور کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔

ثنا پانے کاموںکی ضلع گوجرانوالہ سے لکھا ہے

دیوار شب اچھی کاوش ہے مگر ستارہ شام میرا فیورٹ ناول ہے۔ مادی تو بالکل میرا ہی عکس ہے۔

اس ماہ کا شعاع چھا گیا۔ سارے سلسلے ہی بہت اچھے اور خوب صورت اور فیورٹ رہے۔ بس ایک اسٹوری کی سمجھ نہ آسکی کہ لکھاری اس میں اپنا کیا "پوائنٹ آف دیو" بیان کرنا چاہتی ہے۔ راشدہ رفعت کا افسانہ ع عورت م مرد۔

پیاری ثنا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔

آپ نے جو کہانی لکھی ہے ہمیں بھجوا دیں ہم پڑھ کر ہی رائے دے سکتے ہیں۔

راشدہ رفعت کے افسانہ میں مرد کی ذہنیت کی عکاسی کی گئی تھی کہ وہ اپنے گناہوں اور غلطیوں پر تو خود چاہے، جتنی غلطیاں یا گناہ کر لے اس کو حق ہے لیکن عورت کی چھوٹی سی غلطی بھی معاف نہیں کرتا۔

آصفہ صداقت نے چشتیاں سے لکھا ہے

لودھراں سے بہن رضوانہ شکیل راؤ نے ایک افسانے کے متعلق پوچھا تھا۔ ڈیر رضوانہ وہ افسانہ اکتوبر 2009ء خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ مصنفہ عائشہ فیاض تھیں افسانے کا نام مجھے گوندھ طیبہ کی خاک میں تھا۔ خط لکھنے کی دوسری وجہ پیاری سی قارئین ہیں۔ ان سے التماس ہے کہ خدارا تنقید کرتے وقت مثبت انداز اپنایا کریں۔ نایاب جیلانی قطعی حقیقت سے دور نہیں لکھتیں۔ ہمارے معاشرے میں اس سے زیادہ تلخ اور سفاک حقیقتیں موجود ہیں جو بعض اوقات احاطہ قلم میں بھی نہیں لائی جا سکتیں۔

آصفہ جی! ایک طویل خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھا، اچھا لگا۔ شعاع پر تبصرہ بھی ہوتا تو اور زیادہ اچھا لگتا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا اور اب اتنا طویل وقفہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔



ایمن تحریم سرگودھا سے شریک محفل ہیں

جب سے ہوش سنبھالا۔ گھر میں نانی، امی، آپی سب کو شعاع پڑھتے پایا۔ سلوی علی بٹ نے بہت اچھا شروع کیا ہے۔ بے شک "دل کے رستے دشوار بہت تھے" ایک عمدہ کہانی ہے۔ آمنہ ریاض جی نے بھی "ستارہ شام" کمال کا لکھا ہے۔ ع، عورت۔ م، مرد بھی بہت اچھا افسانہ تھا۔

پیاری ایمن! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ نے پہلی بار شرکت کی اور صرف دو کہانیوں پر تبصرہ۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

آمنہ اجالا ڈھرکی سے لکھتی ہیں

مکمل ناول میں نبیلہ عزیز اور مریم عزیز ایک ساتھ جلوہ افروز نظر آئیں تو ہماری چھوٹی بہن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ کیونکہ یہ دونوں رائٹرز اس کی آل ٹائم فیورٹ رائٹر ہیں۔ "تم سنگ مہکنے لگے رستے" لکھ کر اس بار مریم عزیز آپی نے میدان مار لیا۔ باوردی ہیرو صاحب نے کہانی کو اور بھی خوب صورت بنا دیا۔ ہمیں پولیس افسر و فوجی افسر ہیروز بہت پسند آتے ہیں۔ اس کے بعد جی باری آئی نبیلہ عزیز آپی کے مکمل ناول "نہ برت یہ بے نیازی" کی لیکن اس بار وہ ہمیں ذرا بھی متاثر نہ کر سکیں یوں لگا جیسے صرف خانہ پری کے لیے لکھا گیا ہو۔

اور نہ ہی ہمیں کشمالہ حیدر کی ایزد آفریدی سے نفرت ہی سمجھ میں آئی ایزد نے اسے کوئی دھوکا تو دیا نہیں تھا۔ صرف اپنی اور کشمالہ کی مدر کے کہنے پر اس سے دوستی ہی تو کی تھی وہ بھی محض اس کی بھلائی کی خاطر۔

اس بار عمرانہ مقصود کا نیا نام بھی دیکھنے کو ملا ان کا ناولٹ نمکین پڑھا لیکن رائٹر صاحبہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا معذرت کے ساتھ، بہت ہی بورنگ کہانی تھی۔

اور جی سلوی بٹ کا مکمل ناول بھی بہت اچھے انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔

عالیہ آپی نے بالآخر ہماری التجاؤں پہ کان دھر ہی لیے "دیوار شب" کی یہ قسط زبردست رہی۔ کہانی میں کچھ نیا موڑ تو آیا۔ شکر ہے سالار کی انٹری صحیح وقت پہ ہو گئی مگر آپی اب ہمارے خیام کا کیا ہو گا وہ میرا سب سے زیادہ فیورٹ کردار ہے۔

ایک بہن کی نایاب آپی کی کہانیوں پہ کی گئی تنقید بھی بالکل پسند نہیں آئی کیونکہ ہم نے ان کی آج تک جتنی بھی تحریریں پڑھی ہیں، وہ بغیر مقصد کے نہیں تھیں۔ وہ ایک بہت اچھی رائٹر ہیں۔

آمنہ! نایاب جیلانی پر تنقید کا آپ بالکل برا نہ مانیں۔ ان کو پسند کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

دیوار شب میں خیام کی فکر نہ کریں۔ اس کے ساتھ اچھا ہی ہو گا۔

طاہرہ حنا ساہی نے ڈھوک کاسب سے لکھا ہے

ہوش سنبھالا تو شعاع نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے شعاع سے دامن چھڑانے میں ناکام ہیں۔ تبصرہ کرنے کی وجہ خاص سلسلہ "سیر دو جہاں" ہے دوسرے نمبر پر "دیوار شب" واہ عالیہ جی! کیا پلاٹ ہے کیا کردار نگاری اور کیا سسپنس..... لاجواب۔ گیتی مجھے بے حد پیاری ہے تھینکس آپ نے اسے سالار کا ساتھ بخشا ..... کسی طرح آپا گل کا کچومر نکلے تو ٹھنڈ ہی پڑ جائے۔

"دل کے رستے دشوار بہت تھے" بہت اچھا جا رہا ہے "نہ برت بے نیازی" ونڈرفل لگا..... خاص کر جب پوری غزل پڑھنے کو ملی تو شعاع پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

افسانے سب ہی اچھے تھے۔ "عین عورت م مرد" نے دکھی تو کیا مگر کیا ہی بات تھی۔ پلیز آپ سارہ رضا (ننھی سنگر) اور FM ـ 95 کے بلال چوہدری کا انٹرویو بمعہ تصاویر شائع کریں۔

پیاری حنا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

بشریٰ انور خان، سپریئر کالج اوکاڑہ سے تشریف لائی ہیں

اس ماہ "دیوار شب" نے کافی اسپیڈ پکڑی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ع، عورت۔ م، مرد بہت اچھا افسانہ تھا۔ "دل کے راستے دشوار بہت تھے" شروع سے اب تک بالکل بھی متاثر کن نہیں ہے۔ شاہم اور ارسل کی حد درجہ بے تکلفی، منصور کا پیار اور ماہم کی بے اعتنائی غیر

حقیقی لگتے ہیں۔ "تم سنگ مہکنے لگے راستے کیا فلمی ناول تھا۔ پڑھ کر دیر تک افسوس ہوتا رہا کہ اگر شعاع میں بھی ایسے ناول پڑھنے ہیں تو اس سے بہتر ہے کہ بولی وڈ کی فضول سی فلم دیکھ لی جائے۔

اب تو شعاع کی اکثر تحاریر پڑھتے وقت یوں لگتا ہے کہ کوئی انڈین سوپ دیکھ رہے ہوں۔ جانے وہ نٹ کھٹ حقیقی زندگی کے قریب تحریریں لکھنے والی ناول نگار کہاں جا چھپی ہیں؟" تمکین لکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی؟ فضول سی تحریر لگی۔ "صبح کا ستارہ" "ستارہ شام اور دیوار شب اچھے ناول ہیں۔ افسانے سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن ناولوں میں ہر مرتبہ باقی آئندہ کی بیخ دل جلا دیتی ہے۔ ایک ہی شمارے میں اتنے زیادہ قسط وار ناول شروع کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔

میں نے تو اپنی شکایتیں آپ تک پہنچادیں اگر آپ کو برا لگا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

پیاری بشریٰ! آپ کی ساری شکایتیں سر آنکھوں پر۔ شعاع آپ کو پسند نہیں آرہا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اسے مزید بہتر بنا سکیں۔

دو سے زیادہ قسط وار کہانیاں دینا ہمیں خود پسند نہیں۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہماری مصنفین باوجود ہمارے شدید اصرار کے مختصر لکھنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اس وقت بھی ہمارے پاس کم از کم دس طویل ناول رکھے ہوئے ہیں جو ایک قسط میں نہیں لگا سکتے۔ اب آپ ہی بتائیے ہم کیا کریں؟

آپ نے مریم عزیز کے ناول پر جو اعتراض کیا ہے طویل ناول عموماً" ایک نشست میں نہیں لکھے جاتے۔ اس لیے کہیں اس طرح کی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے بھی یہ غلطی نوٹ نہیں کی اور آپ کو کوفت ہوئی۔

ماہم کی بے اعتنائی اور منصور کا پیار آپ کو غیر حقیقی لگتا ہے لیکن جب انسان کی تقدیر میں خرابی لکھی ہو تو پہلے اس کا دماغ خراب ہوتا ہے اور وہ اسی طرح کی حرکتیں کرتا ہے جیسے ماہم کر رہی ہے۔

تنزیلہ ریاض اور آمنہ ریاض بہنیں ہیں۔ ہم ان تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

## صالحہ اقصیٰ، میرپور آزاد کشمیر سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے ہماری طرف سے شعاع کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک ہو۔ شعاع اور خواتین کی تمام رائٹرز اچھی ہیں۔ کسی ایک رائٹر کی تعریف کرنا تو ناانصافی ہوگی۔

صالحہ اور اقصیٰ! آپ کا خط شامل اشاعت ہے آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا، ہمارے لیے کوئی بھی خط معمولی نہیں ہوتا اس لیے آئندہ یہ نہ سوچیے گا کہ آپ کا معمولی خط کون پڑھے گا۔

## سدرہ اشرف ضلع چنیوٹ تحصیل بھوانہ سے شریک محفل ہیں

میں 2002ء میں آٹھویں کلاس میں تھی جب پہلی دفعہ شعاع کو اپنی ایک ہم جماعت سے چھین کر پڑھا۔ بہت مزا آیا۔ اس کے بعد سے شعاع باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ نہ صرف ہمارا گھرانا بلکہ میرے ننھیال میں میری پانچ ممانیاں بھی بہت شوقین ہیں۔ ماہ رمضان کی آمد آمد ہے اور ہم سب ایک مرتبہ پھر سے شبلی اور جوادی کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں۔

پیاری سدرہ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جوادی اور شبلی ان شاء اللہ آئندہ ماہ عید نمبر میں شامل ہوں گے۔

## حمیرا رانا نے حافظ آباد سے لکھا ہے

مجھے سلسلہ وار ناول بہت پسند ہیں۔ بر عکس مکمل ناول، ناولٹ وغیرہ کے لیکن حد سے زیادہ اقساط بھی پڑھنے والوں کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں۔ عالیہ بخاری کا "دیوار شب" ایک اچھا ناول ہے۔ ساتھ ہی یہ ناول ست روی کا شکار ہے۔ جویا اور معاذ والا چیپٹر تو آپ نے کلوز ہی کر دیا ہے۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" میں ثمینہ کا عجیب و غریب رویہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ جیدی کو دھوکا کیوں دے رہی ہے۔ ماوی کا کردار بہت دلچسپ ہے۔ "تم سنگ مہکنے لگے راستے" مریم عزیز نے کمال کر دیا۔ اور دوسری بہترین کاوش "نہ برت بے نیازی" نبیلہ عزیز بہت اچھا لکھا آپ نے سلوی علی بٹ آپ نے شاہم کے ساتھ وہی کیا جو ہر دوسری بہن کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی پرانا موضوع کہ اگر ایک فوت ہو جائے یا کوئی غلط قدم اٹھالے تو دوسری کو اس کی جگہ قربان کر دیا جاتا ہے۔ خواہ اسے اپنے خوابوں کا محل ہی کیوں نہ مسمار کرنا پڑ جائے۔ بہر حال ارسل کو نوٹ مت کیجیے گا۔ "صبح کا ستارہ" کاشف کا یہ روپ بالکل پسند نہیں آیا۔ کیا کم شکل لوگوں کا اس دنیا میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تمکین بالکل پسند نہیں آیا۔ افسانے تمام ہی اچھے تھے۔ باقی تمام سلسلے بھی پہلے کی طرح لاجواب تھے۔

نایاب جیلانی کے بھائی کا کیا مسئلہ ہے۔

پیاری حمیرا! ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی میں جہاں جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں، یہ حال ہے کہ دن دہاڑے بے گناہ معصوم لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور قاتلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ جب اس بڑے شہر میں یہ حال ہے تو سوچ لیں کہ گاؤں اور قصبوں میں کیا حال ہو گا۔ نایاب جیلانی کا بھائی بے گناہ تھا اس لیے ان کے والد نے خود حوالے کیا تاکہ اس کی بے گناہی ثابت ہو اور دشمنی کا سلسلہ آگے نہ بڑھے لیکن یہاں انصاف کون کرنے والا ہے۔

آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اللہ تعالیٰ اس بچے کو تمام مشکلات سے نجات دے تاکہ وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔

سلوی علی بٹ نے پرانے موضوع کو کیا نیا رنگ دیا ہے۔ وہ آپ آخری قسط پڑھ کر جان سکیں گی۔ ستمبر کے شمارے میں اس ناول کی آخری قسط شائع ہو گی۔

## بشریٰ حسن راولپنڈی سے تشریف لائی ہیں

ماہ جولائی کے شمارے کا سرورق پسند آیا۔ انٹرویو کا نیا شروع ہونے والا سلسلہ بندھن کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ کچھ نئے فنکاروں کے انٹرویو بھی لیے جائیں۔ جیسے یمنی پیرزادہ، رضوان علی اور FM-94.6 کے D.J عتیق الرحمن بھٹی کا بھی انٹرویو شائع کریں۔ "دل کے راستے" سلوی بٹ کی تحریر متاثر کن ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے عمرانہ مقصود کا ناول "تمکین" بہت اچھا لگا۔ میری صبح کا ستارہ کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر سکا۔ شکل و صورت اپر کلاس کا مسئلہ نہیں ویسے بھی کاسمیٹکس انڈسٹری میں اب اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ لیزر ٹریٹمنٹ سے کالی رنگت کو بھی سفید کیا جا سکتا ہے۔ مریم عزیز کا ناول بھی بہت اچھا تھا۔ میں ایک گزارش آپ اور تمام قارئین کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں کہ پرانی تحریریں جو قارئین نے بہت پسند کیں ان میں سے کچھ بہترین تحریریں شائع کریں۔

جیسے ساجدہ حبیب، سلمیٰ یاسمین نجمی، راحت جبیں اور غزالہ نگار اور کرنی کی تحریریں اب تک دل پر نقش ہیں لیکن نئی آنے والی تحریروں میں سے چند ہی اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

تاریخ کے جھروکے کا سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ بہت معلوماتی سلسلہ ہے۔ شاعری سچ بولتی ہے میں مسز فصیحہ کا انتخاب اچھا تھا۔

پیاری بشریٰ! پہلی بات تو یہ ہے کہ کاسمیٹکس انڈسٹری کتنی بھی ترقی کر لے خوب صورتی صرف رنگ، نقش خدوخال میں نہیں ہوتی۔ پوری شخصیت میں ہوتی ہے۔ ماہین کا مسئلہ بدصورتی نہیں اعتماد کی کمی ہے جو اس کی چھوٹی بہن اور ماں کی غیر معمولی خوبصورتی کی اور ان کے رویے کی وجہ سے ہے۔ بچپن سے ہی اس کی شخصیت کو دبایا گیا جس کی بنا پر وہ تعلیم بھی نہ حاصل کر سکی جبکہ اس کی پھوپھی ثروت جس کی شکل و صورت اسی طرح ہے زندگی میں کامیاب اور خود اعتماد ہے۔ سائرہ عارف نے اسی مسئلہ کو اجاگر کیا ہے۔ پرانی تحریریں ہم بھی شائع کرنا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہماری بیشتر قارئین کہیں نہ کہیں سے شعاع کے پرانے پرچے حاصل کر کے پڑھ لیتی ہیں اس لیے ان تحریروں کو دوبارہ شعاع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

## حمیرا، فائزہ، اجواء اور عابدہ، مصطفیٰ آباد (للیانی) ضلع قصور سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے آمنہ ریاض کا ناول ستارہ شام پڑھا بہت ہی اچھا لگا کہ آپ اس میں تھوڑی سی تیزی پیدا کریں اس کے بعد میں سائرہ عارف کے ناولٹ میری صبح کا ستارہ کی تعریف کرنا چاہوں گی۔ بہت ہی اچھا ناولٹ ہے۔ عالیہ بخاری جی آپ کے تو کیا کہنے ہیں، آپ نے تو واقعی ہی میں اس دفعہ بہت بہت کمال سے لکھا ہے۔ باقی سب ناول بھی اچھے ہیں پلیز آپ کبھی تفصیل سے ابرار الحق اور شاہد خان آفریدی کا بھی انٹرویو شائع کریں۔ سب سے خاص بات آپ کے تاریخ کے جھروکوں سے۔ بہت اچھے لگتے ہیں، اس سے ہمیں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہے بہت سے ایسے واقعات اور ایسی شخصیات ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔

حمیرا، فائزہ، اجوا اور عابدہ! بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط

شامل نہیں ہو سکا۔
مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اور ہاں ایک بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں آپ لوگ بہنیں ہیں یا سہیلیاں؟

**عابدہ خان عالی نے گوجر خان سے لکھا ہے**

میری سسٹر نازیہ اور میری بھانجیاں بھی بہت شوق سے آپ کے پرچے پڑھتی ہیں۔ اس ماہ کے شمارے کی' کہانی ع' عورت۔ م' مرد کوئی اتنا بھی لکھ سکتا ہے؟ اتنی گہری اور زبردست کہانی لکھنے پہ پہلے راشدہ رفعت کو مبارک باد۔ آمنہ ریاض اور عالیہ بخاری کے ناولٹ پڑھے۔ مجھے عالیہ جی اور آمنہ جی کے لکھنے میں بہت مماثلت نظر آتی ہے 'عمدہ انداز بیاں' عالیہ کے ناولز انتہائی سادگی لیے ہوئے مگر بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جالی دار دروازے 'دادی اماں کا کردار' محراب ستون والے برآمدے' کچن کی کھڑکی اور سیدھے سادے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ پلیز مکمل ناول لکھیں۔ اس کے علاوہ سلویٰ علی بٹ 'ایک نیا اضافہ کاشا کے ڈائیلاگز بہت مزا دیتے ہیں۔ ہر لحاظ سے بہترین ناول۔ اس کے علاوہ سب کہانیاں اچھی لگیں۔ میں تو لکھنے والوں کو داد دیتی ہوں کہ وہ لکھ کیسے لیتی ہیں؟ میں نے ایک' دو بار کوشش کی لکھنے کی مگر نہیں لکھا گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ لکھنا اتنا بھی آسان نہیں جتنا آسانی سے ہم تنقید کر جاتے ہیں۔

پیاری عابدہ! کہانی لکھنا واقعی بہت محنت طلب کام ہے اور یہ ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لیے خداداد صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے جا تنقید جس سے کسی کی حوصلہ شکنی ہو ہرگز نہیں ہونا چاہیے لیکن مثبت' تنقید جس سے کسی کو خود کو بہتر بنانے یا سنوارنے کا موقع ملے اسے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
اپنی بہن نازیہ اور بھانجیوں تک ہمارا شکریہ پہنچا دیں اور یہ کیا بات ہوئی کہ گیارہ سال سے مستقل قاری ہیں اور خط ایک بھی نہیں لکھا۔

**ستارہ آمین کومل نے پیر محل سے لکھا ہے**

شعاع رسالہ کوئی تفریح کے طور پر پڑھا جانے والا نہیں بلکہ شاندار استاد قابل ترین دوست پیاری والدہ عالی شان بڑی اماں لائق فائق بھیا اور نرم نفیس بہن سایہ دار شجر جو پھل بھی دے کے طور پر پسند کیا پڑھا دوستی نبھائی اور ثابت قدم رہے۔ یوں یہ سفر جاری و ساری ہے۔ ایسا وقت بھی تھا جب ہم اسے لک چھپ کر پڑھتے کیوں کہ اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ کسی نے ان کے کان بھر دیے کہ رسالوں میں منگنی' بیاہ' عشق محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا خود تو ڈانٹتیں ابا کو بھی گرم کرتی تھیں۔ تو ڈانٹ پڑتی شاندار اور جاندار قسم کی پھر پہلے میں نے ابا کو قائل کیا۔ انہیں بتایا بھلے آپ پڑھ لو اس میں کوئی ایسا ویسا نہیں ہوتا۔ اب صورت حال اس طرح ہے ابا خود شعاع لاتے ہیں۔ مجھے حکم دیا جاتا ہے کہ آپ بھی لکھو حصہ لو۔ اپنی صلاحیت بروئے کار لاؤ۔ آپ کے میگزین کے ذریعے ابا کو خراج تحسین پیش کروں گی۔ جنہوں نے ہمیں تعلیم دلوائی انہوں نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہماری مرضی کا کھانا۔ پہننا اوڑھنا' لکھنا ہر طرح سے ہمارا ساتھ دیا۔ پاکستان سے محبت کا درس اولین ہے۔ پہلے ذرا مجھے بتا دیں کہ شاعری سچ بولتی ہے میں انتخاب بھجوایا تھا۔ اس کا کیا بنا؟
بتا دیں پلیز' میری اکلوتی فرمائش' جناب مجید نظامی کا انٹرویو دیں پلیز جلدی سے۔

ستارہ! آپ کے والد واقعی خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کرنے ان سے محبت کا سلوک کرنے والے اور ان کی بہترین پرورش کرنے والوں کا بڑا درجہ اور مقام ہے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

**ندرت نے کراچی سے لکھا ہے**

ہمارے اور شعاع کے ساتھ کو برسوں بیت گئے' پہلے میری خالہ پڑھا کرتی تھیں۔ اب بھی پڑھتی ہیں اور نانی کے گھر تین ڈائجسٹ آتے ہیں شعاع' کرن اور خواتین میں نانی کے گھر ہی جا کر پڑھتی ہوں جب تک کوئی بھی کہانی پوری نہ کر لوں' رکھتی نہیں ہوں۔ میری خالہ نزہت کو پڑھتے ہوئے تقریباً" بیس سال ہو گئے اور مجھے دس سال ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنی خالہ سے کہا کہ آپ بھی خط لکھ کر بھیجیں تو انہوں نے کہا کہ میں نے دو دفعہ لکھ کر دیا ہے لیکن وہ شائع نہیں ہوا پھر مجھے کہا کہ اچھا تم لکھ لو۔ پلیز یہ خط ضرور شائع کیجئے گا تاکہ میں اپنی خالہ کو دکھا سکوں۔
ہماری سب سے پسندیدہ رائٹر "عمیرہ احمد" ہے اور اول "پیر کامل" ہے۔ اس کے بعد فرحت اشتیاق وہ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں پلیز ان سے کہیں کہ وہ دوبارہ لکھیں۔
اب آتے ہیں اس شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے عالیہ بخاری کا دیوار شب پڑھا پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ سالار اور کیتی کا نکاح کافی عرصے بعد کہانی میں نیا موڑ۔ پلیز کہانی میں اور تیزی لائیے۔ آمنہ ریاض بھی کافی اچھا لکھ رہی ہیں پر ایک بات سمجھ نہیں آ رہی کہ ماوی کا منگیتر شہروز ہے پھر بھی ثمینہ جلال کو ان دونوں کے درمیان کیوں لا رہی ہے۔

مریم عزیز کا تم سنگ پڑھا ٹھیک ہی تھا۔

ندرت! ثمینہ ماوی کو ایک خاص مقصد کے تحت جلال کی طرف راغب کر رہی ہیں۔ کیونکہ جلال کا حویلی سے تعلق ہے اور ماوی کے والد کا بھی اسی جگہ سے تعلق تھا۔ شعاع میں خط لکھنے کا شکریہ آپ کی خالہ بھی خط لکھتیں تو ہم ضرور شائع کرتے۔ انہیں ہماری طرف سے سلام پہنچا دیں۔

**انعم فیاض فرام اکبر ٹاؤن ملتان سے لکھتی ہیں**

اللہ تعالیٰ آپ کے رسالوں کا معیار یونہی قائم رکھے۔ میرا رزلٹ 4 اگست کو آؤٹ ہو گا تمام قارئین سے استدعا ہے کہ میرے لیے بہت بہت دعا کیجیے۔

پیاری انعم! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ آمین۔
قارئین تک آپ کی درخواست پہنچا رہے ہیں۔

**شمائلہ تاج نے خان پور سے شرکت کی ہے**

ٹائٹل گرمیوں کی مناسبت سے بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے سلویٰ علی بٹ کا ناول "دل کے راستے دشوار بہت تھے" پڑھا۔ ماہم پر بہت زیادہ غصہ آیا' یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی خود غرض' اتنی بے حس کوئی عورت ہو سکتی ہے۔
آصفہ عنبرین قاضی کا افسانہ "یہ لوگ" بھی کافی اچھا افسانہ تھا۔

پیاری شمائلہ! ہمیں بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ متواتر کئی خط شائع نہ ہونے کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا لیکن آپ یقین کریں کہ ہمیں اس سے پہلے آپ کے خطوط موصول نہیں ہوئے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
شاہم اور ماہم دونوں بہنیں ایک ہی جیسے کردار اور ذہن کی مالک ہیں۔ ان کی زندگی میں اہمیت صرف اپنے فیصلوں' اپنے دل کی ہے۔ جو ان کی خواہش ہے وہ صرف اس پر عمل کرتی ہیں۔ ماہم نے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نہ منصور کے دل کی پروا کی نہ بچے اسے روک پائے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنی خوشیوں کے پیچھے چلی گئی۔
شاہم نے بھی یہی کیا۔ ارسل کے ساتھ محبت کے راستوں پر اتنی دور چلی گئی۔ بے تکلفی کی انتہا کر دی۔ اس کے فلیٹ پر جا کر اس سے ملتی رہی اور جب یہ فیصلہ کیا کہ اسے منصور سے شادی کرنا ہے (وجہ جو بھی ہو' حقیقت صرف اتنی ہے کہ منصور ایسا نہیں چاہتا تھا) تو اس نے ارسل کو ٹھکرا دیا اور منصور کے فرار کے سارے راستے مسدود کر دیے۔ منصور کو شاہم سے شادی کرنا پڑی۔ جو لوگ دل کے راستوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں ان کو پشیمانی کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

عالیہ بخاری

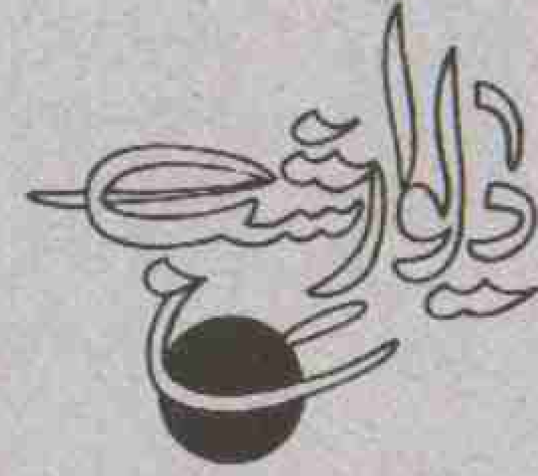

۴۲

بیالیسویں قسط

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتّٰی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آکی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اسے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو وفائی کا ہول میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتّٰی کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

دو سو سال قدیم، محرابی دروازوں والے اس چوبارے کے باہر بارش ایک بار پھر بہت زور سے برسنا شروع ہوئی تھی۔ شرر، شرر، شرر!

محرابوں کے اوپر سے بہتے ہوئے پانی کا شور، بادلوں کی گھن گرج، آس پاس دبی زبانوں میں ہونے والے تبصروں کو اس تک پہنچنے میں حائل ہوئی تھی۔

سالار کے ساتھ وہ طویل برآمدہ طے کرتے ہوئے گیتی نے چند ہاتھوں کو اپنے سر پر باری باری محسوس کیا اور ہر بار آنسوؤں کے قطرے چہرے سے پھسل کر فرش میں جذب ہوئے۔

کون کون تھا ان میں!

شاما، خالہ گل ناز، نانی دل دار یا پھر شاما کے پاس آئی پاس پڑوس کی وہ لڑکیاں، جن کا کوئی رتبہ مرتبہ بھی نہیں، مگر وہ ان سب کی دل سے مقروض ہوئی۔ دعا سے بڑھ کر کسی کو دینے کے لیے کوئی قیمتی تحفہ نہیں اور دل سے دعا دینے والے سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں۔

سو اس کی خوش قسمتی میں کیا کلام!

اپنے پیروں پر نظر جمائے اس نے یہاں سے وہاں تک کا راستہ طے کیا۔

"میری بچی کو رخصت کیجیے اماں!"

پہلی سیڑھی اترنے سے پہلے نگینہ نے اسے نانی ستارہ کے سامنے کھڑا کیا۔

آس پاس چند لمحوں کے لیے جیسے سناٹا سا چھایا۔ گیتی کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

اب معلوم نہیں وہ کس طرح کے رد عمل کا اظہار کرنے والی تھیں گھرانے کی تاریخ میں یہ پہلا کام تھا، جو ان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔

نہیں شاید دوسرا!

پہلا خالہ فیروزہ کا جانا تھا۔

مگر وہ تو چپکے سے چلی گئی تھیں، یوں علی الاعلان نافرمانی تو اسی کے حصے میں آئی تھی۔

ہلکی سی کپکپاہٹ گیتی کے سارے وجود میں اتری۔

اس روز جب محض زبانی انکار پر ان کا ہاتھ اس پر پہلی بار اٹھا تھا، تب اس نے بجا طور پر جانا تھا کہ نانی ستارہ کے جاہ و جلال کا ڈنکا یوں ہی نہیں بجتا تھا۔

برادری کی لڑکیاں ان کے سامنے کھڑا ہونے کے خیال سے ہی کانپتی تھیں، تو حق بجانب تھیں۔

اس کی اپنی نگاہ فرش پر جمی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جس خود اعتمادی کا مظاہرہ وہ کر چکی تھی، وہ نکاح نامے پر دستخط کے ساتھ ہی پھر سے زیرو پر آچکی تھی۔

ایک انتہا سے، دوسری ابتدا کے بیچ کا راستہ جیسے فضا میں معلق تھا۔

"گیتی کو اپنی دعا کے ساتھ رخصت کیجیے اماں!"

نگینہ نے خاموش کھڑی نانی ستارہ کو پھر سے یاد دلایا تو انہوں نے چونک کر نگینہ اور پھر گیتی کو دیکھا۔

"فی امان اللہ!"

الفاظ ان کے منہ سے بنا کسی تاثر کے نکلے اور ان کی انگلیوں نے گیتی کے سر کو چھونے کا فرض سا ادا کیا اور بس۔

برآمدے میں جمع اس چھوٹے سے مجمع میں نانی ستارہ کے لیے راستہ بنانے میں ہلکی سی کھلبلی مچی۔

بنا کسی اور کی طرف دیکھے وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔



"نانی، پلیز!" سالار نے بے چین سا ہو کر انہیں پکارنا چاہا مگر نگینہ نے اشارے سے منع کیا۔

"فکر مت کرو، میں دیکھ لوں گی۔" اس کے لہجے میں بڑی ہی نرمی اور مٹھاس تھی "تم خیر سے اپنے گھر کو سدھارو!"

یہ لب و لہجہ نگینہ کا نہیں تھا۔

خود گیتی نے چونک کر نگینہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھی۔

چہرے پر غضب کا سکون اور پورا وجود جیسے بہت ہی ملائم سی روشنی کے ہالے میں مقید

اتنی روشن، اتنی اجلی، اتنی حسین اور منفرد

گیتی کی نگاہ اس پر سے ہٹنا بھول گئی تھی۔

یہ وہ چہرہ کب تھا جسے ہوش سنبھالنے سے اب تک محض جیسے بھاگتے دوڑتے ہی دیکھا تھا۔

پیروں تلے جلتی آگ کی تپش پورے وجود اور زبان پر انگارے برساتی تھی۔

نانی ستارہ جان کے معروف گھرانے میں سب سے نچلے درجے پر کھڑی نگینہ جان۔

یہ وہ کب تھی!

گیتی کی خود پر جمی نگاہ نے اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیری تھی۔

"شکر ہے اس پروردگار کا، جس نے مجھے میری اپنی نظر میں سرخ رو کیا۔" گیتی کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے پورے سکون قلب کے ساتھ کہا اور محبت سے اس کی پیشانی چومی۔

"اللہ کے سپرد!"

گیتی بے ساختہ اس کے سینے سے لگی۔

"امی، امی!"

الفاظ سسکیوں کی طرح اس کے لبوں سے ادا ہوئے اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگتا چلا گیا۔

نگینہ کے پورے وجود میں ٹھنڈک کا ایسا سکون بخش احساس جاگا، جس کے لیے وہ آج تک ترسی تھی۔

نہ صندل کے سپر اسٹار بننے میں

نہ ہی خالہ دل دار، اور گل ناز کو نیچا دکھانے میں

اور نہ ہی الماس کی مارکیٹ ویلیو کم ہونے اور شیرازی کمینے کو اس کی اوقات یاد دلانے میں۔

ایسی راحت تو نصیب والوں کو ملتی ہے، سو وہ آج واقعی نصیب والی ٹھہری۔

"بس کر بیٹا! خوشی کے موقع پر روتے ہیں کیا؟"

گیتی کو دھیرے سے خود سے الگ کرتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔

"چل بیٹا سالار! سنبھال اپنی امانت!"

اس نے گیتی کا ہاتھ سالار کے ہاتھ میں تھمایا اور خود جیسے ہر فرض سے فارغ ہو کر پیچھے ہٹی۔

ایک قدم پیچھے اور ایک قدم۔

کون کون تھا، جو گیتی کو رخصت کرنے نیچے تک گیا تھا۔ لیکن وہ وہیں کھڑی تھی، تب ہی اپنے پیچھے گھٹی گھٹی سسکیں پر اس نے مڑ کر دیکھا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی گل ناز کی آنکھیں روتے روتے سرخ تھیں۔

"لے پاگل ہوئی ہے، رو رو کر برا حال کر لیا، بھانجی عزت سے رخصت ہوئی ہے، اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہے، تیرا بھی جواب نہیں گل ناز!"

گلے سے لگ کر روتی ہوئی گل ناز پر اسے زندگی میں پہلی بار بڑا ہی پیار آیا۔

مگر عجیب سی بات تھی وہ خود جو زندگی بھر بات بے بات دل بھر کر آنسو بہاتی آئی تھی آج اس کی آنکھ میں آنسو کی بوند بھی نہیں چمکی تھی۔ گل ناز نے اس کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"اللہ تجھے گیتی کی بہت خوشیاں دکھائے نگینہ! بڑی کٹھن محنت ہے تیری ان بچیوں کے پیچھے۔" گل ناز نے آہستہ سے کہا۔

آج کا دن خاص تھا' دعاؤں اور برکتوں والا۔

"چل آ' یہاں اوپر سے دیکھتے ہیں۔"

گل ناز کا ہاتھ پکڑ کر وہ برآمدے کی محراب کے نیچے آکر کھڑی ہوئی۔

اوپر سے تسلسل کے ساتھ بہتے ہوئے پانی کے دوسری طرف کا منظر دھندلائے جا رہا تھا' مگر بے حد خوشگوار تھا۔

کسی مہربان نے چھتری تان دی تھی۔

سالار نے بڑی مشکور نظروں سے دیکھا۔

بالی صاحب اور صندل نے انہیں چھوڑنے جانے کی ذمہ داری از خود سنبھالنا چاہی تھی۔

"آپ چاہیں تو ہوٹل میں یا پھر میرے گھر پر......"

بالی صاحب اب تک اس سے بے حد متاثر ہو چکے تھے اور ان کی ایک چھوڑ دو نئی قیمتی گاڑیاں قریب ہی کھڑی تھیں۔

"آپ کا بے حد شکریہ بالی صاحب! اگر میرے پاس جانے کا انتظام ہے!" سالار متانت سے مسکرایا۔

دکان کے شیڈ کے نیچے کھڑی ٹیکسی کے ساتھ کھڑا ہوا وہ باتونی ڈرائیور مسکرا رہا تھا۔

"اس میں..... اس میں جائیں گے؟" بالی سے زیادہ صندل کو عجیب سا لگا۔

"ہوں' کیا حرج ہے اور یہ برات آئی بھی تو اسی میں ہے کیوں راجو؟"

اس بھیڑ میں بھی اپنے ساتھ ساتھ چلتے راجو سے سالار نے تائید چاہی' تو اس نے مسکرا کر فوراً" ہی سر ہلایا۔

معاملہ اب پوری طرح نہ سہی' کچھ کچھ تو سمجھ میں آ ہی رہا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مستعدی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔

"اجازت!" وہ ان سب کی طرف مڑا۔

"جیتے رہو!" استاد فراغت بیگ کا کانپتا ہوا کمزور ہاتھ کسی سائبان کی مانند ان دونوں کے سروں پر ٹھہرا۔

اور صندل گیتی کو گلے لگاتے ہوئے بڑے دل سے دکھی ہوئی۔

"کیا جھوٹ اور کیا حقیقت' گیتی کا نصیب بھی جانے کہاں کھلا ہے۔" وہ ابھی تک مشکوک تھی۔

"سنیں! آپ لوگ ابھی کہاں جائیں گے' میرا مطلب ہے کون سے ہوٹل؟"

سالار کی اوقات جاننے کے لیے اسے فی الحال یہی طریقہ سوجھا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا' صندل کا سوال سن کر ایک لمحے کے لیے رک کر مسکرایا۔

"میرا گھر ہے' یہیں ڈیفنس میں' اس کا ایڈریس آپ کو ٹیکسٹ کر دوں گا' ٹھیک؟"

صندل کا منہ ہلکے سے کھلا۔

"اور یہ آپ کی ٹانگ' کوئی چوٹ لگی تھی کیا؟" اتنی دیر میں پہلی بار بالی کو احساس ہوا تھا کہ اسے چلنے میں دقت ہو رہی ہے۔

"جی بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

وہ مختصری وضاحت دے کر ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔



سامنے برآمدے کی محراب کے نیچے کھڑی نگینہ اور گل ناز کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"کیسی نرالی شان ہے گیتی کی برات کی!" آج نگینہ کی نگاہ میں پراڈو' کرولا' سب ہی صفر ہوئی تھیں۔

ٹیکسی ۔ دائیں بائیں گھومتی گلی میں اب غائب ہوتی جا رہی تھی اور آسمان سے برستا پانی جیسے نہ رکنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

"آپ تو بہت ہی کمال کے آدمی نکلے صاحب! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ یہاں' اس وقت' اس موسم میں شادی کرنے آئے ہیں۔ حد ہو گئی یہ تو' میں نے تو اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسی شادی نہیں دیکھی' یقین ہی نہیں آ رہا ہے' پچ ماننے گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی زبان پھر چل پڑی تھی اور اتنی دیر میں جتنا وہ حیرت زدہ ہو چکا تھا' اب اتنا بولنا اس کا حق بنتا تھا۔

"زندگی میں بہت کچھ ہم پہلی بار ہی دیکھتے اور سنتے ہیں بھائی! اس لیے اب اگلی بار جب تم ایسی کوئی شادی دیکھو گے تو بالکل بھی حیرت نہیں ہوگی' بلکہ کہو گے کہ ارے یہ کون سی خاص بات ہے' ہم تو پہلے بھی دیکھ چکے ہیں!"

"ہاں' یہ تو ہے!" وہ سالار کے جواب سے فوراً" ہی متفق بھی ہوا۔ "ویسے لوگ بہت مہمان نواز تھے' مجھے بھی اصرار کر کے کھانا کھلایا اور بڑی مدت بعد اتنا لذیذ کھانا کھایا کہ مزا آ گیا' میں نے تو ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بیٹے کی شادی بھی بس اسی طرح کروں گا' کوئی جھنجھٹ' کوئی ہڑبونگ نہیں اور براتی بس اس ٹیکسی کی سواریوں سے زیادہ نہیں' آج ہی یہ فیصلہ گھر والوں کو سنا دوں گا' جسے اعتراض ہو' ہو تا رہے۔"

اس تازہ ترین واقعے سے وہ سخت متاثر تھا اور ایکسائٹمنٹ تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

سالار نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر قریب بیٹھی گیتی کی طرف دیکھا' دوپٹہ کچھ اس طرح تھا کہ چہرے کی بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑتی تھی' سو وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھا۔

ٹیکسی والا ابھی تک اپنے بیٹے کی شادی کے جھگڑے میں الجھا ہوا تھا۔

"ہمارا تو مذہب بھی سادگی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بس جی بس' ابتدا آپ نے کی' آگے میں لے کر جاؤں گا' میرا بیٹا......"

"کیا عمر ہے آپ کے بیٹے کی؟" سالار کو ٹوکنا پڑا۔

"اس کی..... جی سات سال اور ساڑھے چار ماہ!"

"کیا!" سالار کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔

تب ہی اس کے کانوں میں دبی دبی سی ہنسی گونجی تھی۔ ایک ہاتھ سے ہنسی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بڑے ہی بے ساختہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

باہر دھواں دار برستے پانی کے پس منظر میں' اس پرانی ٹیکسی میں کتنے ہی رنگ اترے۔ وہ بڑے دھیان سے اسے دیکھے گیا۔

گیتی کو شاید اس کی خود پر جمی نگاہ کا ہی احساس ہوا تھا جو اس نے جھینپ کر پھر سے سر جھکا لیا' لیکن وہ پھر بھی اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

جو کچھ بھی ان چند گھنٹوں میں رونما ہوا' خود اس کے لیے بھی ناقابل یقین تھا' ابھی جب وہ یہاں آ رہا تھا' تمام تر پریشانی اور بے چینی کے باوجود وہم و گمان میں' کہیں دور دور بھی ایسی صورت حال نہیں تھی' جو کہ پیش آئی۔

وہ جو کچھ کہنے کا ارادہ ہی باندھنے سے گھبرا اٹھتا تھا' آج سارے معاملے کو ہنگامی بنیادوں میں نمٹا گیا۔

سب کچھ جیسے خود بخود ہوتا چلا گیا تھا۔

"اگر وہ ذرا سا بھی لیٹ ہو جاتا تو؟"

گو اب سارے برے امکان ختم ہو چکے تھے' پھر بھی.....

اس نے ہلکے سے سر کو جھٹک کر' جیسے کچھ رد کیا۔

آگے بیٹھا راجو بڑے اعتماد سے گھر کا پتا سمجھا رہا تھا۔

سالار کو یاد آیا کہ وہ نبیل کے ساتھ یہاں آ کر رہ چکا ہے۔ گیٹ پر کھڑے گارڈ نے احترام سے گیٹ کھولا تھا۔

شام مکمل طور پر ڈھل کر رات میں تبدیل ہو رہی تھی جب وہ گیتی کو لے کر گھر کے اندر آیا تھا۔

"یہاں کوئی بھی نہیں ہے' جو تمہارا استقبال کر سکے' ویسے تو میرا اپنا کوئی ہے بھی نہیں' جو تمہیں اس محبت کے ساتھ خوش آمدید کہہ سکے گیتی! جواب تمہارا حق بنتا ہے' مگر مجبوری ہے۔ امید ہے تم زیادہ محسوس نہیں کرو گی۔"

بڑے سے بیڈ پر جب وہ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی' تب سالار نے پہلی تفصیلی بات کی۔

گیتی نے جھجکی جھجکی نظر سے سالار کی طرف دیکھا۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ' اب بھی اس کے چہرے پر تھی۔

مگر وہ تھوڑا سا اداس بھی تھا۔

گیتی کا دل اسے بہت ساری تسلی دینے کو شدت سے چاہا۔

مگر.....

دونوں کے بیچ' خاموشی کا سکون بھرا سا وقفہ آیا۔

گلے شکوے' خوشی' تشکر اور اعصاب کو توڑتا' بے یقینی کا طویل دور۔

سب ہی کچھ آپس میں گڈمڈ ہوا جا رہا تھا اور وہ جو اس سے پتا نہیں کیا کیا کہنے کے لیے بے تاب تھی' اب سخت کنفیوژن کا شکار۔

بات شروع بھی ہو تو کہاں سے؟

جب وہ اسے اس طرح چھوڑ گیا تھا کہ پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا' اس شدت بھرے گلے سے۔

یا پھر اس مہربان لمحے کے شکریہ سے' جب وہ اس مہمانوں سے بھرے ہال میں اپنا فیصلہ سنا رہا تھا اور وہ خود زندگی کی طرف واپس آئی تھی۔

اس نئی زندگی کا شکریہ تو واجب تھا۔

نگاہیں جھکائے' دلہن کے خوب صورت روپ میں' کسی سوچ میں گم' اتنی گم کہ شاید اس کی یہاں موجودگی بھی بھولی ہوئی ہے۔

سالار نے گیتی کے چہرے کو تکتے ہوئے کچھ ایسا ہی محسوس کیا اور بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟" وہ بے ساختہ ہی اس کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں! وہ میں تمہارے لیے چائے بنوا کر لاتا ہوں' یہ تمہارا بیگ آیا ہے کپڑوں کا۔ چینج کر لینا۔"

وہ کہہ کر مڑنے لگا تھا کہ نگاہ بالکل سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر رکی۔

گیتی کا حسین چہرہ' اس کا پورا وجود' کسی خوب صورت پینٹنگ کی مانند وہاں قید تھا اور اس کے ساتھ خود وہ بھی سادہ سے کپڑے پہنے' سانولی رنگت' عام سے نقوش' عام قد و قامت والا سا سالار احمد گیتی آرا سے بالکل ہی مختلف۔

پچھلے دنوں ہونے والے حادثے کے بعد سے اب تک وہ سنبھلا نہیں تھا' وہ موت کو چھو کر پلٹا تھا' جس کے اثرات چہرے اور وجود پر ابھی بھی باقی تھے۔

دونوں کی شخصیت کے بیچ آیا تضاد پہلے بھی اندر کہیں چبھن پیدا کرتا تھا' مگر آج تو کچھ زیادہ ہی..... مگر وہ کیسے دستبردار ہو سکتا ہے۔



سالار نے بمشکل ہی خود سے نگاہ چرائی۔

"ابھی آتا ہوں!" اس بار وہ اس کا جواب سنے بغیر ہی باہر نکل گیا۔

وہ کچھ حیران سی ہوئی وہیں کھڑی رہ گئی۔

ساتھ آیا کپڑوں کا بیگ وہیں کسی نے صوفے پر لا کر رکھ دیا تھا۔

وہ چپ چاپ صوفے پر آ بیٹھی۔

یہ خاصا بڑا بیڈ روم تھا' قیمتی سامان سے آراستہ مگر تاثر میں سادگی تھی اور اندر آتے ہوئے وہ دیکھ چکی تھی کہ یہ خاصا بڑا اور شان دار گھر تھا' صندل کی کوٹھی سے بھی بڑا اور خوب صورت۔

اس نے ثانی ستارہ کے چوبارے کے علاوہ ایک ہی گھر دیکھا تھا اور اب یہ دوسرا۔

"واقعی ان ہی کا ہے یا پھر.....!" دل میں اٹھتے خیال پر وہ فوراً" ہی شرمندہ ہوئی۔

سالار کے لیے تو کچھ ایسا ویسا گمان بھی رکھنا سخت بے ادبی میں شمار تھا اب۔

ایک شرمیلی سی مسکراہٹ گیتی کے لبوں پر آئی۔

دل پر چھایا اضطراب' اب سکون میں بدل رہا تھا۔ زندگی میں اتنی اچانک آئی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے جو وقفہ چاہیے تھا پورا ہوا۔

اللہ اس پر مہربان ہے' سوا سے وہی عطا ہوا جس کی ہلکی سی امید بھی باقی نہیں رہی تھی اور جس کے قابل وہ تھی بھی نہیں!

ایک ایمان داری بھرا تجزیہ' صرف اور صرف شکر گزاری کا اظہار تھا' سو اب وہ آگے جیسے بھی اور جس حال میں رکھے' حرف شکایت زبان پر کسی صورت نہیں لاتا تھا۔

وہ بڑی مگن سی خود سے عہد باندھ رہی تھی' جب ہی سالار کی واپسی ہوئی۔

"ارے تم نے کپڑے چینج نہیں کیے' پریشانی ہو رہی ہو گی۔"

چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ سادہ سے لہجے میں کہتا ہوا' خود ذرا ہٹ کر بیٹھا۔

"جی۔ بس چاہ ہی رہی تھی۔"

"ہوں..... بارش بند ہو گئی ہے۔"

"جی!"

"آج تو کچھ زیادہ ہی پانی برسا ہے..... ہے نا!"

اس نے تائید چاہی تھی' سو گیتی نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔

"چائے کیسی بنی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"ہوں۔" اس کے پاس سوالوں کا ذخیرہ اتنا ہی مختصر تھا۔ "اور بھلا' یہ خود کوئی بات کیوں نہیں کرتی۔ شاید اپنی جلد بازی پر پچھتا رہی ہو۔"

گیتی نے جھجکی جھجکی سی نگاہ سالار کی طرف اٹھائی۔

"بھلا اپنی نئی نویلی دلہن سے کرنے کے لیے یہ ہی باتیں رہ گئی ہیں' کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی یہ حضرت اتنی جی داری کا مظاہرہ کر چکے ہیں' جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ مگر وہ اکیلا تو نہیں' کہانی کا رخ موڑنے میں اس کا اپنا بھی تو برابر کا ہاتھ تھا۔

قاضی صاحب کے پاس سے اٹھنا' سب کے سامنے اقرار کر لینا' وہ اندر ہی اندر شرم سے کٹی۔

"اب پتا نہیں' یہ مجھے کتنی بے شرم لڑکی سمجھ رہے ہوں گے۔ سوچتے ہوں گے کہ ماحول کا اثر لیا ہے میں نے۔" اندر کا کمپلیکس پرانا تھا۔

"اور کہیں اسی بات پر تو نہیں پچھتا رہی کہ خیام جیسے حسین لڑکے کے بعد مجھ جیسے معمولی شکل کے انسان کے ساتھ بندھ گئی ہے۔"

کمپلیکس یہ بھی پرانا ہی تھا۔

"مگر اب یہ خود ہی تو سب کے سامنے اقرار۔"

"مگر اب یہ خود ہی تو سب کے سامنے اقرار بھی۔۔۔"

دونوں نے ایک ہی احساس سے مورل سپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تم۔"

"آپ۔"

"اچھا تم کہو پہلے۔"

"واہ' میں کیسے کہوں۔ لڑکیاں بولتی ہیں کیا ایسے موقعوں پر۔" اس کی ناراضی اتنی بے ساختہ تھی کہ وہ ہنستا ہی چلا گیا۔

"میری بھی تو پہلی شادی ہے اور وہ بھی اتنی ہنگامی کہ تیاری کا تو موقع ہی نہیں ملا' ورنہ تمہاری تعریف میں کوئی نظم' غزل نہ سہی' کوئی دو' چار شعر ہی یاد کرلیتا۔"

"کیوں' آپ کو تو فیض اور غالب زبانی یاد ہیں۔" وہ معذرت قبول کرنے سے انکاری تھی۔

"اچھا' پتا نہیں اس وقت کیسے بھول گیا۔"

ماتھے کو شہادت کی انگلی سے مسلتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرایا۔

"چھوڑیں' کیا فائدہ جب یاد کرکے سنایا جائے۔"

وہ تھوڑی سی دل شکستہ ہو کر اٹھنے لگی۔

تب ہی سالار نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا تیرے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا میرے ہمراز کا رنگ

سایہ چشم میں حیراں' رخ روشن کا جمال
سرخی لب میں پریشان تیری آواز کا رنگ

وہ اس کے بالکل قریب تھا۔

"کیا اب پوری ہی سنو گی؟"

سالار کے انداز میں بے ساختہ سی بے بسی تھی۔

گیتی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

سالار کی آنکھوں میں محبت کا وہی دل چھوتا احساس جاگ رہا تھا' جو اسے خاموشی سے اسیر کرگیا تھا۔

اس بار وہ ہنسی نہیں'
شرمائی تھی۔

شہر میں آج اچانک ہی ہڑتال ٹھہری۔

سڑکوں پر سے پبلک ٹرانسپورٹ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح غائب ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ تھا بھی گھر سے اور شہر کے دوسرے سرے پر اور ساتھ میں وفاداری سے ساتھ نبھاتی اس کی اپنی بدنصیبی۔

سو میلوں پیدل چل کر گھر پہنچا تھا۔

ساجد باہر ہی کھڑا مل گیا۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ' مارے فکر کے جان نکلی جارہی تھی۔" اس کی محبت سچی اور کھری تھی۔ "پتا ہے آس پاس کا سارا علاقہ چھان کر آرہا ہوں' موبائل بھی نہیں رکھتے اپنے پاس' یہ اور بھی غلط بات ہے۔"

خیام کو دیکھتے ہی وہ بنا رکے بولنا شروع ہوا۔

خیام تھکے تھکے سے انداز میں گھر کے ساتھ بنے چبوترے پر بیٹھا۔ ہمت بالکل ہی جواب دے چکی تھی۔

فوری طور پر تو ساجد کے شکایت نامے کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

اس کے براؤن بالوں پر گرد کی تہ جم رہی تھی اور پرانی سوفٹی میں سے جھانکتے ہوئے اس کے پیر بھی مٹی میں اٹ رہے تھے۔

ساجد کو خود ہی خیال آگیا۔

"آپ اندر چل کر آرام کریں' پھر جلدی کھانا کھا کر سو جائیے گا۔ میں چھت پر بستر لگالیتا ہوں۔"

"بھوک تو بالکل نہیں ہے ساجد' تم کھالو کھانا' میں اوپر ہی چلا جاتا ہوں۔"

"تھوڑا سا آرام کریں تو بھوک بھی لگ جائے گی۔" وہ اسے لیے اندر چلا آیا۔

بتول صحن میں ہی چبوترے پر بیٹھی تھی' چولہے پر کچھ پک رہا تھا' جس میں وہ بڑے اہتمام سے چمچہ چلانے میں مصروف تھی۔

خیام کو آتا دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی اطمینان اترا تھا۔

"شکر ہے' جو ساتھ خیریت کے واپس آگئے تم' میرا تو مارے فکر کے دل پریشان تھا' اوپر سے یہ ساجد اور بھی ہولا رہا تھا۔ کہاں چلے گئے خیام بھائی' کہاں چلے گئے' رٹ لگا رکھی تھی۔"

وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

کوئی وقت تھا جب اس کی آمد و روانگی کے گھنٹے' منٹ کیا سیکنڈ بھی گنے جاتے تھے اور فکر کرنے والوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

مگر اب۔۔۔؟

"غسل خانے میں پانی بھرا ہے بالٹی میں' جا کر نہالو' تب تک میں چائے بناتی ہوں' پھر تھوڑی دیر آرام کرکے کھانا کھالینا۔" بتول کے لہجے میں اتنی محبت ہوتی تھی کہ وہ اسے کبھی کسی بھی بات کے لیے منع نہیں کرپاتا تھا۔ سو اس وقت بھی چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔

اس کا بیگ برآمدے میں رکھی الماری کے اوپر پڑے سامان کے ڈھیر میں ہی پڑا تھا۔

خیام نے ہاتھ بڑھا کر اسی ملے جلے سامان میں سے اپنا بیگ کھینچ کر نکالا تو فوراً ہی ایک عجیب سا احساس ہوا۔

بیگ کی زپ آدھی کھلی تھی۔

بالکل ایسے جیسے کسی نے جلدی میں بند کرنی چاہی اور ہو نہ سکی۔

Chicken
Cubes

# Recipe Card

## رِدا آفتاب کی ڈبل تڑکا دال

اجزاء:

| | |
|---|---|
| ماش کی دال | ½ پاؤ |
| چنے کی دال | ½ پاؤ |
| پیاز | 1 عدد |
| ٹماٹر | 6 عدد |
| نمک | 1 چائے کا چمچہ |
| ہلدی | 1 چائے کا چمچہ |
| لال مرچ | 2 چائے کے چمچے |
| ادرک لہسن کا پیسٹ | 2 چائے کے چمچے |
| تیل | 4 کھانے کے چمچے |
| کنور چکن کیوب | 1 عدد |

تڑکا بنانے کے اجزاء:

| | |
|---|---|
| لہسن کے جوئے | 6 عدد |
| کڑی پتے | 6 عدد |
| ثابت گول مرچ | 6 عدد |
| ہری مرچ | 6 عدد |
| باریک کٹی ادرک | 1 ٹکڑا |
| ہرا دھنیا | ½ گٹھی |
| مکھن | 100 گرام |
| زیرہ | 1 چائے کا چمچہ |

ترکیب:

ایک ½ پاؤ ماش کی دال اور ½ پاؤ چنے کی دال کو ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ اب پتیلی میں 4 کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے 1 عدد پیاز براؤن کریں۔ پھر اس میں 6 عدد ٹماٹر، 1 عدد کنور چکن کیوب، 2 چائے کے چمچے لال مرچ، 1 چائے کا چمچہ نمک، 1 چائے کا چمچہ ہلدی اور 2 چائے کے چمچے ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے مسالہ بھون لیں۔

اب اس میں بھیگی ہوئی دالیں اور تین گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر آدھے گھنٹے پکنے دیں۔ دالیں گلنے کے بعد انہیں اچھی طرح گھوٹیں اور چولہا بند کر دیں۔ اب ایک پین میں 100 گرام مکھن کو گرم کر کے 1 چائے کا چمچہ زیرہ، 6 عدد لہسن کے جوئے، 6 عدد کڑی پتے اور 6 عدد ثابت گول مرچ ڈال کر فرائی کریں اور تیار دال پر تڑکا لگائیں۔

آخر میں اوپر سے ½ گٹھی ہرا دھنیا، 6 عدد ہری مرچ اور 1 ٹکڑا باریک کٹی ادرک ڈال کر سرو کریں۔

(Rida Aftab)

تو کوئی تھا جو اس کے اس واحد سرمائے تک پہنچا تھا۔ خیام کے دل کی دھڑکن یک دم ہی تیز تر ہوئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپی ان دو چوڑیوں کو ڈھونڈتے ہوئے وہ صبح سے اب تک کی جھیلی ہوئی تھکان یکسر بھولا تھا۔

رومال میں گرہ کی صورت باندھی ہوئی، وہ دونوں چوڑیاں کہیں بھی نہیں تھیں۔

خیام نے سارے کپڑے فرش پر ڈھیر کیے، بیگ کو اٹھا کر جھاڑ لیا، مگر بے سود۔

"کیا ہوا خیام بھائی؟"

ساجد دودھ لینے جا رہا تھا، دروازے سے واپس آکر اس کے قریب کھڑا تھا۔

"وہ... وہ۔" خیام کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

چولہے کے پاس بیٹھی بتول نے کچھ حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"کیا ہو گیا، کوئی سانپ، کیڑا گھس گیا کیا کپڑوں میں۔" خیام نے بے بسی سے بتول کی طرف دیکھا۔

"کچھ کھو گیا ہے خیام بھائی؟"

ساجد نے بالکل درست اندازہ لگایا، اور اس بار وہ انکار بھی نہ کر سکا۔

"اس میں سونے کی دو چوڑیاں تھیں ساجد! کسی کی امانت۔" نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے وہ کچھ یاد کر کے کمزور پڑا تھا۔

"کیا سونے کی!" ساجد کی آواز مارے حیرت کے اتنی بلند تھی کہ چبوترے پر بیٹھی بتول بھی اتر کر نیچے کھڑی ہوئی۔

"سچ مچ سونے کی؟"

بتول کے انداز میں دبا دبا سا جوش تھا۔ "ارے دکھا تو دیتا مجھے۔ سچ بھی ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھیں اصلی سونے کی چوڑیاں۔"

دونوں ہاتھوں میں نقلی سونے کی چوڑیاں پہنے بتول کے پاس بڑی فطری سی حسرت تھی۔

ساجد نے جھنجلا کر ماں کی طرف دیکھا۔

"کمال کرتی ہو اماں! خیام بھائی نے کہا نہیں ابھی کہ امانت ہیں کسی کی... پھر کیسے وہ انہیں تمہیں دکھاتے۔"

اس نے خیام کے زرد پڑتے چہرے کو ہمدردی سے دیکھا۔

"فکر مت کریں، میں وہ چوڑیاں کہیں سے بھی واپس لاؤں گا اور اگر نہ لا سکا تو آپ کو ان کی قیمت ادا کروں گا، جن کی تھیں، انہیں دے دیجیے گا۔"

اس چھوٹے سے لڑکے کی خود اعتمادی غضب کی تھی۔

"ویسے آپ کو اتنی قیمتی چیز گھر میں نہیں رکھنا چاہیے تھی یا کم از کم مجھے ہی بتا دیتے، بس کہیں حفاظت سے رکھوا دیتا۔"

"میں خود حفاظت نہیں کر سکا ساجد! ایک ہی تو قیمتی شے تھی میرے پاس، اسے بھی نہیں سنبھال سکا۔"

نیچی آواز میں اس نے ساجد سے کہا تھا یا خود سے۔

ساجد کو تو لگا تھا جیسے وہ اب رونے ہی والا ہے۔

"شاید کچھ زیادہ قیمتی ہوں گی۔" اسے اور بھی افسوس ہونے لگا۔ "خیام بھائی بھی بے چارے سیدھے ہی ہیں۔ کیسے خاموش، سر جھکائے اپنے کام سے کام، سونے کی ویلیو کو اس کے کھونے کے بعد سمجھے ہیں، سونا ہو بھی تو کتنا مہنگا گیا ہے۔" اس نے اپنے طور پر خیام کے دکھ کی گہرائی کو ناپا۔



مگر یہ قصہ اتنا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ خیام کی حالت بہت ردی تھی۔

"مجھے وہ چوڑیاں چاہئیں ساجد! اگر میں وہ واپس نہ کر سکا تو ساری عمر خود کو معاف نہیں کر سکوں گا، سارا سامان ہٹا کر دیکھتے ہیں، الماری کے اوپر ابھی صبح تو میں نے کپڑے نکالے تھے، جب تک تو تھیں اس میں۔" ساجد نے چونک کر بتول کی طرف دیکھا۔

"صبح سے گھر میں کون آیا ہے اماں، تم گھر پر ہی تھیں نا، یا کہیں محلے میں جا کر بیٹھ گئی تھیں۔"

تفتیش بتول سے شروع ہوئی تھی۔

"میں تو گھر پر ہی تھی بیٹا! بس دروازے میں کھڑے ہو کر سبزی لی تھی، اب سعیدہ تو ہے نہیں جس کے پاس جا کر گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر آدمی دل ہلکا کر لے۔" بتول کو اپنی دیرینہ دوست کی یاد بے موقع آئی تھی۔

"خالہ سعیدہ کو چھوڑ، جو پوچھ رہا ہوں میں، اس کا جواب دو۔"

ساجد جھنجلایا، گھر میں اب اس کی حیثیت کمانے والے کی تھی۔

"کہہ تو رہی ہوں کوئی نہیں تھا گھر میں، بس تیرا ابا تھا۔ آج سارا دن بیٹھا ٹی وی دیکھتا رہا، چھتیس بار چائے بنوالی، بالکل ہی فارغ ہو گیا ہے لگتا ہے اب تو کام سے۔" ساجد کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔ "ابا!"

تب ہی صحن کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلا آیا۔

"کیا ہو رہا ہے ادھر، کوئی نیا تماشا لگایا ہے کیا تم لوگوں نے۔" اس کی گرج دار آواز نے ان سب کو مڑنے پر مجبور کیا۔

"کیا ہوا ہے، ہاں اور یہ کیا گند پھیلا رکھا ہے یہاں۔" اس نے خیام کے گرے ہوئے کپڑوں کو حقارت سے دیکھا۔

"خیام بھائی کی سونے کی چوڑیاں کھو گئی ہیں ابا! یہاں اس بیگ میں سے۔" بنا وقت ضائع کیے ساجد نے اسے تازہ اطلاع دی۔

"کیا۔" اس نے چونک کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

"مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا کہ تجھ میں مردوں والی کوئی بات نہیں، کوئی غیرت، کوئی دبدبہ نہیں، اب یہ چوڑیوں کا قصہ۔" اپنی بات کہہ کر وہ پھر سے ہنسنے کی تیاری میں تھا کہ خیام ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"وہ چوڑیاں میرے پاس کسی کی امانت تھیں خالو! اگر آپ کو کچھ پتا ہے ان کے بارے میں تو بتا دیجیے۔" اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تیرا، میں کوئی تیرے سامان کی تلاشی لیتا ہوں جو مجھے خبر ہو گی، اپنی چیز خود سنبھال کر رکھ۔ ہم کوئی تیرے باپ کے نوکر ہیں، گھر میں بھی رکھیں، کھانے کو بھی دیں اور تیرے سامان کی چوکیداری بھی کریں۔ واہ بھئی واہ۔"

ایک ہاتھ سے اس نے خیام کو دھکیلنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا۔

ساجد کسی غیر معمولی صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا تھا، مگر خیام نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"خالو پلیز! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھے جو چاہے کہہ لیں، لیکن وہ چوڑیاں..."

"ارے پاگل ہوا ہے کیا، مجھے چور سمجھ رہا ہے، ایسا ہاتھ دوں گا کہ سب چوڑیاں ووڑیاں بھول جائے گا، دفع ہو یہاں سے، نکل ابھی، کہاں سے آیا ہے پتا نہیں۔"

اس کی زبان اتنی گندی تھی کہ خیام کی نگاہ خود بخود جھکنے لگی مگر ساجد اس کا بیٹا تھا۔

"ایک لفظ مت کہنا ابا! خیام بھائی کا زیور واپس کرو' ابھی لے کر چلو مجھے' اگر کہیں دے کر آگئے ہو' ورنہ سمجھ لینا کہ میں بھی اب کیا کر سکتا ہوں۔"

بتول نے سہم کر جوان ہوتے بیٹے کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا۔

"اگر تو اس بدبخت کی خاطر میرے منہ کو آئے گا تو سمجھ لے اولاد نہیں ہے میری' معلوم نہیں کس کا خون۔"

ساجد کا باپ بے حیائی کی ہر حد کو پار کر رہا تھا۔ بتول کو لگا جیسے وہ زمین میں گڑتی ہی چلی جا رہی ہے' گالی گلوچ' الزامات کچھ بھی نیا نہیں تھا۔

مگر اس لڑکے کے سامنے جو اس کے بیٹے جیسا ہی تھا' اس نے سامنے کھڑے خیام کی طرف دیکھنا چاہا' مگر نگاہ نہیں اٹھ سکی۔

"نہیں دوں گا اب تو' اگر میرے پاس بھی ہیں' تو رکھ اس کمینے کو اپنے گھر میں' میں جا رہا ہوں' یہ ہی باپ ہے تیرا' نکاح پڑھوا دے اپنی ماں کا۔"

مزید ایک سیکنڈ کی بھی دیر کیے خیام اس گھر سے نکلا تھا۔

تیز اور تیز' اور تیز' دائیں بائیں' اس نے اپنے پیچھے ساجد کو پکارتے سنا۔

"خیام بھائی' خیام بھائی!" مگر اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا' وہ بھول چکا تھا کہ آج وہ کتنا زیادہ چل چکا ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت کھو چکا تھا' اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

"خیام بھائی! قسم ہے آپ کو۔"

وہ اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"اس طرح مت جائیں' نہیں جانے دوں گا میں آپ کو۔ وہ تو ہیں اتنے گندے آدمی کہ باپ کہتے ہوئے شرم آتی ہے' مگر کیا کریں مجبوری ہے میری بھی' اماں کی بھی۔"

پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اسے جس بات کے لیے منا رہا تھا' خیام کے لیے قطعی ناقابل قبول ٹھہری تھی۔

"میری بھی مجبوری ہے ساجد' مجھے بھی شرم آ رہی ہے' اتنی کہ ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا ہے۔" اس کی آواز پنچی تھی اور دکھ سے بوجھل۔ "اب ساری زندگی میں خالہ بتول کا سامنا نہیں کر سکتا' کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا انہیں' یہ میرا خود سے عہد ہے۔"

اس کے انداز میں قطعی فیصلے والا گہرا تاثر تھا۔ ساجد گم صم سا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"مگر اس طرح' اس وقت کہاں جائیں گے آپ؟ ابھی تو آپ کے کپڑے بھی وہیں پڑے ہیں اور وہ چوڑیاں....."

چند لمحوں کے وقفے کے بعد وہ خیام کو کنوینس کرنے کی دوسری کوشش میں مصروف ہوا۔

"ارے بھاڑ میں گئے کپڑے اور چوڑیاں۔ ان ہی کی وجہ سے اتنی گری ہوئی بات۔" ذرا رک کر اس نے خود کو کمپوز کیا۔ "اور میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہوں جو اس شہر میں کھو جاؤں گا' بہت بڑی غلطی کی تھی میں نے تمہارے گھر آ کر۔"

"اور اب اس طرح اکیلے شہر میں نکل کر کوئی عقل مندی کر رہے ہیں کیا' حالات دیکھے ہیں شہر کے۔"

"مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو ساجد' جاؤ پلیز واپس جاؤ۔" وہ پھر سے تیز چلنا شروع ہو گیا' لیکن ساجد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مت چلیں میرے ساتھ۔" اچانک ہی ساجد اس کے ساتھ متفق ہوا۔ "مگر میں جہاں لے کر چل رہا ہوں' وہاں ضرور چلیں پلیز۔"

"کیا۔" اسے جیسے شاک سا لگا۔ "تم کیوں سمجھ رہے ہو کہ ہر بار تم مجھ سے کچھ منوا لو گے۔ مجھے کہیں نہیں جانا' سمجھے



تم اور جاؤ خدا کے واسطے' میرا پیچھا چھوڑو تم۔"

"بس صرف ایک بار چلیں' آپ کا دل نہ چاہے تو مت رکیے گا' مگر مل کر دیکھ لیں' صرف ایک بار خیام بھائی' آپ کو میری جان کی قسم۔"

"قسم صرف اللہ کی کھانا جائز ہے اور وہ بھی کوئی ایسی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ سمجھے' بات بات پر قسم نہیں کھائی جاتی۔"

"چلیں' آئندہ نہیں کھاؤں گا' وعدہ' مگر آپ بھی مان لیں نا میری بات' یہاں سے تھوڑا سا ہی فاصلہ ہے۔"

"میں کسی کے بھی گھر میں نہیں رہوں گا' مجھے گھر راس نہیں آئے گا۔"

"وہ گھر نہیں ہے' میرا مطلب ہے کہ گھر جیسا نہیں ہے' وہاں کوئی عورت نہیں ہے۔"

روانی میں وہ شاید سب سے قیمتی پتا شو کر گیا تھا۔ خیام چلتے چلتے رکا۔

"کوئی آفس ہے۔"

"آفس ہی سمجھ لیں' بلکہ صحیح کہہ رہے ہیں' آفس ہی ہے' مگر ذرا چھوٹا اور وہاں کوئی رہتا بھی نہیں ہے' بس دن میں کھلتا ہے۔" ساجد نے جلدی جلدی چھوٹی سی تفصیل دی۔ "بس چلیں ابھی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔"

"شاید کہیں گارڈ یا واچ مین کی نوکری مل سکے۔" اسے کچھ ایسا ہی لگا۔

ساجد امید بھری نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا' ہلکے سے اثبات میں سر ہلا کر وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا' رُوم کیا' ایک بار پھر۔"

"نہیں ساجد! اب کوئی گنجائش نہیں' میں اس زری کو ہی رکھ کر اب تک پچھتا رہا ہوں' اب کوئی دوسری نیکی گلے نہیں باندھوں گا' سوری' دیکھو ہاتھ جوڑ رہا ہوں تمہارے۔" سامنے کھلا رجسٹر بند کر کے اس نے واقعی دونوں ہاتھ باندھے تھے۔

"ان میں اور زری باجی میں بہت فرق ہے معاذ بھائی' یہ بے چارے تو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتے' بالکل اکیلے ہیں' کوئی بھی نہیں ہے ان کا تو۔"

ساجد نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کا ذرا بھی اثر نہیں لیا تھا' سو اپنی ہی کہے گیا۔

"سنو' زری کے معاملے میں بھی میں اسی غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔ تم تھے نا اس کے معاملے میں مجھے ڈالنے والے اور وہ بھی اس وقت اتنی بے چاری اور بے ضرر لگی تھی کہ میں فوری طور پر اسے اپنے گھر لے گیا اور اب بھگت رہا ہوں اچھی طرح' سارا گھر ناراض ہے مجھ سے۔ پتا ہے۔"

"زری باجی ایسی تو نہیں تھیں معاذ بھائی! وہ تو بے چاری سارا دن اپنی بھابھی سے ڈانٹ کھاتی تھیں۔" ساجد نے ایک بار پھر بات کرتے ہوئے پیچھے کھلے دروازے کی طرف دیکھا' جہاں برآمدے میں وہ خیام کو بٹھا کر آیا تھا۔

"لے جاؤ ان بے چاری کو اپنے گھر' مہربانی ہو گی تمہاری۔" پچھلے دنوں پے در پے ایسے واقعات ہوئے تھے کہ وہ خود سوچنے پر مجبور تھا۔

"مگر یہ بے چارے آپ کو پریشان نہیں کریں گے' اور انہیں تو آپ یہاں بھی رکھ سکتے ہیں' زری باجی کا پرابلم ہم بعد میں سلجھا لیں گے مل کر۔"

"سدھر جاؤ ساجد تم..... ورنہ....." معاذ کی بات ادھوری رہ گئی۔

"میرا نام خیام ہے۔" وہ دروازے کی چوکھٹ میں آ کر کھڑا تھا۔

"ہوں، اندر آؤ۔" کچھ تھا جس نے معاذ کو دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔

گرمی کی شدت بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی مسائل بھی، سلمان کا واپس آجانا بذات خود ایک بڑی ٹینشن تھی۔ اس میں اور بھی بڑھاوا اس کا بگڑا ہوا رویہ کر رہا تھا۔ نخرے، آرام طلبی اور ساری خدمتیں لینے کے باوجود جواباً حرف تشکر کے بجائے، محض شکایتیں، شکایتیں اور شکایتیں۔

"زوبیہ کے ساتھ رہ کر وہ مکمل طور پر بگڑ چکا ہے۔"

جویا اور زویا کی مشترکہ رائے تھی اور اس بار آپا گل بھی مکمل طور پر متفق تھیں، وجہ زویا اور جویا کی طرف سے آیا کوئی نرم گوشہ نہیں تھا بلکہ سلمان کے ساتھ تیزی سے بڑھتا ہوا اختلاف رائے تھا۔

ہر بار ان کی آمد پر خود بخود ہی طبل جنگ بج اٹھتا اور شاکرہ بیگم کی ساری کوششوں کے باوجود، ان کے پرانے اور عزیز از جان اتحادیوں میں غضب کا معرکہ چھڑتا۔

اور انجام کار آپا گل "آئندہ قدم نہ رکھنے کی" دھمکی کے ساتھ رخصت ہو جاتیں اور سلمان رات گئے تک موڈ خراب کیے، ہر ایک سے لڑتے جاتا، زویا، جویا چپکے سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں اور شاکرہ بیگم جب تک ہمت ہوتی سنتیں، پھر منہ لپیٹ کر اپنے بستر پر جا لیٹتیں۔

گھر پر عجیب سی نحوست طاری رہتی۔

"میری سب سے بڑی بے وقوفی یہاں آنا ہے، مجھے چاہیے تھا کہ کسی طرح بھی زوبیہ کو منا کر وہیں صلح کر لیتا، یہاں تو میری زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے۔"

صبح جس وقت جویا نے اس کے سامنے چائے پراٹھا رکھا وہ حسب معمول شکوہ کناں تھا۔

اظہار صاحب کی آج چھٹی تھی، سو وہ بھی اپنی تیاری میں مصروف تھے۔ سلمان کی بات پر خاموش نہ رہ سکے۔

"تمہاری اور ہم سب کی سب سے بڑی بے وقوفی اس زوبیہ سے تمہاری شادی اور پھر اس پر پانی کی طرح پیسہ لٹانا تھی، جسے سب آج بھگت رہے ہیں۔" سلمان کے چہرے پر بڑی حقارت آمیز مسکراہٹ اتری۔

"آپ نے اتنا پیسہ دیکھا ہی کب ہے، جو پانی کی طرح بہایا جا سکتا تھا، وہ تو لوگ ہی اور ہوتے ہیں جو دس بیس لاکھ خرچ کر کے تو نگاہ بھی نہیں اٹھا کر دیکھتے، ہمارے ہاں تو ایک شور مچ کر رہ گیا ہے، ابھی تک اس شادی کو یاد کیا جا رہا ہے۔"

کوئی شک نہیں تھا کہ اب وہ گھر والوں کو خود سے بہت نچلے مقام پر دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔

اظہار صاحب جو ابھی ابھی ناشتے کے لیے آکر بیٹھے تھے، انہوں نے ہاتھ میں تھاما پراٹھے کا ٹکڑا، واپس پلیٹ میں رکھا تھا۔

قریب بیٹھی شاکرہ چچی نے حالات میں آئی سنگینی کو فی الفور محسوس کیا تھا۔ "آپ ناشتہ کریں، دیر ہو رہی ہے، کہاں بحث میں الجھ رہے ہیں۔"

مگر انہوں نے سنا ہی نہیں تھا۔ چند لمحے وہ چپ چاپ سلمان کے چہرے پر آئی طنزیہ مسکراہٹ کو دیکھتے رہے۔

"اس شادی کو اس لیے یاد کیا جا رہا ہے کہ اسے میں اور میرا خاندان اب تک بھگت رہا ہے، اس عمر میں، میں کورٹ کچہریوں کے چکر لگا رہا ہوں اور تم بے غیرتوں کی طرح گھر میں پڑے روٹیاں توڑ رہے ہو، بڑی غلطی کی میں نے، جو تمہیں اس گھر میں واپس قدم رکھنے دیا۔"

جوش جذبات میں ان کی آواز اتنی اونچی ہوئی تھی کہ جویا کچن سے گھبرا کر نکلی اور کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔



"کورٹ کے چکر آپ اپنی غلطیوں کی وجہ سے لگا رہے ہیں اور صرف مجھے الزام مت دیجئے، سارے گھر نے عیش کیے ہیں آپ کی بیوی بیٹیاں، کس طرح پیسہ اڑاتی تھیں۔ آپ ان سے کیوں نہیں حساب مانگتے۔ یہ بیٹھی ہیں سب سے بڑی قصوروار اور وہ جو سب کچھ سمیٹ کر لے گئیں۔ جویا کا جہیز تک اٹھوا لیا انہوں نے، ان کا کھاتہ کھولیے۔ میری شادی کو بھول جائیں گے۔" وہ نہ ان کے غصے سے مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی ان کے دبے ہوئے لفظوں سے شرمندہ۔

اور اس کی بات میں اتنی سچائی تو بہرحال تھی کہ شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب دونوں ہی کو ایک دوسرے سے آنکھ ملانا مشکل ہوا۔

"تم سب کے سب خود غرض اور کمینے ہو، برباد کر کے رکھ دیا مجھے، سب کو نکال باہر کروں گا میں اپنے گھر سے، دفع ہو جاؤ۔ شکل نہ دیکھوں کسی کی بھی۔"

"آپ نہیں نکال سکتے، بھول رہے ہیں۔ یہ آپ کا گھر نہیں کرائے کا ہے۔"

وہ بڑے اطمینان سے پراٹھے کے نوالے توڑ رہا تھا، اظہار صاحب نے ایک نظر سامنے لگی گھڑی پر ڈالی۔ وقت تنگ ہو رہا تھا۔

اپنے آگے سے ناشتے کی ٹرے سرکا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جویا نے دیکھا، انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔

"ابو! ناشتہ تو کر لیں!"

گو وہ اس سے کم ہی بات کرتے تھے، مگر وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"کر لیا ناشتہ! جہاں تم جیسی نافرمان اولادیں پل رہی ہوں وہاں نحوست آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی، میری کمائی کی ساری خیر و برکت ختم کرنے کی ذمہ داری تم سب پر ہے، برابر کے شریک ہو سب!"

وہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

"آغاز سلمان کی شادی سے ہوا اور آخری کیل اس لڑکی کے انکار نے ٹھونکی۔ دفع ہو جاتی یہ شادی کر کے تو کچھ سکون کا سانس شاید میں لے پاتا، مگر انہوں نے تو طے کر ٹھانی ہے کہ مجھے برباد کرنا ہے۔"

"اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے گویا ان کی بربادی میں!" سلمان منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

خیر ہوئی جو اظہار صاحب کا سیل فون بج اٹھا سو انہیں وقفہ دے کر باہر صحن میں نکلنا پڑا۔

اور یہاں کمرے میں چند لمحوں کے لیے بوجھل سی خاموشی چھائی۔

"ذہنی مریض ہو چکے ہیں اب یہ، اسی طرح دماغی دورے پڑتے رہے تو کہیں کسی کو یا خود اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچالیں، کسی ماہر نفسیات کو دکھانا چاہیے انہیں اب!" سلمان نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان بھرا تبصرہ جاری کیا۔

جویا کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو آرہے تھے، رگڑ کر صاف کرتے ہوئے مڑنے لگی تھی کہ پیچھے سے امی کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"خیر، بات اتنی بھی غلط نہیں تمہارے ابو کی، اگر جویا کی شادی اعجاز سے ہو گئی ہوتی تو شاید اس طرح کے حالات پیدا نہ ہوتے، ناشکرے پن کی سزا سب نے جھیلی ہے۔"

"ہو سکتا ہے!" سلمان کو کوئی اعتراض نہیں تھا سو اطمینان سے چائے پیے گیا۔

جویا نے اس بار مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

اس کے اور زویا کے مشترکہ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا، زویا کالج گئی ہوئی تھی۔ سو فی الوقت یہ گوشہ تنہائی

بھی غنیمت تھا۔

بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔

کیسی عجیب بات تھی کہ یہاں اس کے علاوہ ہر ایک بالا آخر بری الذمہ ہو جاتا تھا۔

وہ بھی جن کے دامن پر چھینٹ نہیں بلکہ سارا دامن ہی داغ دار تھا' اس کی ایک نافرمانی کے آگے سرخرو تھے۔ اور نافرمانی بھی کیا صرف ایک جائز حق کا استعمال! کسی کسی وقت تو آس پاس پھیلا اندھیرا اور بھی گھٹا ٹوپ ہوتا اور اس میں وہ تن تنہا کھڑی رہ جاتی۔

باہر دن چڑھنے لگا تھا۔

اور وہ سارے کام جو خاموشی سے معمول کے مطابق انجام پاتے رہتے تھے' آج جوں کے توں پڑے دکھائی دینے لگے تو شاکرہ بیگم اور سلمان کو مجبوراً "اسے یاد کرنا پڑا۔

"آج تو صبح سے بس ایک ہی کپ چائے ملی ہے' آپ کی بیٹیوں کو تو کم ہی فرصت ملتی ہے' خود ہی بنا دیجیے۔"

سلمان نے بڑا سا منہ کھول کر جمائی لی۔ "سخت سستی سوار ہو رہی ہے' چائے پیوں تو پھر سوؤں گا' ایک تو صبح ہی صبح ابو نے موڈ آف کر کے رکھ دیا۔"

سامنے کھلے ٹی وی پر نگاہ جماتے ہوئے وہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہوا۔

"اور اب کچھ تو اچھا پکالیں' صبح بھی چائے پراٹھے پر ٹرخا دیا۔"

شاکرہ بیگم کو اٹھنا پڑا۔ "بے چارہ بچہ' ہر ایک ہی کی سنتا ہے' کسی کو بھی اس کی بربادی کا احساس نہیں۔"

سلمان سے ان کے سارے گلے' اس کی واپسی کے بعد مٹ چکے تھے اور زویا اور جویا کے لیے جو تھوڑا سا نرم گوشہ بننے لگا تھا' اب اتنا بھی نرم نہیں رہا تھا۔

کچن میں سارا کام جوں کا توں تھا۔ سلمان کی فرمائشی چائے' ناشتے کے برتن' دوپہر کے کھانے کی تیاری' گھر کی صفائی انہیں ایک ساتھ کتنی ہی فکروں نے گھیرا۔

"جویا! اے جویا!" بجائے کسی ایک کام کو بھی ہاتھ لگانے کے انہوں نے جویا کو پکارنا بہتر سمجھا۔

آج اس کا دروازہ فوری طور پر نہیں کھلا تھا۔

"جویا! جویا!" اس بار انہوں نے ساتھ ہی زور سے دستک بھی دی تھی۔ اسے چند منٹ شاید خود کو سنبھالنے میں لگے تھے۔

"سو گئی تھیں کیا؟ اور یہ کوئی وقت ہے کمرے میں بیٹھنے کا' بھائی کب سے چائے کے لیے تڑپ رہا ہے' رل گیا غریب یہاں آکر۔ ذرا تو خیال کر لیا کرو۔"

جویا کی سرخ ہوتی آنکھوں پر ذرا بھی دھیان دیے بغیر وہ خفا ہوئے گئیں۔

سلمان اور آپا گل' دونوں ہی کی محبت ان سے ناانصافی کرواتی تھی اور وہ اس کی عادی بھی تھی۔

مگر آج دل کچھ اور ہی انداز میں دکھا تھا۔

وہ بنا کچھ کہے کمرے سے نکل کر کچن میں چلی آئی تو شاکرہ بیگم اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

"برتن بعد میں دھونا' پہلے سلمان کو چائے بنا دو' اور ہاں..... تمہاری ٹیوشن کے کچھ پیسے ملے کل؟"

"جی' دو ہزار ملے تھے' بیگ میں پڑے ہیں۔"

"یہ بہت اچھا ہوا' میں سوچ ہی رہی تھی کہ کچھ مرغی' گوشت' چاول منگوا لوں..... بریانی پکا لینا' بہت دن ہو گئے کوئی اچھی چیز پکے ہوئے۔"

وہ کہتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف چلی گئیں اور چند لمحوں بعد واپس نکلتی ہوئی نظر آئیں۔



جویا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر چائے کا پانی چولہے پر رکھا' ڈبہ میں چائے کی پتی بھی قریب الختم تھی۔

سلمان جس طرح دن بھر میں دس بارہ کپ پینے کا عادی تھا' وہ چائے' چینی' دودھ کے خرچ کا گراف' ہر وقت بلند رکھتا تھا' زویا گھر میں کئی بار اس بات کو لے کر خاصا جھگڑ چکی تھی' مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں۔

"گڈو' گڈو!"

شاکرہ بیگم کی آواز کچن میں سنائی دے رہی تھی' وہ نیچے مالک مکان کے بیٹے کو پکار رہی تھیں' جو بازار سے سامان لا کر دے سکتا تھا۔

چائے کا پانی پکتے پکتے اس نے دو چار برتن دھو ہی لیے اور جب چائے لے کر اندر کمرے میں آئی تو شاکرہ بیگم اور سلمان دونوں ہی خوشگوار موڈ میں تھے۔

"نیچے والوں کا لڑکا ابھی لا کر دے جائے گا سامان' بس پھر فوراً" ہی پکا لینا۔ اچھا ہوا جو تمہارے پاس پیسے نکل آئے' میں نے کچھ اور سامان بھی منگا لیا ہے روز روز تو کسی سے کہنا بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"کوئی کولڈ ڈرنک ضرور منگوا لیا کریں' بڑی طلب ہوتی ہے اس موسم میں۔"

"منگوالی ہے میں نے' بے فکر رہو۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"واہ! دل خوش کر دیا آپ نے' اب ذرا اچھی سی پکانا بریانی' نہیں سارا کباڑا ہی کر دو۔"

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سلمان نے ایک ہدایت ضروری سمجھی' تب ہی سیڑھیوں پر بڑی مانوس سی ہلچل ہوئی۔

جویا نے اندر ہی اندر ایک گہری سانس لی۔

"جو نہ ہو کم ہے!"

"لیجیے آ گئیں وہ بھی' بریانی کی خوشبو سونگھتی۔"

سلمان نے طنزیہ نگاہوں سے شاکرہ امی کو دیکھا تو وہ بڑے لاڈ سے۔ "اوں نہہ۔" کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

آپا گل کے پیچھے ہی پڑوس کا لڑکا تھا۔

"یہ لیں' جویا باجی! خالہ نے منگوایا تھا!"

اس نے دو شاپر جویا کو پکڑائے اور یہ باقی پیسے۔ ایک سو پینتیس روپے۔" باقی حساب اس پرچے پر لکھا ہے۔"

آپا گل ساتھ ہی چلتی ہوئی صحن میں آئی تھیں۔

"آج تو بہت اہتمام ہو رہا ہے! اکبر کو بھی فون کر دینا۔ یہیں کھانا کھا لیں گے' کتنے دن سے آپ لوگوں نے انہیں کھانے پر نہیں بلایا ہے!"

جویا کو ہدایت اور شاکرہ بیگم سے شکوہ کرتی ہوئی وہ اندر چلی گئیں۔

صحن میں اتری تیز دھوپ میں وہ اکیلی کھڑی تھی۔ مٹھی میں دبے ایک سو پینتیس روپے اور سامان کے شاپر۔ اندر سے ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔

پتہ نہیں خیر سگالی کا مظاہرہ ہو رہا تھا یا محبت کا' اس کا سننے کو بھی دل نہیں چاہا۔

بے حسی اور خود غرضی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور انسان اپنی فطرت سے کب ہٹا ہے؟ شاکرہ بیگم نے محض آج کی دعوت کا اہتمام نہیں کیا تھا' اس کے علاوہ بھی گوشت' قیمہ وغیرہ منگا لیا تھا۔

سلمان کے حلق سے دال اور سبزی کا اترنا مشکل ہوتا تھا' سو اگلے چند دنوں کے لیے یہ پیشگی انتظام تھا۔

وہ جب تک فارغ ہوئی' ان میں کسی نے بھی آکر نہیں جھانکا تھا اور جب وہ کچن سے نکل رہی تھی' تب زویا کی کالج سے واپسی ہوئی۔

"تم اب تک اپنے ٹیوشن سینٹر جانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔" اسے دیکھ کر وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔
پچھلے دو ماہ سے اس نے پچھلی گلی میں واقع ٹیوشن سینٹر میں پڑھانا شروع کر رکھا تھا' اونزویا کی دوست کی بڑی بہن تھیں' تین سے چھ تک کی کلاسز تھیں فی الحال اور پانچ ہزار تنخواہ۔
شاکرہ بیگم کو اچھا تو نہیں لگا تھا' مگر مصلحتاً خاموش تھیں۔
"اور یہ کیا شاہی دستر خوان لگنے والا ہے۔ جو تم اب تک کچن میں کھڑی ہو۔" اس نے ڈھکن ہٹا کر باری باری ساری چیزیں چیک کر لیں اور ناراضی سے جویا کی طرف دیکھا۔
"بس جا رہی ہوں' تم کپڑے وغیرہ چینج کر کے ذرا کھانا لگا دینا۔" اس نے نرمی سے محض اتنا ہی کہا مگر وہ حسب عادت غصہ میں آچکی تھی۔
"وہ جو اندر بیٹھے ہیں سب' اتنی تکلیف تو دے ہی سکتے ہیں نا خود کو کہ کھانا نکال لیں' تو نکال لیں گے' تم فکر مت کرو۔" وہ کہتے ہوئے کمرے کی طرف چلی گئی۔
جویا کو مجبوراً "تیار ہونے کے لیے جانا پڑا' محض آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا' اس کی کلاس میں۔
"میں جا رہی ہوں امی! مجھے بہت دیر ہو گئی ہے!" بھاگتے دوڑتے بیگ سنبھالتے' اس نے دروازے پر رک کر شاکرہ بیگم کو اطلاع دی تو ان سب نے ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کیا مطلب' کھانا کون لگائے گا یہاں!"
"مجھے بہت دیر ہو رہی ہے سلمان بھائی! اور سب کچھ تیار ہے کوئی بھی نکال لے گا' دو منٹ کا کام ہے۔"
"یہ لیں اور مصیبت' اس سے تو انسان اپنے گھر سے ہی کھا کر آجاتا' اب تو آپ کے ہاں آکر سکون کا سانس بھی نہیں نصیب ہوتا ہے' کھانا پینا تو دور کی بات!"
آپا گل کا موڈ ایک دم ہی خراب ہونے لگا تھا۔
"سب کچھ تیار ہے آپا گل! میری کلاس نہ ہوتی تو میں......"
"ارے تو کس نے کہا ہے کہ خواری کے لیے گھر سے نکل جاؤ' دو چار ہزار کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک وقت کے کھانے پر نکل جاتے ہیں اتنے پیسے تو' صاف بات ہے امی! میں تو لڑکیوں کی نوکری کے حق میں ہی نہیں ہوں' صرف سیر سپاٹے کی نیت سے نکلتی ہیں' کام وام کا تو بس بہانا ہے۔"
ان کا بیان اور لہجہ دونوں ہی بدنیتی پر مشتمل تھا' جویا کو بہت دن بعد بڑے زور کا غصہ آیا تھا مگر......
"میں جا رہی ہوں امی!"
آپا گل کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے وہ شاکرہ بیگم سے مخاطب ہوئی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔
"دیکھا' دیکھا آپ نے' ذرا بھی عزت ہے میری اس کی نظر میں!" آپا گل کی غصے میں ڈوبی آواز اس کے پیچھے آئی تھی "سارا غصہ اسی منحوس معاذ کے لیے ہے' میں نے ہی تو سب سے زیادہ مخالفت کی تھی جب ہی سے دشمن سمجھنے لگی ہے' بات بات میں ذلیل کرتی ہے اور......!"
جویا کے قدم ایک لمحے کے لیے تھمے اور پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔
باہر گلی دھوپ سے بھری تھی۔
اس نے آہستگی سے انگلیاں اپنی آنکھوں پر پھیریں' آنکھوں میں اتری نمی انگلیوں پر آئی تھی۔
"پیچھے وہاں کمرے میں آپا گل ابھی بھی جو منہ میں آیا' کہہ رہی ہوں گی۔" اس نے سامنے راستے پر نگاہ جمائے ہوئے سوچا۔
"کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اسے قتل کر چکی ہیں اور پھر بھی الٹا واویلا ہی کرتی ہیں!" دھوپ بھری گلی کو پار کرتے



ہوئے وہ سوچ گئی۔

معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی' تب ہی قریب میں ایک مانوس سی آہٹ ہوئی' سامنے زری کھڑی تھی۔
شوخ سے رنگ کا سوٹ پہنے' آنکھوں میں کاجل اور بھی شاید میک اپ......
وہ میک اپ کی تفصیلات سے اتنا زیادہ آگاہ نہیں تھا' لیکن ایک ہی نظر میں وہ اسے بہت تیار تیار سی ضرور لگی تھی۔
"کیا ہے؟" معاذ نے اب اپنا رویہ اس کے ساتھ خاصا ریزرو کر لیا تھا۔ امی کو زری سے زیادہ اب اس سے شکایت تھی' سو اس لیے ضروری تھا۔
"کچھ نہیں' بس آپ اکیلے بیٹھے تھے' مجھے اچھا نہیں لگا۔" وہ بے تکلفی سے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔
"اوپر بیٹھ جاؤ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا۔
"جی اچھا۔" وہ خوش ہو کر فوراً" ہی اس کے بالکل قریب والی کرسی پر بیٹھی' معاذ نے جھجک کر اپنی کرسی ذرا پیچھے کی۔
"چائے بنا کر لاؤں آپ کے لیے؟"
"نہیں' تمہیں کچھ کام تھا مجھ سے؟" وہ اسے جلد سے جلد یہاں سے چلتا کرنا چاہ رہا تھا' کم از کم امی کے آنے سے پہلے۔
"نہیں۔ میں تو آپ کو تسلی دینے کے لیے آئی تھی' بہت ہی صدمہ لیا ہے آپ نے' مجھے لگتا ہے۔" وہ ذرا اس کی طرف جھک کر بیٹھی تو معاذ کو پتا چلا کہ وہ دادی کا مخصوص عطر بھی لگائے ہوئے ہے۔
"سیدھی طرح بیٹھو زری! اور مجھے کوئی صدمہ وومہ نہیں ہے' کس نے کہا ہے تم سے؟"
اس لڑکی کے انداز اب ہوشیار رہنے پر مجبور کرتے تھے' سو وہ محتاط تھا۔
"سب ہی کو افسوس ہو رہا ہے' خاص طور پر آپ کی امی کو تو بڑا ہی صدمہ ہوا ہے' ان کے خیال میں آپ کے رشتے کو انکار کر کے ان لوگوں نے آپ کی بڑی ہی بے عزتی کر دی ہے۔ آپ کو بھی برا تو لگا ہی ہو گا نا۔"

ایک ایک لفظ کو چبا کر ادا کرتے ہوئے وہ کیا جتانا چاہ رہی تھی۔
معاذ نے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" وہ کچھ شرما گئی۔
"کچھ نہیں اور تم یہاں کہاں بیٹھ گئی ہو‘ جاؤ دادی کے کمرے میں جا کر دیکھو‘ کہیں انہیں کوئی کام ہو۔"
وہ تھوڑا سا جھنجلا ہی گیا۔
یہ لڑکی حد سے بڑھ رہی تھی‘ اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔
"میں سارے کام کر چکی ہوں اور دادی تو ویسے بھی اب اپنا وظیفہ پڑھ رہی ہیں‘ ربیعہ کالج گئی ہے اور آپ آج کتنے دن بعد گھر پر ہیں‘ آفس نہیں گئے۔"
"غلطی ہو گئی‘ جا رہا ہوں۔" وہ چڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ اس طرح کھلکھلا کر ہنسی جیسے دونوں کے بیچ بہت ہی بے تکلفی کا رشتہ ہو۔
"آپ تو ناراض ہو گئے‘ ویسے ناراض ہو کر آپ....."
"زری!" معاذ نے بہت سنجیدگی سے اس کی بات کاٹی۔
"خود کو سنبھالو‘ مجھے نہیں پتا کہ میں نے تمہیں یہاں رکھ کر اچھا کیا ہے یا غلط‘ لیکن اس وقت جب میں تمہیں لایا تھا‘ اس وقت میں نے صرف خدا خوفی میں تمہیں سہارا دیا تھا‘ وہ سب تمہیں دارالامان بھیج رہے تھے‘ جو میرے دل نے گوارا نہیں کیا‘ مگر اب مجھے لگتا ہے کہ میں نے کوئی بڑی غلطی کر لی ہے۔"
وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ زری سے فوری طور پر تو کچھ بھی جواب نہیں بن پڑا۔
"ہو سکے تو امی اور دادی کو شکایت کا موقع نہ دو‘ ورنہ میرے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے..... اور تمہارے لیے بھی۔"
"مگر میں نے تو....." وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی‘ مگر معاذ باہر کی طرف کھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
"معاذ جی!" اس نے اگلے احاطے کی سیڑھیوں پر اسے رکنے پر مجبور کیا۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں‘ ان لوگوں سے میں نے کچھ نہیں کہا تھا‘ انہوں نے جھوٹا میرا نام لگایا ہے جی‘ مجھے کیا پڑی تھی ان سے الٹی سیدھی بات کرنے کی۔"
اس کی گھبراہٹ‘ خود اس کے خلاف گواہی دے رہی تھی‘ معاذ نے بمشکل خود کو کمپوز کیا۔
"میرا کوئی انٹرسٹ نہیں تھا وہاں شادی میں‘ بلکہ میں فی الحال شادی کرنا ہی نہیں چاہتا‘ لیکن کسی بھی شریف گھرانے کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے‘ یہ بھی میری برداشت سے باہر ہے‘ دھیان رکھنا۔"
اس نے بغیر زری کی طرف مڑ کر دیکھے اپنی بات پوری کی اور اپنی اس چھوٹی سی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جواب اس کے استعمال میں تھی‘ زری وہیں کھڑی تھی۔
معاذ کے لہجے کی سرد مہری اور اس سے بھی بڑھ کر یہ اطلاع کہ وہ اتنا بھی بے خبر اور بے ضرر نہیں ہے۔
گاڑی گیٹ سے نکل کر گلی اور پھر سڑک پر آ رہی تھی‘ اس کا رخ اپنے چھوٹے سے اسکول کی طرف تھا‘ جہاں ایک اور نیکی اس کی منتظر تھی۔
"کہیں ایک بار پھر وہ کوئی حماقت بھری ہمدردی کے لیے تیار ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عمرانہ مقصود

اگست کا مہینہ کیا آیا کہ جشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ پاکستان کے گلی کوچوں میں ہرے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ گاڑیوں پر‘ ٹرکوں پر‘ بچوں کے ہاتھوں میں‘ چھوٹے بڑے گھروں پر ان ہی جھنڈوں کا راج تھا۔ سڑکوں پر شور تھا ملی نغموں کا۔ آج بھی 14 اگست کو لوگ سب کچھ بھول کر صرف پاکستانی ہو جاتے ہیں اور پاکستان کے جھنڈے سے پیار کرنے لگتے ہیں۔
خدیجہ نے راستے میں جگہ جگہ لوگوں کو جھنڈیاں خریدتے دیکھا۔ بچے خاص طور پر والدین سے ضد کر کے جھنڈے خرید رہے تھے۔ رکشا اور گاڑیوں پر جھنڈے لہرا رہے تھے۔ کھوئی کھوئی سی‘ نازک سی خدیجہ نے فلموں میں جگہ بنتے ہی اپنا نام کرن رکھ لیا تھا۔ کرن نام ایسا مبارک ثابت ہوا کہ وہ خود بھی بھول گئی کہ اس کا اصلی نام کیا تھا۔
گھر میں آنے کے بعد دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے وہ اپنے آپ کو سگریٹ کے دھوئیں میں گم کر دینا چاہتی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ جیسے ہی کرن نے سگریٹ اور لائٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا‘ ملازمین میں کھلبلی مچ جاتی تھی‘ کیونکہ اگر پہلے ہی سگریٹ کے ساتھ بلیک کافی میز پر نہ آ جائے تو میڈم کا پارہ چڑھ سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ ہی‘ پاس کھڑے سیکریٹری نے کچن کے انچارج کو اشارہ کیا اور کافی کا مگ حاضر ہو گیا۔ خدیجہ نے کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بے دھیانی میں ہاتھ ٹی وی کے ریموٹ کی طرف گیا۔ ایک چینل دبا دیا۔ خبریں آ رہی تھیں۔
"ہندوستان نے جشن آزادی کے موقع پر قیدیوں کا تبادلہ کیا تھا‘ اس کے تحت آج اٹھارہ پاکستانیوں کو رہا کر کے واہگہ بارڈر پر پہنچا دیا۔"
کیمرہ واہگہ بارڈر پر چلا گیا۔ کرن کو دھوئیں میں

ٹی وی کی تصویر گڈمڈ ہی نظر آرہی تھی۔
اس نے چینل بدلنے کے لیے ریموٹ اٹھایا۔ اسی وقت واہگہ بارڈر پر بہت سے لوگوں کے درمیان ایک چہرہ نظر آیا۔ چہرہ داڑھی کے بالوں سے بھرا ہوا تھا' پھر بھی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ یہ بابا ہیں۔ کرن سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے منہ سے نکلا "بابا" دھواں کم ہو گیا۔ چہرے صاف نظر آنے لگے۔ بارڈر پر استقبال کرنے والوں نے سب کے گلے میں ہار ڈالے۔
بابا کا چہرہ پہچاننا آسان تھا۔ آس پاس کھڑے خدمت گاروں نے کرن کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھے اور ڈر کر تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ گئے۔ کافی کا مگ ویسے ہی پڑا رہا۔ سگریٹ کا ڈبہ بھرا رکھا رہ گیا۔ کرن کا جسم اسی کرسی پر تھا' لیکن اس کی روح کہیں اور تھی۔

☼ ☼ ☼

کریم آباد کا دو کمروں کا چھوٹا سا گھر۔ بابا صدیق ٹیکسی چلاتے۔ ماں گھر میں محلے والوں کی سلائی کر کے بچیوں کو اسکول میں پڑھاتی تھی۔ چھوٹی بچی فریدہ پڑھائی میں ٹھیک تھی' مگر بڑی بچی خدیجہ کا دل پڑھائی میں لگتا ہی نہیں تھا۔ ان پڑھ ماں باپ ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ خدیجہ گھر کے کاموں' پڑھائی اور ڈانٹ سے بچ کر کسی کونے میں چھپ کر ڈانس کرتی۔ چہرے پر رنگ لگاتی جیسے میک اپ کر رہی ہو۔ اداؤں سے قدم اٹھاتی ہوئی چلتی۔ جو کچھ وہ ٹی وی پر دیکھتی تھی' اپنے انداز سے دہراتی رہتی۔ ایسے میں فریدہ ماں سے شکایت کر دیتی اور خدیجہ کو خوب ڈانٹ پڑتی۔
رات کو تھکا ہارا بابا آتا تو ماں شکایتوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتی۔
"سمجھالو اپنی لاڈلی کو' سارا وقت فلمی انداز دکھاتی ہے۔ ہم غریبوں کے گھر میں یہ کہاں پیدا ہو گئی ہے۔"
تھکا ہارا صدیق سر جھکائے روٹی کھاتا رہتا اور اس کے بعد چارپائی پر گرتا تو اپنا ہوش بھی نہ رہتا۔
ایک رات بابا واپس نہیں آیا۔ رات جاگ کر کاٹی پھر کئی دن اور کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ کوئی خیر خبر نہ ملی۔ انتظار دم توڑ گیا۔ انتظار کی بجائے مغفرت کی دعا مانگی جانے لگی۔ مہینے گزرے' پھر سال گزرتے چلے گئے۔ فریدہ گھرداری میں ماہر تھی اور خدیجہ ہمیشہ کی طرح اپنے آپ میں گم تھی۔ محلے والے' رشتہ دار باتیں بناتے تھے بھلا ایک ماں باپ کی دو اولادیں اور ایک دوسرے سے اتنی مختلف؟ چھوٹی بہن کے رشتے آنے لگے اور شادی بھی ہو گئی۔
خدیجہ دو بار میٹرک میں فیل ہوئی تو ماں نے گھر بٹھا لیا۔ اب اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔ سارا دن آنکھیں پھوڑتی تھی تو دو چار کپڑے مکمل کر پاتی تھی اور خدیجہ آئینہ پکڑے کبھی ٹھمکے لگاتی' کبھی گانے گاتی۔ خدیجہ کا رشتہ تو کوئی نہ آیا' ایک پڑوسن کا لڑکا شہریار اور اس کا دوست ضرور آیا۔ ماں کپڑے پہنچانے گئی تھی۔ شہریار نے دروازے کی کنڈی کھڑکائی' خدیجہ بھاگی ہوئی گئی۔ شہریار دروازے پر کھڑا تھا۔
شہریار نے بہروز کے مختصر سے تعارف کے بعد بات چیت کی ڈوری بہروز کے حوالے کر دی۔ بہروز نے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں نئی نئی نوکری شروع کی تھی۔ جوئیں مارنے کی دوائی کے لیے ایک چہرے کی ضرورت تھی۔ خدیجہ کے لیے ٹی وی' فلم کا نام ہی کافی تھا۔ مزید کچھ سمجھنے یا جاننے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور ہاں کہہ دی۔ بہروز نے اسٹوڈیو کا پتا بتایا' آنے کا وقت بتایا اور دونوں لڑکے چلے گئے۔ قسمت نے اچانک خود دستک دی تھی۔ خدیجہ کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ آفر خود چل کر اس کے دروازے پر آئی ہے۔
اگلی صبح ماں سے جھوٹ سچ بول کر خدیجہ نکل گئی۔ دو بسیں بدل کر خدیجہ ماڈرن اسٹوڈیو پہنچی۔ بہروز باہر لان میں ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ خدیجہ کو تیزی سے دفتر کے اندر لے گیا۔ افتخار صاحب سے تعارف کروایا۔ خدیجہ کے لیے کپڑے' میک اپ سب موجود تھے۔



خدیجہ ایک چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح ہر حکم مانتی گئی۔ سب ہی بہروز کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دو ڈھائی جملے بولتے بولتے شام ہو گئی۔ کسی نہ کسی طرح شاٹ اوکے ہوا۔ اس عرصہ میں نہ جانے کتنے لوگ اندر آئے۔ خدیجہ کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور چلے گئے۔ خدیجہ کی نظر ایک بار میڈم نسیم آرا پر بھی پڑی۔ وہ اسٹوڈیو میں آئی تھیں۔ افتخار صاحب کے پاس کھڑے ہو کر کچھ باتیں کیں اور چلی گئیں۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ خدیجہ کو ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔
بہروز نے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑا دیا۔ خدیجہ نے کھولا تو ڈھائی ہزار روپے تھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ کہاں ماں ایک مہینے میں ڈھائی ہزار نہیں کما سکتی تھی اور میں نے ایک دن میں؟
گھر پہنچی تو ماں پریشان بیٹھی تھی۔ خدیجہ نے ساری کہانی اسے سنا دی۔ کل تین ہزار ملیں گے' یہ بھی بتا دیا۔
سو سو کے پچیس نوٹوں کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ اگلا دن سو سو کے تیس نوٹوں کا تھا۔
وقت کے ساتھ تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ بہروز نے تقریباً" خدیجہ کی نوکری کر لی۔ ٹیکسی میں اس کو لینے آتا اور چھوڑنے آتا۔ خدیجہ کا چہرہ اب پہچانا جانے لگا تھا۔ راہ چلتا آدمی اس کو مڑ کر ضرور دیکھتا تھا۔ محلے کی عورتیں جو پہلے باتیں بناتی تھیں' اب رشتہ داروں کو بتاتی تھیں کہ فلاں اشتہار والی لڑکی ہماری پڑوسن کی بیٹی ہے۔ گھر میں نیا ٹی وی' فریج' قالین' بہت سی تبدیلیاں آگئیں اور پھر ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ بہروز خدیجہ کے قریب آگیا۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ خدیجہ کے ساتھ رہتا۔ سارا حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں تھا۔ خدیجہ پوری طرح بہروز کے سحر میں گرفتار تھی۔ وہ تو چاہتی تھی' بہروز سے شادی کر لے' لیکن بہروز نے سمجھایا' ماڈل اور ایکٹریس اگر جلدی شادی کر لے تو مارکیٹ خراب ہو جاتی ہے۔ بہروز نے کوشش کر کے ایک فلم میں خدیجہ کے لیے کام حاصل کر لیا۔ چھوٹا سا رول تھا' لیکن فلم کا ہیرو وحید مراد تھے۔ خدیجہ تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔
وحید مراد کے خواب وہ سوتے جاگتے دیکھتی تھی۔ اب وحید مراد کے ساتھ کام کرے گی۔
پروڈیوسر نے اسے بلوایا۔ کپڑوں کے ناپ لیے گئے۔ میک اپ کے ٹرائل ہوئے اور انگریزی اردو کی ٹریننگ ہوئی۔
بہروز نے اسے مشورہ دیا کہ اب وہ فلم میں کام کرے گی' بڑے بڑے پروڈیوسر اس محلے میں کیسے آئیں گے' اس لیے کسی اچھی جگہ فلیٹ لے لینا چاہیے۔ ماں اپنا محلہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی' لیکن خدیجہ کہاں سننے والی تھی۔ بہروز نے کلفٹن میں فلیٹ کرائے پر لیا۔ فلیٹ کو سجایا سنوارا۔ ماں بیمار رہنے لگی تھی۔ خدیجہ کو اب اس کا بوجھ ناگوار تھا۔ اس نے فریدہ کو فون کر کے کہا' ماں کو اپنے ساتھ لے جائے' اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ فریدہ آکر ماں کو لے گئی۔
شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ جس دن وحید مراد کو آنا تھا' خدیجہ کی دھڑکنیں بے قابو تھیں۔ وہ صبح سے تیار ہو کر منتظر بیٹھی تھی۔ صبح گیارہ بجے سے کیمرے تیار تھے۔ وحید مراد دو بجے پہنچے۔ اس نے خود آگے بڑھ کر وحید مراد سے اپنا تعارف کرایا۔ وحید مراد نے توجہ نہیں دی' لیکن پہلے سین کے بعد انہیں بھی احساس ہوا کہ یہ نیا چہرہ صرف چہرہ نہیں' اداکارہ ہے۔ شوٹنگ ختم ہوئی تو انہوں نے اس سے کہا۔
"آپ اپنا نام بدل لیجیے۔" یہ بات جنگل کی آگ کی طرح اسٹوڈیو میں گشت کر گئی اور اس رات خدیجہ کا نام "کرن" طے کر دیا گیا۔ کرن گھر پہنچی تو ایک خبر اس کی منتظر تھی۔ فریدہ نے فون کیا تھا کہ ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔
کرن پہلی بار فریدہ کے گھر گئی۔ سب لوگ مرنے والے کا غم بھول کر اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

خدیجہ کو ماں کے غم سے زیادہ یہ فکر تھی کہ کہیں وہ لیٹ نہ ہو جائے۔ ماڈرن اسٹوڈیو میں سیٹ لگا ہے۔ اسے وحید جی سے پہلے پہنچنا چاہیے۔ وہ بمشکل آدھے گھنٹے بیٹھی پھر اٹھ کر آ گئی۔

بہروز نے کلفٹن کا فلیٹ خرید لیا۔ کس وقت خریدا؟ کس کے دستخط سے خریدا؟ کچھ پتا نہیں تھا۔ بینک میں رقم کب آتی ہے؟ کب نکالی جاتی ہے؟ چیک کون بھرتا ہے؟ یہ بھی پتا نہیں تھا۔ اتنے بڑے بڑے کام والے بھلا اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیسے دھیان دیں۔ بہروز ہر چیز پر قابض تھا۔ فلمیں تھیں کہ ایک کے بعد ایک چلی آتی تھیں۔ ہر فلمی پوسٹر پر کرن کی تصویر تھی اور اگر نہیں ہوتی تو لوگ فلم دیکھنے جانے سے پہلے سوچتے تھے۔

بابا کو ٹی وی میں دیکھ کر اس کو ماضی یاد آ گیا تھا۔

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ فریدہ کو فون کر دے مگر فریدہ کا فون خود ہی آ گیا۔ سب ناراضی بھول کر بہت جوش اور جذبے سے تقریباً "چیخ رہی تھی۔

"خدیجہ! تم نے بابا کو دیکھا؟"

کچھ سیکنڈ سوچ کر وہ رکھائی سے بولی۔

"مرے ہوئے لوگ نظر نہیں آتے ہیں۔"

فریدہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی لیکن خدیجہ نے مزید کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا۔

دھڑا دھڑ فلمیں بن رہی تھیں۔ مقابلے کا زمانہ تھا۔ کرن چوٹی پر پہنچی ہوئی تھی۔ آگے جانے کا راستہ بند تھا۔ واپس اترنا پڑا۔ واپسی چڑھنے سے زیادہ تیز تھی۔ نوجوان لڑکیاں اپنی جگہ بنا چکی تھیں۔ پرانی ایکٹریس اپنا پیسہ بزنس میں لگا رہی تھیں۔ آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ اس کے ہاتھ تو پہلے دن کی طرح خالی ہیں۔ بہروز بھی بدلتا جا رہا تھا۔ کرن جب بھی روپیہ پیسہ کا ذکر کرتی، بہروز چلانا شروع کر دیتا۔ بڑی گاڑی بک گئی۔ وہ فلیٹ بیچ کر کسی سستے علاقے میں فلیٹ لینا چاہتی تھی۔ پتا چلا فلیٹ پر بہت قرضہ ہے اور اس کے نام بھی نہیں ہے۔ ہر کاغذ پر بہروز کے علاوہ کرن کے دستخط تھے، پھر بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ بینک اکاؤنٹ کا پتا کیا، وہ بھی خالی تھا۔ کیونکہ اکاؤنٹ پر دستخط بہروز کے بھی تھے۔ واپسی کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی۔ خدیجہ نے آنکھیں بند کر کے بہروز پر اعتماد کیا تھا۔

ہر خبر پر سرپیٹ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اونے پونے کلفٹن کا فلیٹ بکا اور بہروز کے کہنے کے مطابق قرضہ ادا ہو گیا۔ کرن ایک سستے علاقے میں کرایہ پر مکان یا فلیٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ بہروز اس وقت بھی ساتھ تھا، لیکن ملازم یا سیکریٹری نہیں، بلکہ حاکم بنا ہوا تھا۔ کسی نے ایک اجڑی ہوئی ایکٹریس کو گھر دینے کی جرأت نہیں کی۔

وہ بھی 14 اگست تھی، جب سگریٹ کے دھوئیں میں کرن اپنی پہچان کھو بیٹھی تھی اور آج بھی 14 اگست تھی، جب کرن اندھیرے میں اپنی پہچان ڈھونڈ رہی تھی۔

بہروز کو بغیر بتائے کرن نے ٹیکسی پکڑی اور سڑکوں پر نکل گئی۔ شہر سجا ہوا تھا۔ قومی نغموں کا شور اور ہرے جھنڈے ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ ٹیکسی والا بار بار پتا معلوم کرتا، مگر کرن کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد کرن کے منہ سے نکلا "کریم آباد اور ٹیکسی جب کریم آباد میں داخل ہوئی تو کرن کو سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا۔ انڈیا سے قیدیوں کے تبادلہ میں چھوڑے گئے بابا کا چہرہ بھی بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ گھر کے سامنے سے ٹیکسی گزری۔

کرن چیخ پڑی۔ "روک دو روک دو، یہ میرا گھر ہے۔"

ٹیکسی والے نے بریک لگایا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کرن دوڑ کر اندر چلی گئی۔ بابا چارپائی پر بیٹھا تھا۔ فریدہ روٹی بنا رہی تھی۔ کرن کو دیکھ کر پہلے تو دونوں سکتے میں آ گئے، پھر آہستہ آہستہ خون نے جوش مارا۔ بادلوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسنے لگی اور اس سے زیادہ تینوں کے آنسو۔

ثوبیہ جبین

سجیلہ آپا ہمارے ساتھ والے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ان کے آنے کی وجہ سے مجھے فائدہ ہوا یا میرے آنے کی وجہ سے انہیں فائدہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ جن دنوں اظہر "میرے شوہر" کا ٹرانسفر اسلام آباد ہوا۔ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، سو آس پاس کے تمام فلیٹ ویران تھے۔ ظاہر ہے چھٹیاں ہر کوئی میکے یا سسرال میں منانا پسند کرتا ہے۔ اظہر کو چونکہ چھٹیاں کرنا یا لینا پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں یہاں پس رہی تھی۔ خود تو وہ آفس سدھار جاتے اور میرا گھبرانے اور بور ہونے کا ٹائم شروع ہو جاتا۔ ایسے میں سجیلہ آپا ہی تھیں جنہوں نے میرا پہاڑ سا وقت گزروایا۔ ایک تو وہ باتونی بہت تھیں۔ دوسرے وہ کھاتی بھی اسی رفتار سے تھیں۔

"ارے بیٹا! ذرا شربت تو پلانا۔ پیاس نگوڑی ایسی لگتی ہے ادھر کولر کے کولر چڑھا جاؤ۔ پل بھر میں ہونٹ پھر سوکھ جاتے ہیں۔"

"ارے علینہ! یہ چپلی کباب تو، تو بڑے مزے کے بناتی ہے۔ میری بیٹی اور داماد آ رہے ہیں ملتان سے ذرا ترکیب بتا دینا۔ بلکہ تم خود ہی آ جانا۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور میری مدد بھی ہو جائے گی۔"

انہیں شاید میری کمزوری ہاتھ لگ گئی تھی۔ سو وہ خوب فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ یا پھر میں ہی بے وقوف بن رہی تھی۔

رمضان کی آمد آمد تھی اور میں گھر کی صفائی ستھرائی میں صبح سے لگی ہوئی تھی۔ میری ہمیشہ ہی سے عادت تھی کہ رمضان سے پہلے جو ضروری کام نپٹانے ہوتے وہ کر لیتی' ورنہ روزے میں مجھ سے کام وغیرہ نہیں ہوتا تھا اور ویسے بھی اچھا نہیں لگتا کہ آپ عبادت چھوڑ کر کاموں میں لگے رہیں۔ مجھے تو فی الحال کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔

میری شادی کو چھ' سات مہینے ہی ہوئے تھے۔ یونیورسٹی سے بھی چھٹیاں تھیں۔ جمعرات کو پہلا روزہ اور ہفتے کو 14 اگست۔ میں نے کیلنڈر دیکھا۔ اس کا مطلب ہے دو دن رہ گئے ہیں۔ آج تو پیر ہے۔

کچن دیکھا' ضرورت کے برتن شلف پر ڈھلے ہوئے پڑے تھے۔ کچھ برتن سنک میں گندے اور باقی برتن ابھی پیکنگ سے کھولے ہی نہیں تھے۔ کمروں میں جالے کونوں کھدروں میں لٹک رہے تھے۔ باتھ روم بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ ایک طرف کسی نے شاید اضافی ٹونٹی لگوائی تھی۔ پتا نہیں اس کی کیا ضرورت تھی۔ جب پہلے سے ہی ایک نلکا اور شاور موجود ہے تو بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔ شاید خاتون خانہ نے یہاں کپڑے دھونے کے لیے لگوائی ہوگی۔ میں آپ ہی آپ جھنجلائے گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اپنی سستی پہ لعنت بھیجی اور کام میں جُت گئی۔

سارے ٹرنک کھول دیے' پردے' چادریں' صوفہ کور' گدیاں' پتا نہیں کیا کیا تھا۔ ابھی تک تو میں نے جہیز کی ایک چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اور آدھا سامان تو ہم ساتھ لائے ہی نہیں۔ ان کا ٹرانسفر اتنی جلدی ہوا تھا کہ بس ضرورت کا سامان ہی لا سکے تھے۔ باقی سامان کو بعد میں پہنچنا تھا۔ سیلاب زدگان کی وجہ سے کسی کا ٹرانسفر بھی نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے تو شادی سے پہلے کے پیپر سائن کیے ہوئے تھے۔ اور باری اب آئی تھی۔ پہلے تو ٹی وی کا بھی تھوڑا سا سہارا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب تو جس چینل کو لگاؤ وہاں ڈیٹ لائن فلڈ و کٹم اینڈ ہیلپ لائن والے بیٹھے ہر کسی کا ایمان جگا رہے ہوتے۔ میرا تو دل بھی بقول اظہر جتنا جلتا تھا۔ یہ سب سننا میرے لیے آسان نہ ہوتا تھا۔ اور ٹی وی تو ویسے بھی ابھی پیکنگ سے کھولا ہی نہیں تھا۔ آپ سوچ رہی ہوں گی جب کچھ بھی پیکنگ سے نہیں کھولا تو رہ کیسے رہے ہوں گے تو اس کی وجہ میری ازلی سستی تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ کھانے پینے کا ہوش ہی نہ رہے۔ ابھی آئے ہوئے ہمیں دن ہی کتنے ہوئے تھے۔

کام کے لحاظ سے آگے پیچھے دنوں کو ترتیب دیتے ہوئے سارے گھر کی صفائی میں "تقریباً" کر ہی چکی تھی۔ لیکن ابھی کچھ کام باقی تھا کہ دروازہ بجنے کی آواز آئی۔ دوسری' تیسری دستک' بجلی گئی ہوئی تھی' شاید اس لیے کسی نے دروازہ بجانے پہ اکتفا کر لیا' میجک آئی سے دیکھنے پر معجیلہ آپا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ تو ویسے بھی بجلی ہو یا نہ ہو' دروازہ ہی بجاتی تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔

"اف میں تو مرے ہی گئی بیٹا! آئی گرمی' پسینہ پسینہ ہو گئی۔ حالانکہ کل ہی تو بارش ہوئی تھی۔"

"کہاں سے آ رہی ہیں آپا! ہوا کیا ہے؟" میری کم بختی کہ پوچھ لیا اور وہ شروع ہو چکی تھیں اور مجھے معلوم تھا۔ اب دو' ڈھائی گھنٹے کہیں نہیں گئے اور ہوا بھی یہ ہی' جو باقی کا کام تھا وہیں اٹکا رہ گیا۔ حالانکہ میرا مکمل ارادہ تھا کہ آج کام مکمل کر کے چھوڑنا ہے۔ بیچ میں میرا تو دل ہی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ امی کے بقول تم بہت کام چور ہو۔

"کیا کریں بیٹا! یہ آج کل چور اچکے' بھیک منگے بڑے ڈول رہے ہیں' ان سے ہوشیار رہنا۔" ان کی بات پہ میں چونکی ہوئی۔

"کیا مطلب آپا!" میں نا سمجھی سے بولی تھی۔

"ارے یہ ہی سیلاب زدگان کی امداد کے لیے یہ جو لونڈے لور لور پھر رہے ہیں۔ ان کو کبھی کچھ مت دینا' حلیہ ان کا سیٹھوں والا ہوتا اور مانگ یہ فقیروں کی طرح رہے ہوتے ہیں۔"

"اچھا ابھی تک تو میرے گھر کوئی ایسا مانگنے والا نہیں آیا۔" مجھے نیا خوف گھیرنے لگا۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ میں گھر پہ اکیلی ہوتی ہوں تو' کوئی پتا نہیں ہوتا۔ آج کل تو دن دیہاڑے قتل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ پونے دو گھنٹے بعد خالہ واپس گئیں۔ میرا تو دل اب ویسے ہی نہیں کر رہا تھا (کام کرنے کو) اور وہ جو مجھے ڈرا گئی تھیں۔ برتن دھو کر کام مکمل کر کے جب میں واپس کمرے میں آئی تو شام کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ ساڑھے پانچ وقت دیکھا اظہر ابھی تک نہیں آئے۔ حالانکہ وہ تین بجے تک آجاتے تھے۔ دل میں عجیب وسوسے پیدا ہونے لگے۔ گھنٹی کی زوردار آواز پہ میں اپنی جگہ اچھل کے رہ گئی۔

"خدایا! کیا مصیبت ہے۔" کسی دن ایسے ہی میں دنیا سے چل بسوں گی۔ غصے میں آئی میجک سے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور پٹ سے دروازہ کھولا۔ اظہر کی مسکین سی صورت نظر آئی۔ شکر ہے جان میں جان آئی۔

"کہاں تھے آپ؟ پتا ہے میرا دل اتنا ڈر رہا تھا۔" ان کے آتے ہی شکوہ جڑ دیا۔

دونوں ہاتھوں میں سامان سے بھرے ہوئے تھیلے سائڈ ٹیبل پہ رکھ کے وہ صوفے پہ پاؤں پسار کے لیٹ گئے۔

"تمہارا دل اپنی جگہ پہ ہوتا ہی کب ہے؟ سلام نہ دعا' شکوے شروع ہو جاتے ہیں تمہارے اور یہ کیا لاپروائی ہے' دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا' دروازہ کھول دیا۔ لگ کے ہی کھڑی ہوئی تھیں کیا؟ پانی پلاؤ مجھے۔" میرے شکووں کا جواب دیتے ہوئے میرے مجازی خدا نے اچھا خاصا جھڑک کے رکھ دیا۔

"تو ہاں نا! بندہ ایک فون تو کر سکتا ہے ادھر' میں پریشان ہو رہی ہوں' اور یہ کیا ہے؟" پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے نظر سامان والے تھیلوں پر بھٹکی۔

"کل پرسوں سے روزے شروع ہیں' یہاں کوئی آثار ہی نہیں ہیں۔ کم از کم تم لسٹ ہی تیار کر سکتی تھیں کہ کیا کیا لانا ہے۔ مجھے ہی لانا پڑا سب۔"

"اوہ۔" میں نے شرمندگی سے ہونٹ سکوڑے۔

"تو میں کون سا فارغ تھی۔ سارا گھر جھاڑا ہے آج' تمہیں یہ تو نظر نہیں آیا۔" ایک دوسرے کی غلطیوں کو پکڑنے میں ہم دونوں ہی ماہر تھے۔

"اوہ کیا ہے بھئی! چپ کرو نا' تھکا ہوا ہوں میں۔۔۔ بیویاں' شوہروں کے آتے ہی ان کے آگے پیچھے پھرنے لگتی ہیں' کبھی سر دباتی ہیں' تو کبھی پاؤں اور تم ہونہہ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹ رہے۔

اب انہیں غور سے دیکھا۔ اف بے چارے واقعی تھکے ہوئے ہیں۔ ماتھے پہ پسینہ بدستور تھا۔ آستینیں اوپر چڑھی ہوئی اور یہ کیا جوتوں سمیت ہی۔۔۔ میری اتنی

محنت کا ستیاناس' کچھ کہنے کے لیے کھولا' لیکن چپ رہی کہیں پھر کچھ نہ کہہ دیں۔ سامان لا کے کچن میں رکھا اور جلدی سے چائے بنا کے لے آئی' تب تک وہ سو چکے تھے۔ الماری سے ان کے کپڑے نکالے۔ جگانے کے لیے آئی۔ اب اٹھاؤں کہ نہ اٹھاؤں۔ سر دبانے لگی۔

"اظہر۔! اٹھ جائیں نا' فریش ہو جائیں' دیکھیں آپ کے کپڑے بھی نکال دیے ہیں۔"

"اوں ہاں۔" گھڑی پر ٹائم دیکھا اور جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

"اب جوتے تو اتار لیں' یا یہ بھی میں اتاروں۔" میں منمنائی۔

میری شکل دیکھ کر وہ ہنسنے لگے۔ "مہربانی بڑی... اتار لوں گا۔ تم بس ایک کپ چائے پلا دو۔ یا وہ بھی میں ہی بنالوں۔" میرے ہی انداز سے کہتے ہوئے وہ جوتے اتارنے لگے۔

"لائی تو ہوں چائے۔" ٹیبل سے چائے کا کپ اٹھا کے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ بغیر کہے کوئی کام کیا ہے تم نے۔" شرارت سے کہا گیا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے جناب! ہم تو بہت کچھ کرتے ہیں' آپ ہی کو نظر نہیں آتا' جوتے الماری میں رکھے اور باتھ روم میں ان کپڑے اور تولیہ لٹکاتے ہوئے میں بھی جا رہی تھی۔

"یہ تم کس چلے میں پھیر رہی ہو' ماسی بھنگن۔"

"ہاں میں بھی جا رہی تھی' پہلے آپ چلے جائیں' سوپر صاحب۔!"

میری بات پہ اظہر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور میری پونی کھینچتے ہوئے چلے گئے' میرے ہونٹوں پہ دھیمی سی مسکان سج گئی۔ مطلع صاف ہو گیا تھا۔ سو میرے دل میں بھی اطمینان کا موسم چھا گیا۔

☼ ☼ ☼

چار روزے کیسے چٹکی بجاتے گزرے۔ پتا ہی نہیں چلا۔ آج پانچواں روزہ تھا۔ کچن بکھرا ہوا تھا' رات کو سحری بناتے اور پھر روزہ رکھنے کے بعد اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ برتنوں کو سمیٹ لوں۔ دس بجے سونا' دو بجے جاگنا اور چھ بجے تک جاگتے ہی رہنا۔ انہیں آفس بھیج کر ہی میں سوپاتی' دس بجے بمشکل اٹھتی' نیند ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اور اس سارے میں عبادت کہیں دور رہ گئی تھی۔ اظہر کو عادت تھی' وہ ہر نماز کے بعد قرآن پاک کی تھوڑی سی تلاوت کرتے اور مجھے بھی بٹھا لیتے۔ سو آسانی ہو گئی' نہیں تو خود سے تو کبھی بیٹھا ہی نہیں جاتا' ہر شام کو وہ پوچھتے' کتنے سپارے ہو گئے' میں آدھے پر اڑی رہتی' وہ آدھے گھنٹے میں پورا سپارہ بھی پڑھ لیتے۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ کام کہاں سے شروع کروں کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

"باجی! سیلاب زدگان کے لیے امداد کی ضرورت ہے۔ پلیز آپ بھی کچھ مدد کریں۔" ہوں' سیٹھوں والا حلیہ' آپا سعیلہ کی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں۔

"کیسی مدد بھئی؟"

"کچھ بھی دے دیں' پیسے' کپڑے' اناج' جو آپ کر سکیں۔"

"نہیں بھائی! ہم نے تو دے دیا ہے' آپ لوگوں کا کیا بھروسہ۔ امداد والے بھی ہو یا نہیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی' سوری۔"

"دیکھیے بہن! یہاں لوگ جو چھٹانک بھر کی امداد کر رہے ہیں اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا' بلکہ ہم تو ان لوگوں کے لیے کر رہے ہیں جنہیں اس مشکل گھڑی میں ہماری ضرورت ہے جو بے سائبان ہو گئے ہیں' آپ کی بھلائی بھی ہو گی ثواب ملے گا اور ان غریبوں کو بھی کچھ مدد ملے گی' آپ کو دعائیں دیں گے۔ آپ نہیں دینا چاہتیں بہن آپ کی مرضی۔ لیکن یوں الزام تو مت لگائیے؟" اتنا کہہ کہ وہ حضرت دائیں طرف والے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ میں ہونق بنی کھڑی دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد جب گیلری میں کپڑے سکھانے کے لیے میں باہر آئی نیچے کافی بڑی گاڑی' ٹرک ٹائپ ویگن کھڑی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے اندازہ کیا۔ تقریباً سب ہی لوگوں نے انہیں امداد دی تھی۔ ایک میرے گھر کے سوا' وہ کسی کے گھر سے خالی نہ لوٹے ہوں گے۔

"اف خدایا! یہ میں نے کیا کیا؟ یہ اگر واقعی سیلاب زدگان والوں کی طرف سے ہوئے تو..." اب ایک نئی فکر نے آگھیرا

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اب کے کوئی عورت ایک تھیلا لیے کھڑی تھی۔

"باجی! امداد کر دیں' سیلاب والوں کے لیے۔"

"اچھا میں لاتی ہوں' میں ابھی پچھتاوے کے زیر اثر تھی' سو اس کی پوری بات سننے کا انتظار بھی نہیں کیا' کلو آٹا نکالا' اتنی ہی چینی اور دو سو روپے لا کے اس کے تھیلے میں ڈال دیے۔

دروازہ بند کر کے ابھی بیٹھی ہی تھی کہ پھر دروازہ بجا' کھولا تو آپا سعیلہ سراپا انتظار تھیں۔

"آئیں آپا!" میں نے انہیں اندر بلایا۔

"اف گرمی۔" ان کا ازلی تکیہ کلام تھا۔ گرمی گرمی کرتی وہ اندر آئیں اندر آنے تک وہ اپنے پسندیدہ مشغلے یعنی بے تکان بولنا شروع ہو چکی تھیں۔

"ارے علینہ! آج کیا بنا رہی ہو افطاری میں۔ اے ہاں تم نے دیکھا ابھی یہ امداد والے جو آئے تھے۔" وہ پہلی بات چھوڑ کے اچانک کچھ یاد آنے پہ بولیں۔

"ہاں آپا!"

"کیسے کم بخت' بے غیرت لوگ ہیں' ذرا جو شرم آتی ہو؟"

"کیوں؟ کیا مطلب؟" میں اچنبھے میں پڑ گئی۔

"یہ جو بندہ لور لور پھر رہا تھا' جانتی ہو کون تھا یہ؟ ارے اپنے قریشی صاحب کی دکان میں ملازم لگا ہوا ہے۔"

"اب یہ ان کے قریشی صاحب کون ہیں۔ یہاں تو سارے ہی ان کے اپنے ہیں' کوئی جو پرایا ہو۔"

"کون آپا!" ان کے پہیلیاں بجھوانے سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔

"اے تمہیں پتا۔ بڑے جنرل اسٹور کے مالک قریشی صاحب' بڑے چھترے بندے ہیں' ساری مارکیٹ میں ان سے مہنگا کوئی نہیں۔ میں نے تو ایک دھیلا نہیں دیا۔ تم نے تو کچھ دے دلا نہیں دیا اسے؟"

"نہیں آپا!" (یہ ہی تو غلطی ہوئی) دل پشیمان تھا۔

"کیا پتا آپا! وہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت یہ سب کر رہے ہوں۔ کتنے ہی لوگ ایسے کرتے ہیں۔" مجھے ان کی باتوں سے منافقت کی بو آ رہی تھی۔ سو بالکل اتفاق نہیں کیا۔

"کہاں کی مدد کے تحت' لوٹنے کے سو بہانے ہیں ان کے پاس' خوب فائدہ ہے ان کو تو ان غریبوں کو کچھ نہیں ملتا۔ یہ سب اپنے لیے لے جاتے ہیں۔"

"آپا جیسی حکومت ویسی عوام! اب کیا کر سکتے ہیں۔" اب ان کی ہاں میں ہاں ملانی پڑی۔ ورنہ تو وہ پیچھے پڑ جاتی تھیں۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں کب وقت کٹا پتا ہی نہیں چلا۔

آپا بھی چلی گئیں اور میں کچن میں آ کر سوچنے لگی کہ آج کیا بنایا جائے۔ تمام گھرانوں کی طرح یہاں میرے لیے بھی یہ مسئلہ ہوتا تھا کہ کیا پکایا جائے۔

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ گھنٹی بج اٹھی۔

"اوہو اب کون ہے۔" پریشانی میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ اظہر کے آنے کا وقت ہے۔

خلاف توقع بڑی سنجیدہ سی شکل بنائے اندر داخل ہوئے اور کمرے میں سیدھے چلے گئے۔

"شاید روزہ زیادہ لگ رہا ہے۔" مجھے ان سے ہمدردی ہونے لگی۔ حالانکہ روزہ تو مجھے بھی لگ رہا تھا۔ لیکن وہ تو باہر سے آئے تھے نا!

سکنجبین بنا کے فریج میں رکھتے ہوئے مجھے کچھ یاد آیا۔ اظہر نے آج سلام نہیں کیا تھا۔ کیا بات ہے مجھے پھر پریشانی نے گھیر لیا۔

ہاتھ دھو کے کمرے میں آئی تو وہ چینج کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ جیسے انہیں انتظار

ہو کہ مجھے آنا ہے۔

"اظہر۔۔۔" میں نے پکارا۔

"ہوں۔" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے نکلے۔

"ہاں۔۔۔ تم نے آج امین صاحب سے بدتمیزی کی تھی؟"

"نہیں۔۔۔ کون؟" مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں' قریشی صاحب نے مجھے فون کرکے بتایا' سچی بات ہے مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتا' اور اب ان کا سامنا کرنے کی بھی میرے اندر ہمت نہیں۔"

"اظہر! کیا کہہ رہے ہیں۔"

ارے قریشی صاحب! آپا بھی تو ان کا ذکر کر رہی تھیں۔ اب کیا کروں' اظہر کو غصہ بہت آتا تھا۔ خدا کی پناہ۔ میرا تو رواں رواں کانپنے لگ جاتا تھا۔ خدا جانے کیا کچھ کہہ دیں' کچھ پتا نہیں چلتا۔

"وہ امداد کے لیے چندہ مانگنے آئے تھے گھر؟" جرح کی گئی۔

"ہاں وہ ایک آدمی آیا تو تھا۔" میں منمنائی۔

"جاہل عورت۔" ان کا چہرہ غیض و غضب سے سرخ ہو گیا۔

"مجھے کیا پتا تھا' آپا نے کہا یہ غریبوں کے نام پہ لوٹنے والے ہیں' اس لیے میں نے۔۔۔"

"کون آپا!" انہوں نے میری بات کاٹی' چہرے سے غصہ مترشح تھا۔

"سجیلہ آپا!" میں ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"جانتی ہو یہ عورت ایک نمبر کی فراڈ ہے۔ قریشی صاحب سے اپنی بیٹی کی شادی کرانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ نہیں مانے تب سے تمہاری یہ آپا ان کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ قریشی صاحب اخلاق کے اتنے اچھے ہیں کہ کوئی ان لوگوں کی باتوں میں آتا نہیں ہے اور یہ تم جیسوں کو بے وقوف بناتی ہیں' خود اس نے تین' چار عورتوں کا گروپ بنایا ہوا ہے' لوٹ رہی ہے دونوں ہاتھوں سے۔" کہتے ساتھ ہی اظہر نے نظریں پھیر لیں۔

"آپ کو کس نے بتایا یہ سب؟" یک دم مجھے یاد آیا۔ صبح ایک عورت کو امداد دی تو تھی کہیں وہ' او مائی گاڈ۔

"سارا محلہ جانتا ہے' ایک تم ہی احمق رہ گئیں۔"

"تو آپ مجھے بتا دیتے۔ اور ان صاحب نے بھی نہیں بتایا کہ وہ کون ہیں اور مجھے کیا پتا کہ یہ قریشی صاحب کون ہیں؟"

"اللہ کی بندی! پرسوں ہی تو بتایا تھا تمہیں' عقل گھاس چر گئی ہے تمہاری' کچھ خود ہی عقل استعمال کرلیتا ہے بندہ۔۔۔ مدد نہیں کرنا تھی نہ کرتیں' اتنی بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"سوری اظہر! مجھے نہیں پتا تھا۔" مجھے پچھتاوا گھیرنے لگا۔ واقعی مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن جو کہا تھا وہ واپس تو نہیں ہو سکتا تھا نا۔

اظہر' عصر کی نماز پڑھنے جا چکے تھے۔ اور میں مرجھائی کلی بنی کام نپٹاتی رہی۔

روزہ کھلا' افطاری بھی اظہر نے چکھنے کی حد تک کھائی اور نماز پڑھنے چلے گئے۔

"یا اللہ! مجھے معاف کر دے میں کیا کروں اب کیسے مناؤں اظہر کو' میں نے قصداً' تو نہیں کیا۔ مجھ سے غلطی ہی ہوئی ہے' نماز پڑھنے کے بعد میں زاروقطار رونے لگی۔

وہ شوق' وہ جذبہ ہی جیسے ختم ہو گیا۔ آہستگی سے جائے نماز اٹھا کے تہہ کی اور اظہر کا انتظار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج اٹھارواں روزہ تھا اور اظہر کا رویّہ بدستور قائم تھا۔ میں پریشان تھی کہ یہ گھٹا کب چھٹے گی۔ دل بہت بوجھل تھا۔ عشاء کی اذان کے بعد اب ساڑھے دس ہونے کو تھے۔ اظہر ابھی تک گھر نہیں آئے تھے۔ وہ روز یوں ہی کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو بارہ بج جاتے۔ سحری ہو یا افطاری بس چکھنے کی رسم پوری کرتے اور جانے کہاں نکل جاتے' لیکن آج تو ضبط کا یارا ہی نہ رہا۔



"امی! مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔" کچھ دیر بعد میں فون کرتے ہوئے رو رہی تھی۔

"میری بچی! کیا ہوا' کیوں رو رہی ہے' اظہر نے تو کچھ کہا نہیں' کہاں ہے وہ؟" ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی سوال کر ڈالے۔

"نہیں امی! یونہی۔ یہاں کوئی نہیں ہے آس پاس۔ دل اداس ہو رہا تھا' اس لیے آپ کو فون کیا۔ آپ ایسا کریں عباس بھائی کو بھیج دیں' وہ مجھے آکے لے جائیں' اظہر بزی ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' تم پریشان نہ ہونا۔ ہاں۔" فون کرکے بھی دل کو چین نہیں آیا۔

"یا اللہ! میں اپنی غلطی کا مداوا کیسے کروں؟" ہاتھ مسلتے ہوئے مسلسل میری آنکھوں میں نمی آتی رہی۔

"ہاں۔۔۔" ایک دم دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ کچھ دیر بعد میں ٹرنک کھولے کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بس آپی! تین دن بعد عید ہے یا دو دن بعد۔" چھوٹا عمار خوشی سے چہک رہا تھا۔ اور میری خوشی' تو کوئی خوشی نہیں تھی' اظہر کو بغیر بتائے آگئی تھی' اور اس دن سے ان کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ البتہ امی کو وہ فون کرتے ہی رہتے تھے اور میں کیا ہوتی۔ آنکھوں کے سامنے دھواں سا چھانے لگا۔ یہاں آنے کے دو دن بعد مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری ملی تھی۔ میں دنیا کے سب سے مقدس رشتے میں بندھنے والی تھی۔ یعنی ماں کا رتبہ' پتا نہیں وہ سنگ دل شخص' اسے کوئی خوشی بھی ہوئی ہوگی یا نہیں۔ اس کے بغیر میری ہر خوشی ادھوری تھی۔ اور میری سوچوں کا محور اب صبح و شام اظہر کی ذات ہی تھی۔ اور اسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

"انتیسواں روزہ بھی آگیا' لیکن وہ نہ آیا۔"

جب دل کے ہاتھوں پریشان ہو گئی تو فون اٹھایا اور نمبر ملانے لگی۔ اظہر کی گمبھیر آواز سنتے ہی دل میں ہلچل سی مچی اور میں پھٹ پڑی۔

"اظہر! آپ کو واقعی کوئی پروا نہیں ہے میری' میں مر رہی ہوں یا جی رہی ہوں' کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ ایسا' میری غلطی کی اتنی بڑی سزا تو مت دیں۔ مر جاؤں گی میں۔"

تیز تیز کہتے ہوئے میری سانس پھول گئی۔ کچھ دیر رابطہ رہا' پھر کاٹ دیا گیا۔ میں شاکڈ رہ گئی۔ میرے خدا۔! موبائل فون ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے بعد میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"علینہ! میری جان آنکھیں تو کھولو۔" ایک مانوس سی آواز کانوں سے ٹکرائی اور میں نے پٹ سے آنکھیں وا کیں' بے تابی سے نظر دوڑائی' یہ میری نظروں کا دھوکا تو نہیں۔

"یہ میں ہی ہوں یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں' اپنا خیال نہیں رکھا جاتا تم سے۔" ان کی اپنائیت بھری ڈانٹ سے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"اب میں آگیا ہوں نا تمہارے پاس یہ آنسو اب نہیں ہونے چاہئیں۔"

"کیوں آئے ہیں نہ آتے۔" شکوہ لبوں سے پھسل ہی گیا آخر۔

"کیوں نہ آتا۔۔۔ میری جان نے بلایا' میں نہ آتا۔" انہوں نے پیار سے میرے بال سنوارے' میری آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

"اتنی دیر اظہر!"

"سوری علینہ! تم بغیر بتائے یوں چلی گئیں' مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے تمہیں فون ہی نہیں کیا۔ لیکن جب تم نے فون کیا تو مجھے احساس ہو گیا کہ تمہاری ذرا سی غلطی کی اتنی طویل سزا دینے کا مجھے واقعی کوئی حق نہیں تھا۔ اب روؤ نہیں پلیز' ہنسو ایسے۔" انہوں نے دانت نکالے۔

اور میں بے ساختہ کھلکھلائی۔ اظہر نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی محبت کی پھوار میں' میں بھیگ گئی۔

☼

سعدیہ عزیز آفریدی

# حسنِ زندگی کا

اُس کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی اور کمرے میں ہلکی آواز میں چلتانی وی اس بات کی علامت تھا کہ شاہ میر جاگ گئے ہیں۔

دائم نے میوزک پر سر دُھنتے ہوئے ہلکی سی انگڑائی کے بعد پورے بدن کو تناؤ دے کر طویل انگڑائی لی اور اپنی طرف کمر کیے کرسی پر بیٹھے ٹی وی سے محظوظ ہوتے شاہ میر کو دیکھا۔ 80 کی دہائی کا میوزک چل رہا تھا اور میوزک سنتے وقت وہ مداخلت پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ سوئی جاگی کیفیت میں اٹھا اور واش روم کی طرف بڑھا۔ واش روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

شاہ میر! آپ نے آج پھر میرے استری کیے ہوئے کپڑے پہن لیے؟"

دائم جتنی تیزی سے باہر آیا تھا، شاہ میر کو ٹی وی کے سامنے ہی ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس کی چیخ سن کر ہی منظر سے غائب تھے، لیکن آج دائم کا پورا ارادہ تھا کہ وہ شاہ میر سے زبردست جھگڑا کرے گا، یہی وجہ تھی کہ وہ اسی حلیے میں سیڑھیاں اترا تھا مگر کھانے کے کمرے میں سب کو بیٹھا دیکھ کر دائم نے ایک نظر خود پر ڈالی بغیر شرٹ کے ہاف پینٹ اور بنیان میں کھڑا وہ عجوبہ ہی لگتا

ناولٹ

Saba

اور دادو کی لمبی فضیحت بھری تقریر شروع ہوتی وہ دانت پیستا ہوا واپس اپنے کمرے میں آیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"آپ انسان ہیں یا بھوت؟ ابھی آپ یہاں نہیں تھے۔" وہ واقعی حق بجانب تھا حیرت دکھانے میں مگر شاہ میر کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اب اس کی الماری کھولے کھڑے تھے۔

"یہ پرفیوم ڈھائی سو والا ہے ناں، میں لگالوں؟" ان کے چہرے کی معصومیت دائم کا غصہ کم نہ کرسکی۔

"یہ مہو نے دیا ہے، گفٹ ہے اور پورے ڈھائی ہزار کا ہے۔"

"آ... ہاں منگیتر صاحبہ نے دیا ہے، لیکن یار! صرف ایک زیرو ہی تو کم لگایا تھا، پلیز اس غلطی کی اتنی بڑی سزا تو مت دے یار۔" شاہ میر گلوگیر لہجے میں بولے اور دائم کو ہنسی آگئی۔

"بس کردیں، اتنا ڈرامہ نہ کیا کریں۔" اب وہ مجبوراً اپنی ہی شرٹ پر اپنی منگیتر کے دیے ہوئے پرفیوم سے شاہ میر کو خوشبو میں بسا رہا تھا۔

"بچی کی چوائس بہت اچھی ہے، بس تھوڑی سی مار کھا گئی، جیون ساتھی کی چوائس میں۔"

"شاہ میر! کچھ خیال کریں، وہ آپ کی کزن کی بیٹی ہے۔"

"تب ہی تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، یہ سوچ سوچ کر کہ مائیں اپنی بیٹیوں کے اچھے نصیب کی کیسی کیسی دعائیں نہیں مانگتیں۔" وہ لمحہ بھر کو رُک کے پھر رازدارانہ بولے۔

"وہ بلیک کف لنکس کہاں رکھے ہیں؟ رات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔"

"شاہ میر! آپ میرے ہاتھ سے قتل ہوجائیں گے۔ آپ کے پاس اپنا بھی کچھ ہے؟"

"ہاں ہے، میرے پاس ماں ہے، تیرے پاس ہے؟" وہ اداکاری کرنے پر اتر آئے اور دائم نے ان کی ٹون ہی میں کہا۔

"شکر ہے، آپ سے بہت اچھی ماں ہے میرے پاس۔" اور شاہ میر نے آنکھیں نکال لیں۔

"قرب قیامت ہے، اپنی ماں کے چکر میں اپنی دادو کو نکما کہہ رہا ہے نامعقول! اگر آج وہ نہ ہوتیں تو کیا اتنا اچھا باپ ملتا تجھے؟"

"شاہ میر! آپ بات کو غلط رنگ میں لے رہے ہیں۔" مگر وہ اس جملے سے پگھلے نہیں اور دائم کو الماری میں سے کف لنکس نکال کر ان کے سامنے رکھنے پڑے کیونکہ وہ اسے دھمکا ہی اسی لیے رہے تھے۔

"بہت خبیث ہیں آپ!" غصے میں وہ انہیں توپ قسم کی بری زبان میں خبیث ہی کہتا تھا مگر ہمیشہ کی طرح ان پر آج بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ کمرے سے جانے لگے تھے جب دائم نے یکدم شاہ میر کو روک کے پوچھا۔

"آپ کو قسم ہے، یہ بتا کر جائیں، جب میں بہت شدید غصے میں ہوتا ہوں تو آپ ایک دم کمرے سے کہاں گم ہوجاتے ہیں؟" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے "تمہارے غصے سے بچنے کے لیے میں شاہ زین بھیا کی ٹیرس پر کود جاتا ہوں۔"

"آپ کا دماغ خراب ہے! اگر توازن خراب ہوجائے تو آپ کو پتا ہے، آپ کا کیا حال ہوگا؟" وہ سوچ کر ہی کانپ گیا تھا شاہ زین چاچو کے ٹیرس سے اس کا ٹیرس کوئی چار پانچ فٹ دور تھا، درمیان میں صفائی ستھرائی کروانے کے لیے پیر رکھنے کے لیے شیڈ سا بنا گیا تھا مگر یہ شیڈ اتنا چھوٹا تھا کہ عموماً استعمال نہیں ہوتا تھا اور ماہانہ صفائی کے لیے ملازمین، باہر کی سمت سیڑھیاں لگوا کر اسے صاف کرتے تھے۔

"اگر آپ کو کچھ ہوجائے تو؟"

"تو مجھے پتا ہے، گھر میں کسی کونے میں تبدیلی نہیں اترے گی۔ شاہ زمان بھیا تیرے پاس آکر کہیں گے آنسو پونچھ لو۔ شاہ جنید کے گھرانے کے مرد کبھی نہیں روتے۔ ساری بھابھیاں سکون کا سانس لیں گی اور شاہ احمد بھیا، وہ تو قسم سے روپوش ہیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے مجال ہے اس بندے کے اندر کوئی اتار چڑھاؤ



پیدا ہو، میں جس دن مرا، تب یہ بندہ ٹی وی اسکالر کی طرح بس دو منٹ کی خاموشی اختیار کرے گا اور اپنے کسی کام میں بزی ہوجائے گا۔"

"توبہ ہے شاہ! اگر آپ کے خیالات ان تک پہنچ گئے ناں کسی دن تو خوب پانی پت کی جنگ چھڑ جائے گی۔"

"چھڑ جائے، میں کوئی ڈرتا ہوں۔ اللہ جانتا ہے، اللہ کے بعد، صرف اپنی ماں سے ڈرتا ہوں۔"

وہ صاف گوئی سے بولے اور نیچے چلے گئے تھے۔ تب دائم نے گہری سانس لے کر باتھ روم کا رخ کیا۔ نہا دھو کر تیار ہوا کہ والٹ اٹھاتے ہوئے اس نے عادتاً رقم گنی اور پانچ سو روپے پھر کم پائے۔

"یہ شاہ میر بھی..." وہ جھلاتا ہوا ناشتے کے کمرے میں آیا اور حیران رہ گیا، وہ کینڈل کیک لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے دائم...!" اسے حیرت ہوئی کیونکہ اسے اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی۔

"آپ کو کیسے یاد رہا اور مہو کیوں بھول گئی؟"

"وہ بے چاری کہاں بھولی تھی صبح فجر سے فون کیے جارہی ہے، مگر میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا، اس لیے تمہارا سیل فون آف کردیا تھا وہ بے چاری تو کب سے کوششیں کررہی ہوگی۔" وہ مزے سے کہہ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"یہ آپ جیسا لونگ بندہ کب سے کیدو کا پھوپھا بن گیا؟"

"بس کبھی کبھی دل چاہتا ہے ناں؟ ہم جس سے محبت کرتے ہیں، وہ صرف اکیلا ہمارے پاس ہو، ہمارے ساتھ ہو، چوبیس سال میں یہ چھٹی برتھ ڈے ہے جو تم میرے ساتھ گزار رہے ہو۔"

"آپ اتنا حساس کیوں ہیں میرے لیے؟" اس نے شاہ میر کو حیرت سے دیکھا وہ مسکرا کر بولے۔

"پتا نہیں، بس مجھے تم شروع سے اپنے سے لگتے ہو۔ جب میں گھر آیا تو، پوری زندگی میں تم میرے پہلے دوست تھے۔ مجھ سے چار سال چھوٹے مگر میرے بہت اپنے۔ بڑے بھیا کی خاموش محبت، بنیبھی لہجہ، پروا کرنا یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا پھر پتا نہیں بھابھی کو کیا ہوا، انہوں نے تمہارے بگڑ جانے کے ڈر سے تمہیں ہاسٹل میں شفٹ کروا دیا اور تم جانتے ہو، یہ اتنے سارے سال میرے لیے کتنے تکلیف دہ اور اکیلے تھے۔"

اور یہ سچ تھا۔ وہ پچھلے سال ہی سی ایس ایس مکمل کر کے گھر آیا تھا، پھر سول سروس کی ٹریننگ وغیرہ سے نمٹ کر تقریباً تین ماہ سے پوری طرح شاہ میر کے زیر کنٹرول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ میر اس کے ساتھ کو انجوائے کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ شاہ میر کو سوچ کے زاویوں سے جھانک رہا تھا، جب انہوں نے چاکلیٹ کیک کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں رکھا اور خود بھی کھانے لگے۔ دائم نے اچانک پوچھا۔

"کیک مزے کا ہے مگر آپ اتنا تیار کیوں ہوئے ہیں شاہ میر؟"

"تمہاری برتھ ڈے کے لیے۔" جواب پر وہ ہنسنے والا ہی تھا کہ ماما کھانے کے کمرے میں آگئیں اور شاہ میر کو تیز نظروں سے گھور کر بولیں۔

"تمہارے پاس اپنی بھی کوئی چیز ہے؟ سر سے پیر تک دائم سے مانگی ہوئی چیزوں سے سجے کھڑے ہو۔"

"ماما.....!" اس سے پہلے کہ دائم انہیں منع کرپاتا' شاہ میران کے قریب بڑھتے چلے گئے' پھر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولے۔

"ہے ناں میرا اپنا بھی کچھ..... یہ مسکراہٹ..... یہ خالص میری ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائے بھی تھے اور ماما کو اس مسکراہٹ پر پتنگے لگ گئے۔

"میں سب سے کہتی ہوں کہ شاہ میر اب گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا' مگر پتا نہیں اماں اور بابا کو کیا نظر آتا ہے تم میں اور باقی سب بھی تم سے کمپرومائز کیوں کرکے رکھتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ انہیں لگتا ہے میں مستقبل میں کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دینے والا ہوں' یاد رکھیے گا بھابھی! اگر میرا دل دکھائیں گی تو جب میں مشہور ہو جاؤں گا ناں تو آپ کو پہچانوں گا بھی نہیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر چلی گئیں ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ سخت گرمی تھی دائم باہر لان میں سیڑھیوں پر بیٹھا تھا کہ وہ اس کے پاس چلے آئے۔

"چل ناں دائم! باہر کتنے مزے کا موسم ہو رہا ہے۔"

"کوئی نہیں ہو رہا مزے کا موسم... اتنا حبس ہے۔" اس نے گھور کے دیکھا اور شاہ میر ہنسنے لگے۔

"اچھا دیکھ! اماں جان کہتی ہیں' جب حبس ہوتا ہے تو پنجاب میں بارش ضرور ہوتی ہے۔" وہ اس انوکھی منطق پر ہنس پڑا۔

"ہاں' پنجاب میں نا! کراچی میں نہیں۔ آپ کراچی کی شام میں بیٹھے ہوئے ہیں میری جان۔" اس نے شرٹ کے اوپری بٹن کھولے ہوئے تھے جب کہ وہ جینز پر کرتا پہن کر بڑے تِک سِک سے تیار کھڑے تھے۔

"کہاں جارہے ہیں شاہ میر.....؟" اس نے انہیں تیار دیکھ کر پوچھا۔

"بس کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں نا' دل اوب گیا ہے گھر سے' چل نا! میرا بھائی نہیں؟"

"نہیں میں نہیں جارہا مجھے اس گرمی میں صرف گھر میں رہنا پسند ہے۔"

اس نے صاف منع کردیا اور وہ بوتھا بُجھا کر بیٹھ گئے۔ دائم کا خیال تھا وہ اب خود ہی چلے جائیں گے مگر دوسرے لمحے شاہ میر نے دائم کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

"تجھے کیا لگتا ہے میں تیری جان آسانی سے چھوڑ دوں گا؟"

"مجھے کہیں نہیں جانا شاہ کے بچے" وہ تنگ کر وا مگر وہ خاطر میں لائے بغیر اسے سنانے لگے۔

"بکواس نہ کر۔ باقی لوگوں کی طرح روبوٹ بن کر مر جانا ہے کیا؟ انسان بن یار! جیتا جاگتا انسان۔ پھول پودوں' خوشبو' چاند کی باتیں کرنے والا' تیری میری باتیں کرنے والا' کسی کے آنسو صاف کرنے' کسی کی تسلی بننے والا عام سا انسان۔"

"مجھے عام انسان نہیں بننا شاہ! مجھے ایلیٹ کلاس میں جینے کے ڈھنگ سکھائے گئے ہیں اور آپ ساٹھ ستر کی دہائی جیسی باتیں کررہے ہیں۔"

"باتیں کرنا کبھی کبھی چپ رہنے سے بہتر ہوتا ہے۔" شاہ میر سنجیدگی سے بولے۔

"آپ جیسے لوگوں کے لیے خلیل جبران کہتا ہے' باتونی لوگوں پر صرف گونگے ہی رشک کرسکتے ہیں۔"

دائم کے اس جملے پر شاہ میر کا قہقہہ گاڑی میں گونج کر رہ گیا تھا "اوئے ہوئے' پوائنٹ مارتا ہے بدتمیز! شرم کر میں تیرا چاچا ہوں۔"

اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔ بے شک ہینڈسم نہیں تھے مگر خوبرو ضرور تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں دراز قد..... وہ اسے متاثر کرجاتے تھے۔ لڑکیوں کا تو



حال ہی عجب تھا۔

"مجھے پتا ہے میں آج بڑا خوب صورت لگ رہا ہوں' بلیک رنگ مجھ پر واقعی بہت سوٹ کرتا ہے۔" اس نے بریک پر دباؤ ڈالا ان کے پیر دیکھے' بھرے بھرے پاؤں اور اس پر ڈارک براؤن کولہاپوری۔

"نئی ہیں' چرا کر بھاگتا ہے کیا؟" شاہ میر مسکرا کر بولے۔ وہ جھینپ گیا۔ اتنے غور سے تو اس نے کبھی اپنی منگیتر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

"مجھے تیری صحبت خراب لگتی ہے۔" وہ شرارت سے بولے۔

اب کی بار دائم ہنس پڑا تھا "توبہ شاہ میر! کہاں کی بات کہاں لے گئے۔ یہ میڈیکر ٹائپ فلموں نے تو رشتوں کا دھڑن تختہ ہی کرکے رکھ دیا ہے اب جہاں دو دوست بھی بیٹھے ہوں لوگ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں۔"

"اہم یہ تو ہے' پر ہمیں کیا لوگ جو سوچیں مگر سچ تو یہی ہے نا کہ ہم جان ہیں تیری۔" یہ شاہ میر کا خاص ریشہ خطمی اسٹائل تھا یعنی اب کوئی فرمائشی بم گرانے والے تھے وہ اس پر۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا جناب کے لیے؟" اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔

"بس پانچ ہزار چاہئیں جان جگر!"

"پانچ ہزار کیوں..... ابھی پچھلے ہفتے تو دادو اور پاپا نے الگ الگ دس' دس ہزار دیے تھے آپ کو۔"

"یار! میرے ہاتھ میں چھید ہے' پیسے رکتے ہی نہیں جتنا بھی روک لوں۔"

"بس یہی عادتیں ہیں جو گھر بھر کی عورتیں آپ سے نالاں ہیں۔ آپ کی وجہ سے ان کا بجٹ جو خراب ہوجاتا ہے۔"

"عورتیں نہ کہو' وہ سب تو جلاد ہیں' اگر ان کا بس چلے تو ایک ہی پھونک مار کر مجھے خاکستر کردیں۔"

"دیسے کل دادو بھی یہی کہہ رہی تھیں' اب آپ کیا کہتے ہیں۔"

ان کی مسکراہٹ میں حلاوت در آئی تھی۔ "وہ' وہ تو جنتی عورت ہیں بلکہ جنت ہیں میرے لیے... اس لیے مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ ان کی کسی بات سے مجھے اختلاف نہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "میں جھوٹ بول رہا تھا۔ دادو کبھی آپ کے لیے کوئی سخت کمنٹ پاس کر ہی نہیں سکتیں۔"

"ہاہاہا... ظاہر ہے ان کا لاڈلا بیٹا جو ہوں' اتنا پیارا اتنا اسمارٹ کہ بس۔" وہ مصنوعی کالر اکڑانے لگے۔ دائم نے والٹ نکال لیا تھا مگر جو اضافی پانچ ہزار تھے' وہ اس میں نہیں تھے۔

"چاچو! آپ جیب کترے کب سے بن گئے؟"

"ابے چل! میں کیوں بننے لگا جیب کترا... کسی اپنے کی جیب سے پیسے نکالنا جب کہ وہ خود بھی دینے پر آمادہ ہو' جیب کتراپن تھوڑا کہلاتا ہے' یہ تو ہنرمندی ہے۔"

"پوچھ سکتا ہوں یہ ہنرمندی جناب نے سیکھی کہاں سے؟" اس نے ابرو ترچھا کرکے پوچھا۔ وہ مسکرانے لگے۔

"ایک دوست تھا' بہت برسوں سے بچھڑا ہوا' بازار میں اچانک ملا' میری جیب تراشتے ہوئے میں نے کوٹ کے اندر سے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ شرمندگی سے ہنسنے لگا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہنے لگا' وائف کے ساتھ ہوں۔ اس کی شاپنگ میں پیسے کم پڑ گئے ہیں' اس لیے تیری جیب سے قرض مانگ رہا تھا۔ میں نے والٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا' جو لیتا ہے' خود لے لو۔ بس کرایہ چھوڑ دینا۔"

"کیا ایران توران کی ہانک رہے ہیں میں آپ کے سب دوستوں کو جانتا ہوں سب ویل آف فیملیز سے ہیں۔ اور یہ کس زمانے کا واقعہ ہے کہ آپ کرائے کی بات کرتے ہیں' پندرہ برس سے آپ گھر کی ہر گاڑی پر ہاتھ صاف کرتے آرہے ہیں چاچو۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑے "ابے اس کا مطلب ہے میں کبھی ایک اچھا واقعہ نگار نہیں بن سکتا یعنی بیوی کے سامنے جھوٹ بولا تو فوراً" پکڑا جاؤں گا۔"

"تو جب جھوٹ بولنا آتا نہیں تو بولتے کیوں ہیں؟" اس نے گھورا۔

وہ نمانے سے ہو کر بولے "کل بھابھی کو جھوٹ پر سچ پینٹ کرتے دیکھا تو مجھے لگا میں بھی اچھی خاصی گل کاری کر سکتا ہوں۔"

"کون سی بھابھی..... کیا ماما.....؟" دائم کے کان کھڑے ہوئے۔

شاہ میر شرارت سے بولے "ارے وہ تو جنتی عورت ہیں ہمیں کہاں ان کے خلاف بول سکتا ہوں۔ میں تو صبا بھابھی کی بات کر رہا تھا۔ کل بھیا سے کہہ رہی تھیں 'شاہ میر بہت بگڑ گیا ہے۔ آج اس نے میری فرینڈز کے سامنے بڑا ندیدہ پن دکھایا جیسے اسے گھر میں کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں۔"

"ہوا کیا تھا.....؟" وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے اپنے سامنے سانپ دیکھ لیا ہو۔

صبا بھابھی گھر بھر میں ہری مرچ مشہور تھیں۔ انہیں باتوں کو رنگ لگانا، اس میں تیز مسالہ چھڑکنا خوب آتا تھا، ہر کوئی ان سے گھر میں بنا کر رکھتا تھا مگر یہ شاہ میر تھے۔ اس زمانے کے ایک عجیب ترین انسان جنہیں خطروں سے کھیلنا اور پھر جیت جانے کا جنون تھا۔

"اب بولیں بھی، آپ نے کل کیا کارنامہ کیا تھا، کمپنی کی مشہوری کے لیے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ ان کی کچھ فرینڈز آئی تھیں، سب مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح حیران رہ گئیں، 'یہ تو تمہارے بیٹے سے چار، پانچ سال ہی بڑا لگتا ہے۔' بھابھی ایج کانشس ہیں، بڑبڑانے لگیں اور میں انہیں جلانے کو وہیں بیٹھ گیا، پھر میں تھا اور بھابھی کی جھوٹی سچی تعریفیں۔ بھابھی انہیں صرف کولڈ ڈرنک پر ٹرخانے والی تھیں اور میں کمینہ پن سے سب کا پسندیدہ مینو پوچھنے بیٹھ گیا۔ پھر میرے دل نے کہا، موقع اچھا ہے کباب کھانے کا، سو ان کے مینو میں، میں نے اپنے کباب بھی ایڈ کر دیے۔ لو جی پھر تو بھابھی نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں فرشتہ نہ ہوتا تو بھسم ہو کر مر جاتا۔"

"شاہ میر! آپ بھی ناں....." وہ ان کے فرشتے والی بات پر ہنسنے لگا۔

وہ مزید شرارتی ہو کر بولے "بھابھی نے بھیا کے لیے کباب بنا کر رکھے تھے، تلنا ان کی آمد پر تھا۔ ان کا خیال تھا وہ رات کو کباب کی منہ دکھائی اکیلے میں کروائیں گی، مگر میری وجہ سے انہیں فوراً محنت کرنا پڑی، پھر کھانا کھاتے کھاتے جب میں نے اپنی برتھ ڈے کا شوشا چھوڑا تو صبا بھابھی کی شکل دیکھنے والی ہو گئی تھی، وہ مجھے جھٹلا بھی نہیں سکتی تھیں۔ میں اور پھیل گیا، پھر ان کی ساری فرینڈز ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے چکر میں آگے بڑھ بڑھ کر اچھی خاصی رقم میری جیب میں ڈالنے لگیں، بھابھی دانت پیس رہی تھیں، جب میں نے معصومیت سے ان کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا تھا۔

"کیوں بھابھی ماں! آپ مجھے کوئی گفٹ نہیں دیں گی؟"

بس پھر ان کی سرخ آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ کیا غضب تھا ان میں مگر صبا بھابھی نے پورے دو ہزار میری ہتھیلی پر رکھے تھے، کل ملا کے میں نے بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار کما لیے تھے۔"

"پندرہ ہزار.....! گئے کہاں چاچو؟ دائم پھر حیران ہوا اور وہ قہقہہ لگا کر بولے۔

"پانچ ہزار اظفر کی جیب میں ڈال دیے تھے تاکہ جب بھابھی میری شکایتیں لگا رہی ہوں بھیا سے تو اظفر میرا وکیل بن کر میری طرف داری کرے۔"

"پھر کی اس نے طرف داری؟" دائم نے انہیں گھورا، وہ شرارت سے بولے۔

"ہاں ناں، کی طرف داری، وہ بھی بڑی دھانسو، ویسے بھی بھیا تو بھیا۔ بھابھی بھی اس کی بات کو اگنور نہیں کرتیں۔"

"اس نے کیا کہا آپ کی بابت؟" دائم کو کھد بد ہونے لگی اور وہ اسی شرارت بھری ٹون میں بولے۔

"اس نے کہا پاپا! چاچو نے یہ سب ڈرامہ کوئی اپنے لیے تھوڑا کیا تھا، وہ تو چیریٹی کے لیے رقم جمع کرنا چاہتے تھے۔



آپ جانتے ہیں ماما سمیت ماما کی کئی پارٹی فرینڈز چیریٹی پر رقم اسی وقت خرچ کرتی ہیں جب انہیں وہاں میڈیا کی لائم لائٹ میں جگمگایا جائے اور چاچو نیک نیتی سے صرف چیریٹی کرنے کا شوق رکھتے ہیں، اس لیے انہیں یہ ڈرامہ کرنا پڑا۔"

"پھر.....؟" دائم نے اور دلچسپی لی۔ وہ مزید بولے۔

"پھر بھابھی نے کہا، اور وہ کباب کھا گیا سارے۔"

بھیا نے گھور کے انہیں دیکھا "بس کرو صبا اتنی تنگ دلی کا ثبوت نہ دیا کرو جیسے ہمارے لیے اظفر اور شہباز ہیں، ویسے ہی شاہ میر۔" صبا بھابھی پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں اور میں نے بھیا کے بیڈ کے نیچے انگڑائی لے کر سوچا، بیڈ کے اوپر اور بیڈ کے نیچے سونے والے ایک جیسے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ زمین پر چیونٹیاں اور لال بیگ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"شاہ میر! توبہ کریں..... چاچی کو صفائی کا بہت خبط ہے، ان کے کمرے میں چیونٹیاں اور لال بیگ نہیں ہو سکتے۔"

"پتا ہے مجھے، میں تو جبران کے قول کو ٹھیک کر رہا تھا۔"

"واہ، واہ آپ اور جبران کے اقوال کو ٹھیک کریں گے۔ جانتے بھی ہیں، وہ کتنا بڑا فلسفی تھا۔"

"بہت بڑا نہیں تھا۔ یہی کوئی ساڑھے پانچ فٹ کا ہو گا اور تمہارے چاچو چھ فٹ 3 انچ ہیں، پس ثابت ہوا وہ فلسفی بڑا تھا تو ہم بڑے انسان۔"

"کیا پیمانہ ہے آپ کا بڑائی ناپنے کا....." وہ ہنسا اور پھر رازدارانہ بولا "ویسے آپس کی بات ہے، آپ نے وہ پیسے کس چیریٹی لون میں جمع کرائے۔"

"سیدھی سی بات ہے سب سے زیادہ چیریٹی کا تو میں خود حق دار تھا۔ یتیم، مسکین بچہ ہوں، اگر وہ رقم خود پر خرچ کر لی تو کوئی غلط بات تھوڑا ہے۔"

"ہاں ہاں، کہاں غلط بات ہے آپ کبھی غلط بات کر سکتے ہیں۔" وہ کالر اکڑا کر دائم کی خفگی بھری تعریف پر مسکرائے۔ ان کی گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے رک چکی تھی۔

"یہ السید ہوٹل بہت مہنگا ہوٹل ہے۔" شاہ میر نے عینک اتار کر دائم کو غور سے دیکھا، پھر رازدارانہ بولے۔

"خیر ہے! یہ تیری روح اندر سے اتنی غریب کب سے ہو گئی۔"

"شاہ میر! یہاں چائے کا ایک کپ ڈھائی سو کا ہے۔"

"اچھا چل تو صرف چائے پینا ڈھائی سو روپے تو ہوں گے نا تیرے پاس؟ میں تو یہاں کے چکن چیز سینڈوچ کھانے آیا ہوں۔ ساتھ گارلک ساس والے فنگر چپس.....Yummy۔"

"یہ آپ ایک دم سے رئیسوں والے چونچلے کب سے کرنے لگے؟"

وہ مڑ کر شرارت سے بولے۔ "جب سے مجھے پتا چلا ہے، میرا بھتیجا فارن منسٹری میں جانے والا ہے۔"

اس نے اتنی اپ ڈیٹ پر شاہ میر کو حیرت سے دیکھا پھر بولا۔ "میں نے انٹری ٹیسٹ ضرور دیا ہے مگر تین ہزار میں سے میرا سلیکشن ہو جائے، یہ ضروری تو نہیں شاہ میر۔"

"نہ ہو۔ بیوروکریٹ تو بن چکا ہے ناں! منسٹری بھی مل ہی جائے گی، اپنی بڑی دھوم ہے سیاسی میدانوں میں۔"

وہ اب اندر داخل ہو چکے تھے اور دائم کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے حیران تھا کہ وہ سیاسی میدان میں کہاں سے کود پڑے۔

"وہ اپنا ایک دوست ہے جلیل راؤ، بہت مشہور کالم نگار ہے، اپنا یار غار ہے اور سمجھ لو، مجھے کوئی کام نکلوانا ہوتا ہے تو بس جلیل راؤ کے گلے پر پیر رکھ دیتا ہوں۔"

"توبہ توبہ شاہ میر! دوستوں کے ساتھ یہ بدسلوکی..... آپ کو کبھی شرم بھی آئی ہے۔"

"ہاں آئی تھی، ایک بار جب میں نے بابا کے سامنے زندگی میں پہلی بار سچ بولا تھا اور بابا جان بولے تھے، بہت ہو گیا شاہ میر! اور کتنا جھوٹ بولو گے۔"

"یہ کس زمانے کی بات ہے۔" دائم نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی اور وہ اسی منسٹری شان سے بولے۔

"یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے' ویسے آپس کی بات ہے پتا نہیں بابا جان ہمیشہ میری طرف سے اتنے مشکوک کیوں رہتے ہیں حالانکہ دس بجے تک گھر آجانے والی پہلی اور آخری اولاد ہوں ان کی۔"

کھی کھی کھی..... دائم اب ہنسی ضبط نہیں کر سکا تھا۔

"ایک ایسی اولاد جو کوئی کام نہ کرتی ہو اس کا رات کے دس بجے آنا بھی مشکوک کر دیتا ہے۔ سارا دن کیا کرتے رہے' یہ سوچ کر چاچیوں کا تو پکا خیال ہے" آپ نے چھپ کر کوئی شادی تو نہیں کر رکھی۔"

"ابے میں چھپ کر شادی کیوں کروں گا" مالی طور پر اخلاقی طور پر ہر طرح سے مضبوط ہوں یار! ہاں گرل فرینڈ بہت ساری ہیں۔"

"کیا مضبوط کردار ہے۔" دائم نے پھر سے طنز کیا۔

وہ اثر لیے بغیر بولے۔

"کام نکلتے رہتے ہیں بہت سے۔ ساری اچھی کیٹگری کی دوست ہیں میری۔"

وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے ٹیبل پر رکھے ٹشو پر کچھ لکھ کر اشارے سے ایک ویٹر کو دیا تھا۔ دائم کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ان کی ٹیبل کا سروس عملہ ایک دم سے چینج ہو گیا تھا۔

"جی سر فرمائیے....." ہیڈ ویٹر ان سے آرڈر لے رہا تھا انہوں نے شام کی چائے کا خاصا اہتمام کروا لیا تھا۔ دائم نے احتیاطاً کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر ٹیبل کے نیچے رکھ کر پھر سے نوٹ گنے پورے پندرہ ہزار تھے' کل ہی بابا نے جیب خرچ دیا تھا۔

ویٹر پندرہ منٹ کا وقت دے کر جا چکا تھا اور اب شاہ میر دائم کو دیکھ رہے تھے۔

"گن لیے نوٹ؟ ویسے یہ کام گاڑی میں تم پہلے بھی کر چکے تھے پھر ضرورت کیوں محسوس کی؟"

"اس لیے کہ میرے ساتھ ایک بہت ہی فن کار آدمی بیٹھا ہے۔ میں نے سوچا کیا پتا۔"

اب شاہ میر زور سے قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھیں تک ہنسنے لگتی تھیں۔

"آپ ہنستے رہا کریں شاہ میر....." وہ بے ساختہ بولا اور شاہ میر شرمانے کی اداکاری کرنے لگے۔

"ہائیں نظر نہ لگا دینا بچے کو۔ ویسے ہی میری ماں کا خیال ہے' میرا خون بڑا ہلکا ہے۔"

"بس کر دیں' کوئی نہیں خوب صورت آپ جو آپ کو نظر لگے گی۔"

انہوں نے گھور کے دیکھا اور اسٹائل سے بولے "نظر نظر کی بات ہے۔ ماں کی نظر سے دیکھ' دنیا کا سب سے خوب صورت انسان لگوں گا۔"

"بس کر دیں خود ستائشی کی اس مہم کو' اس کے لیے دادو ہی بہت ہیں' پتا نہیں کیا نظر آتا ہے انہیں آپ میں۔"

وہ ہولے سے مسکرائے پھر آہستگی سے بولے۔

"میں ابھی آیا....." اور اٹھ کر ایک دم غائب ہو گئے۔ ویٹر آرڈر لگا رہا تھا' دائم نے کچھ دیر تو ان کا انتظار کیا پھر آہستگی سے اٹھا۔ ان کا والٹ اور موبائل ٹیبل پر ہی تھا' یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ آرڈر چھوڑ کر نہیں اٹھے۔

دائم نے شاہ میر کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی تھی' پھر وہ نظر آ گئے۔ وہ ایک ویٹر کا ہاتھ تھامے ہوئے اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے' ہولے ہولے اس کے ہاتھ کی اوپری سطح کو دلاسے اور ڈھارس سے سہلا رہے تھے۔

وہ اوٹ میں ہو گیا تبھی وہاں سے ایک ویٹر گزرا

"سنیے یہ ویٹر کون ہے؟"

"جی! ویٹر ہے....." سامنے کھڑا شخص بھی ایک کائیاں تھا۔ دائم نے گلا کھنکارا۔

"اس کا نام' اور یہ کیسا آدمی ہے؟"

اس نے دائم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر قدرے تلخی سے بولا "شمال خان ہے اور آپ جیسے حسن پرست افراد کو ڈیل سستے داموں فراہم کرتا ہے۔"

"ڈیل....." دائم کے منہ کا مزا خراب ہو گیا۔ یہ شاہ میر کن چکروں میں پڑ گئے۔ کیا واقعی اب وہ اخلاقی قدروں کو ٹھوکر مار کر لذت کے راستے پر چل پڑے تھے مگر یہ تو گناہ کا راستہ تھا اور شاہ میر کو اس نے بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا۔

دائم ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا' پانچ منٹ بعد شاہ میر واپس لوٹے۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

"گرمی بہت ہے' ٹھنڈے یخ پانی سے منہ دھویا ہے تو تھوڑا سکون ملا ہے۔"

"گرمی اور یہاں....." دائم کو یکدم وہ برے لگنے لگے تھے۔ اے سی کی ٹھنڈک میں گرمی کی بات نہایت احمقانہ تھی' مگر وہ کر رہے تھے۔ دائم نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

"آج رات آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"آج ایک دوست کی بہن کی مایوں ہے' وہاں جانا ہے۔"

"ایک اور جھوٹ....." دائم نے غصے کا گھونٹ پیا' ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ اس معصومیت کے پیچھے چھپے چہرے کو سب کے سامنے ظاہر کر دے اور پھر اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال کر ان سے ہر تعلق توڑ لے۔

"کس پر اتنا غصہ کھا رہے ہو؟ دیکھو تمہارا گلابی رنگ جل جائے گا تو مہو تمہیں دیکھے گی بھی نہیں۔"

مہو کے نام پر ہمیشہ دائم کے ہونٹ مسکراہٹ کو چھو جاتے تھے مگر آج اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

"خیر ہے یار رہا بل میں ہی پے کروں گا تو پریشان کیوں ہے؟"

"مجھے آپ کے ساتھ چائے نہیں پینا۔" وہ ایک دم اکھڑ گیا تھا۔

شاہ میر نے یکدم اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "چل اس زیادہ ڈرامے نہ کر' پی لے چائے۔" ان کے چھوتے ہی اس کا غصہ.....

وہ ان کے ہاتھ لگتے ہی جانے کہاں چلا گیا تھا۔ "کیا شاہ میر کو کوئی جادو آتا ہے؟" دائم نے سوچا وہ اس کے لیے چائے بنانے لگے "آج چائے میں ایک چمچ شکر زیادہ ڈال رہا ہوں تاکہ تیرے من کی کڑواہٹ کم ہو جائے۔"

وہ کچھ نہیں بولا خاموشی سے سینڈوچ کھانے لگا۔

"اماں کہتی ہیں' جس کا من سچا ہو' اس کی مرادیں بڑی پوری ہوتی ہیں۔" وہ ترنگ میں بولے اور دائم کو کہنے لگے' ویٹر۔ اس کی شرارتیں اور شاہ میر کی محبت

"میرا دل چاہتا ہے آج تیز بارش ہو۔ تیرے ساتھ بارش میں بھیگے ہوئے کتنے دن ہو گئے ناں۔"

"میرے ساتھ بارش میں بھیگنے کا بڑا شوق ہے آپ کو؟" اس نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ لیا۔ وہ مسکرانے لگے۔

"تجھے یاد ہے' جب تو کانونٹ سے چھٹی پر آیا کرتا تھا تو میں گرمیوں میں تیز دھوپ میں کیسے کیسے بارش کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ مجھے بارش بھی اپنی گرل فرینڈ لگتی تھی' اس زمانے میں تو شمع باجی اور آصفہ باجی کی طرح وہ میری سہیلی ہوتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا میں سارا دن ساری رات بارش میں بھیگتا رہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اچھا لگتا تھا ایسا کرنا۔"

"مگر کیا تب آپ کی دعاؤں پر بارش ہو جاتی تھی؟" وہ ابھی بھی اکھڑ تھا۔

مگر وہ توجہ دیے بغیر بولے "ہاں کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی' مگر تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میرے ساتھ کبھی بارش انجوائے نہیں کی ہو۔"

"مجھے بارش اچھی نہیں لگتی۔" دائم نے سرسری سا کہا۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئے اور پھر بولے۔

"یعنی تجھے میں اچھا نہیں لگتا' مگر یہ اچانک اتنا بدلاؤ کیوں؟"

"کچھ چیزیں بس اچانک ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں جیسے..... جیسے....."

"جیسے اچانک ہونے والی بارش۔" وہ ایک زوردار خوشی بھری قلقاری مار کر بولے۔ دائم نے گلاس ونڈو سے دیکھا' باہر واقعی بارش ہونے لگی تھی۔

"چل نا! بارش میں بھیگتے ہیں۔" وہ بل ادا کر کے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے' دائم ان کے ساتھ کھنچا پھر رہا

تھا، پھر وہ ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کھڑے تھے۔

"گاڑی میں نہیں جارہے۔ میں نے شاہ زین بھائی کے بیٹے کو بلا لیا ہے، وہ گاڑی گھر لے جائے گا۔"

"تو ہم یہاں شہباز کے آنے تک کھڑے رہیں گے۔" اسے غصہ آگیا تھا ان کی اس لاپروائی پر۔

"نہیں، میری گاڑی کی ایک چابی شہباز کے پاس بھی ہے وہ خود ہینڈل کرلے گا۔"

انہیں کسی بھی بات سے پریشانی نہیں ہوتی تھی، مگر اسے ہورہی تھی "آپ اس سترہ سال کے بچے کو بلا کر یہ گاڑی ہینڈل کرنے کو کہہ رہے ہیں، اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو؟"

"کبھی اچھا بھی سوچ لیا کر۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے میری گاڑی استعمال کر کر کے اب اس کا ہاتھ بہت رواں ہو گیا ہے۔" انہوں نے دائم کے اس خدشے کو بھی رد کر دیا تو اس نے ایک نئی بات نکالی "رات کے آٹھ بج رہے ہیں اگر راستے میں ٹریفک پولیس نے پریشان کر دیا تو......"

"نہیں کرے گا میرا نام ہی کافی ہے۔"

"آپ کوئی پرائم منسٹر ہیں۔ امریکن صدر کے چچیرے بھائی لگتے ہیں جو آپ کا نام ہی کافی ہے۔"

"ہائے توبہ ہے دائم! میرا رنگ گندمی ہے، کالا نہیں کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو۔" وہ اسے بالکل خاطر میں نہیں لا رہے تھے اور دائم کو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"پکوڑے کھائیں......" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، وہ ایک نئی فرمائش اٹھا لائے۔

"آپ کا پیٹ ہے یا ہائی کورٹ کا دفتر؟" وہ ہنسنے لگے، پھر اثر لیے بغیر وہ سڑک کنارے شیڈ کے نیچے کھڑے پکوڑوں کا آرڈر دے رہے تھے۔

"پودینے کی چٹنی زیادہ ڈال کے دینا۔"

"آپ کی ساری عادتیں لڑکیوں والی ہیں، خوامخواہ آپ کو شاہ میر بنا دیا اللہ جی نے۔" وہ پھر ہنسنا شروع ہو گئے۔ انہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ زبردستی اسے بھی کھلا رہے تھے، پکوڑے ختم ہو گئے تھے اور اب وہ چٹنی کے گھونٹ لے رہے تھے۔

"خدا کا خوف کریں، سینہ جل جائے گا آپ کا۔" مگر سنتا کون! وہ چٹنی کے بعد ہاہا کر کے چٹنی کی تیزی سے پریشان تھے۔ "آئس کریم کھالیں؟" دائم نے جل کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"گڈ آئیڈیا، چلو اسی لین میں پشاوری آئس کریم پارلر ہے، وہاں دو گھڑی بیٹھ کر آئس کریم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

"دو گھڑی تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے میں سالوں بعد آپ سے ملتا ہوں، روز ہوتا ہوں آپ کے ساتھ یار! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"کچھ نہیں، مگر ایک بات یاد رکھنا جو آپ کے ساتھ روز ہو، آپ کے شب و روز میں گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح شامل ہو، ضروری نہیں وہ واقعی دل سے بھی آپ کے ساتھ ہو آپ کے پاس ہو، کیا پتا وہ صرف آپ کے ساتھ یونہی گھسٹتا پھر رہا ہو۔"

دائم کو یکدم کچھ عجیب سا لگا مگر پھر وہ کچھ نہیں بولے تھے خاموشی سے آئس کریم ختم کر کے اٹھے تھے اور آٹو روک کر آٹو والے کو گھر کا پتا سمجھانے لگے۔

"آپ میرے ساتھ نہیں چل رہے؟"

دائم کو لگا، وہ خفا ہو گئے ہیں اس کے رویے پر، مگر انہوں نے اس کا گال چھو کر کہا تھا۔

"پے منٹ کر چکا ہوں، یہ تمہیں آسانی سے گھر پہنچا دے گا۔" لمحہ بھر رک کر کے پھر آہستگی سے بولے۔

"اتنی دیر برداشت کرنے کا شکریہ میری جان!"

اب ان کی پشت تھی اس کی طرف۔

"آپ نہیں چلیں گے گھر؟" وہ مڑے بغیر بلند آواز میں بولے۔

"نہیں، مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ بابا سے کہہ دینا، تھوڑی دیر ہو جائے گی آج۔" آٹو کی تیز آواز اور شاہ میر کا ناقابل فہم رویہ، دائم نے کچھ دیر تو سوچا، مگر پھر ساری توجہ گھر پر لگا دی، مہر النساء کی آٹھ دس مس کالز وہ دیکھ چکا تھا، اس لیے اسے منانے کے لیے لفظ جوڑ رہا تھا۔



☼ ☼ ☼

وہ تیز قدموں سے بارش میں بھیگتے ہوئے جارہے تھے، جب بہت اچانک ان کے قریب ایک کار آکر رکی پھر، جو شکل ان کو نظر آئی تھی اسے دیکھ کر وہ جی جان سے جل گئے۔

"اتنی بارش میں کہاں گھومتے پھر رہے ہو، تمہیں پتا بھی ہے کیا وقت ہو رہا ہے اور یہ کراچی کی بارش ہے، اتنا پانی جمع ہے سڑکوں پر، یہاں مین ہالز کھلے پڑے رہتے ہیں اور......"

"پلیز زمان بھیا! کوئی نیوز جیو کے لیے بھی رہنے دیں۔" لمحہ بھر رک کے پھر مزید بولے۔

"کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

"نہیں مجھے اپنی گاڑی خراب نہیں کروانا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں آٹو کا کرایہ دے سکتا ہوں۔"

"چلیے نکالیے کرایہ......" وہ یکدم ہاتھ پھیلا کر شرارت سے بولے۔

اور شاہ زمان بڑبڑاتے ہوئے والٹ نکالنے لگے "سو روپے کافی ہیں؟"

"سو روپے میں کیا ہو گا بھیا، پانچ سو روپے تو دیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولے۔

"تم کیا کرتے ہو اتنے پیسوں کا؟ جب دیکھو ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوتے ہو۔"

وہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگے تھے پھر ہنس کر بولے "آج کل وزیروں سفیروں کے ساتھ بیٹھنے لگا ہوں اس لیے ہاتھ کھلا، زبان خاموش ہو گئی ہے۔"

"خوش فہمی ہے کہ تم خاموشی کا سمبل ہو۔" شاہ زمان نے نخوت سے کہا اور وہ اثر لیے بغیر بولے۔

"بدگمانی کرنے سے بہتر ہے، خوش گمانی پال لی جائے۔ ویسے سب بھائیوں میں آپ مجھے بہت ڈارلنگ بھائی لگتے ہیں۔"

شاہ زمان کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ کوئی غصے میں ہو اور آپ اس کی تعریف کر دیں تو وہ ہکا بکا رہ ہی جاتا ہے۔

انہوں نے کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھا لی اور وہ اسی طرح سڑک پر بارش میں نہاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ٹریفک بری طرح جام تھا، یہی وجہ تھی وہ رک کر، ٹھہر کر، ٹہل کر، کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ ہی گئے۔

"تم کہاں نکلے ہوئے تھے؟ دائم تو کب کا گھر آچکا ہے۔" نیلوفر بھابھی نے ان کے لتے لیے، وہ گیٹ سے آگے آنے کے بجائے چوکیدار کی کرسی پر ہی بیٹھ گئے۔

"سانس تو لینے دیں بھابھی ماں! ساری انفارمیشن کا تبادلہ ہو گا، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

چوکیدار شیڈ کے نیچے کھڑا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہے تھے، گھر کی باقی عورتیں جا چکی تھیں، صرف نیلوفر بھابھی کھڑی تھیں یا تازہ اطلاع پر اماں جان بھاگی ہوئی آئی تھیں۔

"کتنا بھیگ گیا ہے، شاہ میر چل جلدی سے کپڑے بدل لے ورنہ بیمار پڑ جائے گا۔" اماں کھینچ کھانچ کر انہیں اندر لے گئی تھیں وہ تولیے سے اس کے بال خشک کرتی رہیں۔ نیلوفر بھابھی ان کا کرتا اور ٹراؤزر اٹھا لائیں۔

"تمہیں پتا ہے تم بیمار پڑ جاتے ہو بارش میں بھیگ کر، پھر بھی بارشیں انجوائے کرنا ہیں۔"

نیلوفر بھابھی بڑبڑائیں اور وہ اماں کے واش روم میں کپڑے لے کر گھس گئے۔ پانچ منٹ بعد باہر تھے اور اماں چائے کا بڑا مگ ان کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

وہ چائے پینے کا ارادہ باندھ ہی رہے تھے کہ نیلوفر بھابھی ان کے لیے پیناڈول لے آئیں "یہ کھالو تاکہ طبیعت خراب نہ ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے گولیاں نگل گئے اور دادی اماں کے کمرے میں کھلنے والی باغ کی طرف والی کھڑکی سے جھانکتے دائم کو ان کی اتنی خاطر مدارات دیکھ کر برا لگا۔

"پتا نہیں ان سب کو کیا دکھتا ہے شاہ میر میں......" اس نے بہت الگ طرح سے آج شاہ میر کے بارے میں سوچا تھا۔ یہ وہ سوچ تھی جو اس گھر میں بہت

سارے ذہنوں میں پیدا ہو جاتی تھی۔

وہ باہر کوریڈور میں کرسی پر بیٹھا بارش کو برستا دیکھ رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ میر کو کچھ دیر کے لیے نہ دیکھے۔ مہو سے ابھی ابھی اس کی بات ہوئی تھی اور وہ اس پر غصے سے الٹ پڑی تھی کہ شاہ میر نے اس کی آواز سن کر فون کاٹا تھا اور یہ کہ وہ کون ہوتے ہیں ظالم سماج بننے والے؟ اس نے کہا بھی وہ صرف اس کے چاچو ہی نہیں اس کے دوست بھی ہیں مگر اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

"دوست محبوب کی جگہ نہیں لے سکتا۔" آخری فقرہ اس کا یہی تھا اور وہ اس وقت بھی مہو کے اسی فقرے کے ساتھ اکیلا بیٹھا تھا۔ دل بے چین تھا۔ ہوٹل والی ادھوری اسٹوری اس کے دماغ میں اودھم مچائے پھر رہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"یہ آج کل تم پرانی فلموں کی سوتیلی ماں کی طرح ہونٹ کیوں کاٹتے رہتے ہو۔"

"مجھے آپ سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا۔" اس نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"خیر ہے' یہ نصیب دشمناں آج موسم اتنا گرم کیوں ہے؟"

"آپ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جب آپ کا دل چاہے میں بات کروں' آپ کا دل چاہے میں ہنسوں' قہقہے لگاؤں میں کوئی جوکر ہوں یا کوئی کھلونا؟"

شاہ میر سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتے رہے پھر یکدم اپنے قدموں پر یوٹرن لے کر وہاں سے غائب ہو گئے۔ دائم کہنے کو تو مہو کے غصے میں انہیں برا بھلا کہہ گیا' مگر اب ابال کم ہونے پر اسے لگ رہا تھا وہ بہت زیادہ ہی کر گیا تھا ان کے ساتھ۔

پھر دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر بھی وہ نظر نہیں آئے تو اسے حیرت ہوئی' رات کو وہ اس وقت کمرے میں آئے تھے جب وہ سو گیا تھا اور جب اٹھا تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔

"شاہ میر کہاں ہیں....؟" اس نے دادی جان سے پوچھا۔

وہ فکر مندی بولیں "پتا نہیں کل سے کیا ہو گیا ہے' کچھ بول ہی نہیں رہا بس خاموشی سے آفس کے کاموں میں لگا ہوا ہے۔"

"آؤٹ ہاؤس میں ہیں کیا؟" شاہ میر اور آفس کے کام۔ اسے حیرت ہوئی' دادی نے آہستگی سے سر ہلایا اور وہ ناشتے کی ٹرے لے کر آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دادو جان شاہ میر کو کچھ ڈکٹیٹ کروا رہے تھے اور وہ ان کے لفظوں کو ای میل میں ڈھال رہے تھے۔

"السلام علیکم دادو!" دائم نے با آواز بلند سلام کیا۔ شاہ میر نے ذرا بھی توجہ نہ دی تو اسے دھکا سا لگا۔

"کیا آپ بہت مصروف ہیں شاہ میر؟"

"جی بابا! وہ سائن اینڈ سائن کے سلسلے میں بھی آپ کچھ کہہ رہے تھے' انہیں بھی ای میل کرنا ہے؟"

"نہیں' میری ان سے کل بات ہو گئی ہے۔ وہ معاملہ حل ہو گیا ہے۔ پے منٹ میں کچھ ڈیلے تھا۔ اس کا چیک اپروو ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا! پھر میں چلتا ہوں' مجھے آج کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ رات کو بھی بہت دیر ہو جائے گی۔"

دائم کو پھر رات اور دیر جیسے جملوں نے ڈنک مارا تھا۔

"آپ کبھی نہیں سدھر سکتے۔ پتا نہیں اچھے بھلے راستوں پر چلتے چلتے کہاں کی خاک چھاننے نکل پڑے ہیں۔" وہ دل میں سوچتا ہوا ناشتے کی ٹرے واپس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اکیلے ناشتے کی اسے عادت تھی مگر شاہ میر کے ہوتے ہوئے اکیلے ناشتہ کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا اور وہ خود بھی اس کے بغیر ناشتہ نہیں کر سکتے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے' میرا ایک ٹرسٹ ہو جس کے وسیلے سے بھوکے لوگ تینوں وقت کھانا کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔ اکیلے ناشتہ کرنا بڑا عجیب لگتا ہے۔" وہ جس سے چڑ رہا تھا' اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔

اس نے صرف ایک سلائس کھایا تھا اور ٹیرس پر آ کر بیٹھ گیا۔ بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بہت مٹھاس بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔

"عائشہ باجی! آپ اتنی اچانک۔"

"بس ہر بار سوچتی تھی تم سے ملنے کا' مگر اس بار سنا تم آئے ہو تو میں نے کہہ دیا' ایک ہفتے رکوں گی سو ماموں جان کے گھر آ گئی مگر یہ لیلیٰ مجنوں کی جوڑی ایک ساتھ کیوں نظر نہیں آ رہی؟ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ بہت مصروف رہنے لگا ہے شاہ میر۔"

"پتا نہیں' مجھے بھی یہ اطلاع دادو جان سے ہی ملی ہے آج۔"

"کیا بات ہے' تم اور اس کے ذکر پر اتنے اکھڑے اکھڑے سے ہو۔"

"بس کچھ نہیں عائشہ باجی! ایویں تھوڑا بور ہو رہا تھا۔"

"واہ! تم اور بور ہونے لگے۔ شاہ میر اور تمہارے قصے تو آج تک ہم لوگ مزے سے دوہراتے ہیں۔ سارے بچے تم دونوں کے دیوانے ہیں بھئی۔"

وہ دھیمے سے مسکرانے لگا اور وہ ہنس کر بولیں "آصفہ کی شادی ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی۔ سب کتنا حیران پریشان تھے اور شاہ میر دس برس کے ہو کر بھی کیسے کمپوزڈ تھے۔"

وہ ہنس پڑا۔ یکدم اسے اتنی پرانی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ آصفہ باجی کی شادی کی اپنے تئیں تحقیقات کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سوال کرتے پھرتے' رشتے میں نقص نکالتے۔ بڑوں کے سامنے تو چپ رہتے مگر آصفہ کو کہتے آصفہ باجی' مت کرنا' لڑکا کنجوس ہے۔ کبھی اس کی باتوں سے اندازہ لگا کر کہتے' لڑکا اچھا نہیں ہے' اس کی آنکھیں دائیں بائیں چک پھیریاں لیتی ہیں ایسے لڑکے تیز اور دل پھینک ہوتے ہیں۔

"ہاں.... سب عمر سے بڑی باتوں پر ہکا بکا رہ جاتے مگر تحقیقات میں جب کوئی نقص معلوم ہوتا' ان کے کہے ہوئے لفظوں سے انیس بیس کا فرق ہی ہوتا۔

پھر آمنہ باجی کی شادی طے ہوئی اور انہوں نے وہ ہنگامہ کیا کہ الاماں میوزک ڈانس یہاں تک کہ شادیوں کی وہ جان بن گئے جہاں باقی لڑکوں کا داخلہ ممنوع ہوتا' شاہ میر دھرے ہوتے' جب آصفہ باجی کی شادی ہوئی تو اس وقت شاہ میر کالج میں تھے' انہوں نے صرف آپس میں تین دن ڈھولکی کی قرار داد پاس کی' بات بابا جان تک پہنچ گئی تو وہ تپ گئے۔

"شاہ عالم کے گھرانے کے لڑکے گانا بجانا نہیں کرتے۔"

وہ بابا جان کے سر ہو گئے۔ "پلیز بابا جان! تین دن تک بھول جائیں ناں' آپ شاہ عالم ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟ میں یہ بھول جاؤں کہ میں شاہ عالم ہوں تو پھر کیا یاد رکھوں؟"

"آپ خود کو کشور داجی سمجھنے لگیں۔ پلیز بابا جان! یہ نیا زمانہ ہے' کرنے دیں ناں' بے چاری لڑکیاں بھی ان کے اچھے لگنے کے یہی تو دو تین دن ہوتے ہیں' پھر تو چلی جاتی ہیں یہ.... عائشہ باجی اور آصفہ باجی کی طرح پھر تھوڑی کر سکتی ہیں اپنی من مرضی....." بابا جان نے ان کی صورت دیکھی' لفظوں کا چناؤ دیکھا اور کہا۔

"او کے! مگر ڈیک ہلکی آواز میں بجے گا۔"

یوں شادی کے وہ لمحات بے حد یادگار ہو گئے تھے۔ وہ ساری ساری رات باتیں کرتے۔ اماں جان' چاچی جی آ کر کہتیں۔

"بچی کو آرام کرنے دو....." اور وہ صاف کہہ دیتے۔

"پلیز اماں جی! یہ ہی دن تو ہیں جب ہم ان کے پاس اتنے حق سے بیٹھے ہیں' پھر تو بہنوئی صاحب ہوں گے اور ان کی جی حضوری۔"

"آصفہ باجی چہرہ ڈھانکے ہنسے جاتیں یہ خاموش عہد تھا کہ وہ مایوں کے بعد چہرہ دیکھنے کی ضد نہیں کریں گے۔ سب کزنز اور بہن بھائیوں نے اس خاموش عہد پر

دستخط کر رکھے تھے۔ وہ سب باتوں میں مگن رہتے، شاہ میر آصفہ باجی کے بعد اب عائشہ باجی کی خدمت داری کر رہے تھے، جو فرمائش منہ سے نکلتی "فوراً" پوری ہونے لگی تھی۔ عائشہ باجی بھی حیران تھیں۔

وہ اتنے دھڑلے سے خرچ کر رہے تھے کہ دائم کو شبہ ہوا کہیں شاہ میر آج کل ہاتھ کی صفائی تو نہیں دکھانے لگے، دل کو تسلی نہ ہوئی تو ان کی غیر موجودگی میں اس نے ان کی الماری کھنگال ڈالی۔ تب وہ ہکا بکا رہ گیا آمنہ باجی، عائشہ اور شمع باجی کے نام کے منی باکس رکھے تھے، خاص ٹیگ کیے ہوئے اور ہر باکس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے یہ رقم جمع کر رہے تھے اور اب شادی کے بعد بھی یہ باکسز خالی نہیں ہوئے تھے۔

"کیوں شادی کے بعد آپ پیسے کیوں جمع کرتے ہیں؟" رات گئے اس نے پوچھا تو وہ مسکرا کر دوستانہ بولے۔

"بہنیں ہیں یار! اتنا سادل ہوتا ہے، اتنی سی بات پر خوش ہو جانے اور اتنی سی بات پر روٹھ جانے والا، بڑی نرگسی طبیعت ہوتی ہے ان کی۔ اگر کوئی ان کی پروا کرنے لگے، بھلے صرف لفظی یا پھر میری طرح لفظی اور عملی دونوں تو ان کے اندر کا جو مان، بھرم کا پندار ہے نا، اونچا رہتا ہے اور جب یہ اونچا رہتا ہے تو سمجھو لڑکی کے اندر کا مورال بھی اونچا رہتا ہے۔ اعتماد اعتبار سب کچھ ان کے لہجے سے، رویے سے چھلکیاں مارتا ہے۔ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ ان کے اندر کی لڑکی ہر وقت مسکراتی رہے۔"

اتنا گہرا سوچتے ہیں یہ شاہ میر۔ اس نے آج پھر سے نئی طرح سے سوچا تھا اور اپنی خفگی بہت عجیب سی لگی تھی۔ عائشہ باجی جانے کیا دنیا جہاں کی باتیں کر رہی تھیں اور وہ ان کی چھوٹی بیٹی کو گود میں لیے ماضی کو کھنگال رہا تھا۔ ایک شخص جو دنیا کی پروا، رشتوں کی پروا سے افضل نہیں سمجھتا، وہ کیسے کرپٹ ہو سکتا ہے۔ دل نے مشورہ دیا اور اس نے ایک بار پھر سے شاہ میر کی تلاش شروع کی لیکن جب تک وہ آفس پہنچا، وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔

"میں کچھ بھی کہہ کر منالوں گا انہیں۔ میں غلط تھا۔ ہر رشتے کی قدر حیثیت، دوسرے رشتے سے الگ سہی، مگر ضروری ہوتی ہے۔ ایک رشتے کو نبھانے کے لیے پہلے کے کسی رشتے کو گنوا دینا عقلمندی تو نہیں۔"

وہ سوچے جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا پھر وہ چونک گیا۔

"ہاسپٹل..... کیوں؟" ایک بڑا سا کیوں اس کے اندر ڈنک مارنے لگا۔

"ہو گا کوئی جان پہچان کا بندہ ایڈمٹ، شاہ میر کو بھی تو ہر کسی سے خلوص اور محبت کی پینگیں بڑھانے کی عادت ہے، ہر اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شخص سے انہیں انسیت ہو جاتی ہے۔"

وہ گاڑی سے باہر نکلا اور فاصلے سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔

یہاں تک کہ انہوں نے کوریڈور میں چلتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو دیکھ کر پکارا تھا۔

"ڈاکٹر سعید! میں شاہ میر، میری آپ سے اپنے کیس کے سلسلے میں بات ہوئی تھی۔"

"او، ہاں! والو سرجری کا کیس، جی جی میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ چل کر میرے روم میں بیٹھیے۔ میں بس پندرہ منٹ میں آپ کے پاس آتا ہوں۔"

دائم ٹھنڈے کوریڈور میں یکدم برف ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ مارچری میں پڑی ہوئی کوئی لاش تھی جس کا پوسٹ مارٹم ہونے جا رہا تھا۔

مگر لاش کو تکلیف کا احساس کب ہوتا ہے، اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تھا۔

"سوری سر! اسموکنگ الاؤ نہیں ہسپتال میں۔" اس کے کپکپاتے ہاتھ جو لائٹر سے شعلہ دکھانے والے تھے، یکدم بے جان ہو کر پھر سے گر گئے تھے۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور اپنی کار کے کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر

اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے مگر آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

گاڑی سی سائیڈ پر لے گیا تھا پھر پتھر پر بیٹھ کر کتنے ہی منظر اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے تھے۔ وہ ماضی میں داخل ہوا تھا اور شاہ میر اس کے لیے لڑ رہے تھے۔

"نہیں! اگر دائم شامل نہیں ہو گا کرکٹ میں تو میں بھی نہیں کھیلوں گا۔"

"چاچو! دائم بھیا کی بیٹنگ، فیلڈنگ، بولنگ کچھ بھی نہیں اچھی۔ آپ بلاوجہ ضد کرتے ہیں۔"

"نہ ہو کچھ بھی اچھا، مگر یہ میرا شیر ہے جہاں میں ہوں گا وہاں یہ ہو گا جہاں یہ ہو گا وہاں آف کورس میں ہوں گا۔"

"نہیں چاچو! آپ کچھ بھی کہہ لیں ہم دائم بھائی کو نہیں کھلائیں گے۔ ایک تو پہلے یہ کھیلتے ہیں پھر جب باری آنی پڑتی ہے تو صاف بچ جاتے ہیں۔ الٹی ہم سب کی شکایتیں لگاتے ہیں دادو جان اور بی جان کو۔"

"تو کیا ہوا یار! بچہ بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔"

"کیسے؟ آپ کو یہ کیسے پتا یہ سیاست دان بنیں گے؟" ایک بچہ پوچھتا اور وہ ہنس کر کہتے۔

"ایک کامیاب سیاست دان یا بیورو کریٹ وہی ہوتا ہے، جب گنگا بہہ رہی ہو تو دونوں ہاتھ دھو رہا ہے اور جب پکڑ دھکڑ شروع ہو تو مسکین بن کر اگلی حکومت میں سیٹ لینے کے لیے سارے پرانے جرائم اور کرپشن کے پلندے دوسروں پر ڈال دے۔"

"ہاں تو پھر بھی آپ کہتے ہیں یہ قابل اعتبار ہیں۔"

"ہاں یار! اپنا یار ہے، جیسا بھی ہے، قبول ہے۔"

اس نے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔ وہ ہمیشہ ہی ہر موقعے پر انہیں بیچ میں چھوڑ کر خود الگ ہو جاتا تھا، کچھ بی جان اور دادو جان کا ڈر اور کچھ اپنی سخت گیر مما جان کا خوف، مگر شاہ میر مجال ہے کبھی ماتھے پر شکن لائے ہوں۔

اسے کالج کا دور یاد آنے لگا جب شاہ میر نے لڑکیوں میں مقبول رہنے کے لیے پامسٹری سیکھی تھی، بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی، پھر اسے وہ دن یاد آیا جب ایک بہت ذہین طالبہ کے نوٹس کی دھوم پر اس نے ان سے کہا تھا۔

"مجھ سے محبت کرتے ہیں تو اس کے نوٹس لا کر دیں۔ میں اپنی حیثیت اس کالج میں بہت شان دار چاہتا ہوں۔"

اور شاہ میر دو ہفتے تک اس لڑکی سے مل بیٹھے تھے، پھر وہ اسائنمنٹ کے لیے صرف منہ ہلا دیتا اور اس کا اسائنمنٹ بغیر محنت کے وقت پر تیار ہوتا، ہاں یہ اور بات تھی کہ وہ اس سے دور ہو گئے تھے۔ ان کا موبائل بزی آتا، راتوں کو بھی وہ دیر سے آتے۔

"محبت کا چکر ہے۔" اس نے جان کر انیس بھائی کے سامنے کہا، جانتا تھا وہ یہ خبر پورے گھر میں نشر کر دیں گے، مگر بات آگے نہیں بڑھی تھی۔

"کالج میں، یونیورسٹی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ شاہ میر بہت سمجھ دار ہیں۔"

"ہو گا، مگر میں اس آوارہ لڑکے کے ساتھ اپنے بیٹے کو مزید نہیں رکھ سکتی۔ مجھے شاہ بہروز کی بات ماننا ہی نہیں چاہیے تھی او لیول کے بعد مجھے اسے یہاں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بس طے ہو گیا۔ دائم اگلے ہفتے سے پھر اسلام آباد جا رہا ہے، اپنے ماموں کے گھر، وہ جتنا شاہ میر سے دور رہے گا اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔"

"مت جاؤ ناں!" وہ کمرے میں آیا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہا۔

"یہ ماما کا فیصلہ ہے شاہ میر! مجھے جانا پڑے گا۔"

"اگر تم کہہ دو کہ تم نہیں جانا چاہتے تو بھابھی ضد نہیں کر سکیں گی۔" انہوں نے اسے گھیرا اور دائم بہروز کی آنکھوں میں چھبن سے "مہو" کا سراپا گھوم گیا۔ وہ جس عمر میں تھا، اس میں انسان فطرتاً "نہ بھی ہو تب بھی مصلحتاً" تھوڑا خود غرض ہو ہی جاتا ہے۔

"میں تمہارے بغیر کیا کروں گا کالج میں۔"

"کیوں کالج میں تو آپ کی لڑکیوں میں بڑی دھوم ہے، پھر وہ نئی لڑکی رانیہ بھی تو ہے۔"

"میں نہیں جانتا کسی رانیہ شانیہ کو۔ میں اس کے پاس صرف تمہارے نوٹس لینے کے لیے گیا تھا مگر بدتمیز نے صاف منع کر دیا۔"
"پھر وہ سال بھر نوٹس کہاں سے آتے رہے؟" دائم حیران ہوا تھا مگر شاہ میر کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے۔
"تیرے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں میری جان۔" ہر معاملے' ہر فرمائش پر ان کا یہی جواب ہوتا تھا اور اب وہ کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے تو اس کے اندر یہ فقرہ کسی شرارتی بچے کی طرح دوڑتا پھر رہا تھا۔
"بہت تھک گیا ہوں یار سونے دے۔" یہ وہ جملہ تھا جو پھر اس نے سارا سال سنا تھا اور پھر ان کی تھرڈ ڈویژن آنے پر گھر میں کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔
"پڑھنے جاتے ہو یا گھاس کھودنے؟"
"کوک کی بوتلیں جمع کرنے......" وہ شاہ زمان چاچو کی بات کا اثر لیے بغیر بولے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"کوک کی بوتلیں جمع کرنے کا مطلب؟ دائم! یہ تمہارے چاچو کیا کرتے تھے کالج میں؟"
"چاچو! کوک کی ایک بوتل کینٹین میں دینے کی ایک معقول رقم ملتی ہے اسٹوڈنٹ کو۔"
"یہ کالج کی انتظامیہ ہے یا بھٹیار خانہ؟ بچے اس لیے جاتے ہیں یا پڑھنے......" شاہ زین بھی غصے سے بڑبڑائے اور وہ مسکینی سے بولا۔
"چاچو! یہ انتظامیہ کا قصور نہیں۔ یہ تو ایک اوپن آفر ہے۔ جو بچے اضافی رقم جمع کرنا چاہتے ہیں' وہ کرتے ہیں وقت کا ضیاع۔"
"مگر شاہ میر! تم تو ان بچوں کے لیے رول ماڈل ہو ناں' پھر تم سے یہ چوک کیوں ہوئی؟"
"میرا پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔" ایک نپا تلا جواب آیا۔
"پھر کس چیز میں دل لگتا ہے؟" دادو جان نے تپ کر کہا۔
"مجھے سوشل ورک کا شوق ہے' مجھ سے نہیں ہوتیں یہ پڑھائیاں۔ سوشل ورک کے لیے انسان کا حساس ہونا ضروری ہے اور وہ میں ہوں۔"
"سوشل ورک کوئی کام نہیں ہوتا' اپنے بیوی بچوں کو آگے چل کر کیا کھلاؤ گے سوشل ورک کی بریانی یا سوشل ورک کی شہرتیں؟" شاہ زمان چاچو کا غصہ دیدنی تھا اور شاہ سہروز کو جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔
"تم نے پیپرز میں چیٹنگ بھی کروائی تھی' جس کی وجہ سے اس بار تمہارا ایگزامز میں بیٹھنا بھی ناممکن تھا۔ وہ تو پرنسپل صاحب نے مجھے فون کر لیا اور میں نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔"
"چیٹنگ کیوں کروائی تھی؟" اس پہ سوال سامنے آیا اور شاہ میر کھڑے سے بیٹھ گئے۔
"اپنا جگر پیپر دے رہا تھا' میں نے کہا کوئی پرابلم نہ ہو اسے' اس لیے بوٹیاں بنوائیں اور لگ گیا کام سے۔ اس نے تو منہ نہیں لگایا مگر دوسرے اسٹوڈنٹس نے دلچسپی دکھائی تو میں نے وہ ساری بوٹیاں وہاں چلا دیں' لوگ ایک بوٹی کے سو روپے لے رہے تھے' میں نے پچاس روپے میں دے کر پرافٹ کما لیا اب یہ کوئی بڑی بات ہے؟"
سب بڑے تو ہکا بکا ہوئے ہی تھے' خود دائم بھی حیران رہ گیا تھا۔
"اتنے بزنس مائنڈڈ کب سے ہو گئے شاہ میر۔" کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا' تب شاہ زین چاچو نے کہا۔
"اچھا' تو یہ بوٹی مافیا کا حصہ بننا کون سا سوشل ورک ہے۔"
شاہ میر نے شرارت سے دیکھا "دیکھیے! اتنی بڑی کتاب سے مختصر مواد نکلوانا' مائکرو کروانا' پھر جان پر کھیل کر اسے او بجیکشن تک پہنچانا' سوشل ورک پلس نیکی ہے۔"
"نیکی......" دادو جان کی چیخ نکل گئی تھی۔
"کسی کی مدد کرنا نیکی ہی تو ہے بابا!" رسان سے کہا گیا' اور وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ شاہ میر وہیں بیٹھے رہے' مگر دائم باہر نکلا تھا۔ شاہ سہروز گلہ کر رہے تھے۔
"دیکھ رہے ہیں ناں بابا وہ کتنا بگڑ گیا ہے' اسے اچھے برے' غلط صحیح کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے۔ باقی چھوٹے بچے اس سے کیا سیکھیں گے؟ نیلوفر ٹھیک کہتی ہے' دائم اس کے ساتھ رہا تو یہ بھی بگڑ جائے گا اور میں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے بہت اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔"
دادو جان سر جھکا کر رہ گئے۔ دوسرے دن وہ کالج گیا۔ کالج کا ایک لڑکا شاہ میر سے' بہت زیادہ ریشہ خطمی ہو کر مل رہا تھا۔
"شکریہ شاہ میر! اگر آپ اس چیٹنگ اسکینڈل سے مجھے نہ بچاتے تو میری ماں تو یہ صدمہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی' پتا نہیں کیا سوجھی تھی مجھے شارٹ کٹ مارنے کی۔"
شاہ میر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر نرمی سے بولے "شکریہ تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے' اگر تم مجھے دائم کے نوٹس بنوانے میں ہیلپ نہ کرتے تو میرا جگر اسے پاس نہیں لا سکتا تھا۔"
"کہاں شاہ میر! ساری محنت آپ نے کی تھی' میں نے تو صرف پوائنٹس بتائے تھے' ساری کتابیں کھنگالنا' سب کچھ لکھنا لکھانا' یہ تو ساری آپ کی محنت ہے۔"
دائم کا دماغ ایک دم بھک سے اڑ گیا تھا' مگر آج وہ یہ سب کچھ نہ سنتا تو یہ ساری باتیں ہمیشہ راز رہتیں مگر ان باتوں پر کسی نے یقین نہیں کرنا تھا شاید وہ خود بھی نہ کرتا' یعنی وہ بے چارے اس لیے اس سے دور رہتے تھے' بدیم الفرصت ہوتے یا تھکے ہوئے ہوتے تھے اور اس نے کیا کیا معنی دیے تھے اور وہ بوتلیں جمع کرنے کا قصہ' یکدم اسے کچھ یاد آیا تھا اور وہ ان کی اس کام میں مدد کرنے والے دوست ظفر کے سر ہو گیا تھا۔
"بتائیے ناں ظفر بھائی! شاہ میر بوتلوں کے پیسے کہاں گنواتے ہیں۔"
"وہ بڑا ذہین ہے۔ اس کی کوئی بھی جسمانی یا ذہنی ایکسرسائز فالتو یا وقت کا ضیاع نہیں ہوتی۔"
"پھر بولیے ناں' کیا کرتے ہیں وہ روزان پیسوں کا؟"
ظفر بھائی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولے "میرے پاس ایک منی باکس ہے' شاہ میر روز کے پیسے وہاں جمع کرواتے ہیں' پھر ایسے اسٹوڈنٹس وغیرہ کی مدد کرتے ہیں جنہیں پیسوں کی ضرورت ہو' مگر اس کی جیب اجازت نہ دیتی ہو' وہ کم آمدنی والے گھرانے کے بچوں کو کتابیں اور دیگر چیزیں مہیا کرتے ہیں۔"
"بوتلیں جمع کرنے سے اتنی رقم جمع ہو جاتی ہے؟" اسے حیرت ہوئی۔
"نہیں' شاہ میر اپنی پاکٹ منی کا ایک اچھا خاصا حصہ بھی ڈالتے ہیں' پھر ہم سب دوستوں کا گروپ بھی اس میں حصہ ڈالتا ہے' سو اب تک اچھا خاصا کام کر چکے ہیں۔ اس بار پرنسپل سے مل کر کالج میں ایک پیڑ کے سائے تلے اپنا کیبن بھی لگایا ہے۔ پچھلی کلاسوں سے پرانی کتابیں آدھی قیمت میں لے کر ضرورت مند اسٹوڈنٹس میں تقسیم کرتے ہیں' رجسٹر جرنلز سب کچھ۔"
"اچھا' تب ہی پرنسپل صاحب نے بابا جان کی باتوں پر اتنی جلدی شاہ میر کو معاف کر دیا تھا' ورنہ یہ پرنسپل صاحب بہت ایمان دار اور سخت گیر پرنسپل مشہور تھے۔"
"بابا خوش ہیں کہ یہ ان کی معذرت اور نام کا کمال ہے اور وہ خاموشی سے اپنا کمال دکھا کر ساری لعن طعن خود سہہ کر الگ کھڑے تھے۔ نیکی کیا ہے' اسے کس طرح کرنا چاہیے' یہ صرف شاہ میر جانتے تھے تب ہی تو ان کا داہنا ہاتھ سخاوت کرتا تھا اور بایاں ہاتھ لاعلم رہتا تھا۔ وہ جو ہر وقت ان کے ساتھ ہونے کا دعوے دار تھا' اسے بھی کہاں پتا تھا۔
"میں ہمیشہ شاہ میر کو غلط جج کرتا ہوں۔" اس نے گہرا لمبا سانس کھینچا اور خاموشی سے گھر آ گیا۔ غیر متوقع طور پر شاہ میر اسے ڈریسنگ روم کے سامنے کھڑے ملے' ڈارک براؤن کرتا' سفید شلوار میں ان کا رنگ کھل رہا تھا۔
"کہیں جا رہے ہیں؟" ان کی بڑی بڑی آنکھوں نے اس کے خدوخال کو آشنائی سے چھوا مگر وہ کچھ

بولے نہیں تھے۔

"شاہ میر! ابھی تک خفا ہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور یکدم ہراساں ہو گیا۔

"آپ کو اتنا تیز بخار ہے۔"

"آپ کہیں نہیں جارہے ہیں۔ سنا آپ نے...." اس نے کمرے کو لاک کر دیا تھا مگر وہ آہستگی سے کولہا پوری پہن رہے تھے۔

"اگر آپ نہیں رُکے تو میں دادی جان کو بلا لوں گا۔"

"جاؤ! اپنا یہ شوق بھی پورا کرلو۔" یہ پہلا اور آخری جملہ تھا۔

"آپ مجھے تو لے جاسکتے ہیں ناں۔" وہ نئے سرے سے منّت پر اتر آیا تھا۔

"عین موقع پر ساتھ چھوڑنے والوں اور اعتبار نہ کرنے والوں کو میں کہیں نہیں لے کر جاتا۔"

"آپ کو پتا ہے اگر آپ مجھے ٹینشن دیں گے تو پھر خود بھگتیں گے۔"

یہ اس کا آخری حربہ تھا جو وہ کبھی کبھی ضد پوری کروانے کے لیے اماں جان، بابا جان یا پھوپھو کے سامنے آزماتا تھا بلکہ خود بخود ہو جایا کرتا تھا غصے اور ٹینشن سے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی، بظاہر اس کی طبی کوئی وجہ نہیں تھی، ہزار بار کے ٹیسٹ یہی کہتے تھے مگر اس کے بچپن کا یہ مسئلہ آج تک برقرار تھا۔

شاہ میر کے سامنے ایسا کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی تھی، وہ ہمیشہ ماموں کے گھر رہا تھا اور نیلوفر بھابھی اس کے متعلق کوئی اپ ڈیٹ کسی کو دینا مناسب نہیں سمجھتی تھیں۔ یہ ان کے بیٹے کی کمزوری تھی اور وہ گھر میں اس کمزوری کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

"شاہ میر! آپ اگر اکیلے گئے یا اور کچھ دیر مزید مجھ سے ناراض رہے ناں تو میں مر جاؤں گا۔" اس کا سانس تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ شاہ میر نے دھیرے سے مڑ کے اسے دیکھا وہ بیڈ پر بیٹھے سے یکدم گر گیا تھا، اس کے سانس لینے کی آواز بہت تیز تھی، کیسا غصّہ کہاں کا غصّہ، شاہ میر یکدم بھاگ کر اس کے پاس دوڑے آئے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے پاگل! ابھی تو اچھا بھلا تھا۔" انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اس نے شاہ میر کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔

"آپ ابھی تک خفا ہیں مجھ سے...." اس سے جملے بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے ان کے کندھے پر آنکھیں رگڑی تھیں اور شاہ میر ہونق رہ گئے۔

"بھاڑ میں گئی ناراضی، یہ ہوا کیا ہے؟ بچپن میں اماں جان سے سنا تھا، ضد میں لمبی سانس کھینچ لیتا ہے، نیلا پیلا ہو جاتا ہے مگر اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے تیری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔"

"ہاں، زیادہ اپ ڈیٹ ہو گئی ہے۔" وہ پھیکا سا ہنسا شاہ میر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر درود پڑھنے لگے۔ اس کی دھڑکنیں آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی تھیں پندرہ منٹ بعد وہ بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔

"کوئی ٹیبلٹ لیتے رہے ہو ایسے موقعوں پر؟"

وہ سر ہلا کر ٹیبلٹ نکال کر دکھانے لگا تھا۔

"یہ تو اعصاب کو ری لیکس کرنے کی ٹیبلیٹ ہے، بہت مائنر M.G کی ہے۔ ڈونٹ وری آئندہ صرف درود سے کام چلانا۔" انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا اور وہ بے ساختہ بولا۔

"آئی لو یو شاہ میر! آپ کی جگہ کوئی کبھی بھی نہیں لے سکتا۔"

"مجھے پتا ہے اسی لیے تو نخرے دکھا رہا تھا۔" وہ ہنسے اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کی طرح دونوں ساتھ ہی نکلے تھے۔

"یہ دائم ہر وقت ان کا دُم چھلا کیوں بنا پھرتا ہے؟"

"اس لیے بھابھی کہ وہ دونوں چاند اور ہالہ کی طرح ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی جچتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے الگ کریں گی تو دوسرا بے رنگ، بے ذائقہ ہو جائے گا۔"

نیلوفر بھابھی نے مڑ کر عائشہ کی طرف دیکھا مگر کچھ



کہے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

دائم ایک نچلے متوسط طبقے کی کلاس شادی میں شریک تھا اور اسے ایک بار پھر شرمندگی ہو رہی تھی اس نے شاہ میر کو کتنا غلط سمجھا تھا، لڑکی کی شادی تھی اور شاہ میر اسے رش میں چھوڑ کر کہیں باہر گم ہو گئے تھے۔ بوڑھی عورتیں اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں اور وہ شمال خان کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"آپ کا بھائی بہت کمال کا آدمی ہے۔ اس نے مجھ جیسے شخص کو سدھارا ہے، یہ صرف وہی کر سکتا تھا۔ میں بہت برا انسان تھا۔ گھر کے حالات کی وجہ سے اتنا گرا ہوا کام کرتا تھا، پھر ایک دن تمہارا بھائی ملا ہم اسے بھی عام گاہک سمجھا، وہ روز ہمیں ملتا ہمیں حالات سے لانے کے قسمت بدلنے کے نئے نئے راستے بتاتا مگر ہر راستہ مشکل، ہر راستہ کٹھن لگتا۔ جب حرام منہ کو لگ جائے تو محنت کرنے کو جی نہیں کرتا۔ ہمارا بھی یہی حال تھا ہم قسمت کو اپنی ذمہ داریوں کو اپنے برے ہونے کی وجہ سمجھ کر مطمئن رہتا، وہ ہمیں ایسے لوگوں کے قصے سناتا، جو ہم سے بھی گئی گزری زندگی گزارتے تھے مگر حرام نہیں کھاتے تھے ہم اس کی باتوں سے چڑ جاتا اس سے لڑ پڑتا مگر وہ بڑا لوگ تھا ہم کو برداشت کرتا، وہ اکثر اپنی ٹیبل پر ہماری سروس کی مانگ رکھتا ہمیں اچھی خاصی ٹپ دیتا منیجر تمہارے بھائی کے نام کی وجہ سے چپ رہتا تھا ورنہ ہوٹل کے کمروں کا سروس عملہ اور ڈائننگ ہال کا سروس عملہ الگ الگ ہوتا ہے مگر وہ ہمیں ہی اپنی ٹیبل پر حاضر رکھتا۔"

دائم کرسی پر بیٹھ گیا اور شمال خان نے پھر سے کہا تھا۔

"اس دن بھی وہ ایسے ہی ڈائننگ ہال سے اٹھ کر ہمارے پیچھے آگیا تھا۔ اس وقت ہم روم نمبر 7 کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک عبایا میں ڈھکی چھپی لڑکی آکر کھڑی ہو گئی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"گل۔" اس کا لہجہ خاص فرنٹیئر کا تھا ہمارا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

"تم یہاں کیسے آیا؟" ہم اس پر چیخا تھا، تب ہی روم نمبر 7 کا آدمی ہمارے سامنے آگیا۔ اس نے گل کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔

"ہم کو یہی چاہیے۔" اور اس کا یہ جملہ سن کر ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

ہم اس آدمی سے لڑ پڑے۔ ہم نے اس کا مار مار کر بھرکس نکال دیا، پھر ہم گل کی طرف مڑے تو اس نے نقاب اتار دیا ہم نے ٹھنڈی سانس لی ہم نے اس وقت سوچا ہماری معصوم گل اس شہر کے راستے کہاں جانتی ہے جو اتنے بڑے ہوٹل میں آتی۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی اور جب ہم پھر سے سنبھل رہا تھا، تمہارا بھائی یک دم سے سامنے آگیا اور نرمی سے بولا۔

"یہاں واقعی گل بھی ہو سکتی تھی کیونکہ ہم بدی چھپ کر کتنے پردوں میں کریں، کبھی نہ کبھی وہ ہمارے گھر کا راستہ ضرور دیکھتی ہے ہمارے گھر کے اندر داخل ہو کر ہم پر ہنستی ہے اور کہتی ہے اب مکر جاؤ اگر مکر سکتے ہو، کیوں بھول گئے اللہ کی بے آواز لاٹھی کو، اللہ کے مکافاتِ عمل کو۔"

"ہم نے سنا اور ہم دیوار سے لگ گیا۔ پہلی بار زندگی نے بری طرح ذلیل کیا تھا آئینہ دکھایا تھا ہم نے سوچا اگر واقعی یہاں کسی دن گل کھڑی ہو اور اسے استعمال کرنے والا کوئی اور کمینہ آدمی ہو، تب تمہارے بھائی نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک بات کی تھی۔

"تم یہ کیوں نہیں سوچتے، ہر لڑکی گل ہی ہوتی تھی، گل ہی ہوتی ہے، معصوم مجبور بے چاری سی۔ تم تو اس علاقے سے تعلق رکھتے ہو، جہاں کے لوگ عورتوں کی عزت کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور علاقے، قوم کی تخصیص نہیں کرتے، سب عورتیں چاہے ان کا تعلق کہیں سے ہو، تمہارے لیے قابلِ احترام ہیں اور یہی تمہاری ان جی داری کا غرور رہا کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، ہماری پشت پر ہمارے پٹھان

بھائی ہمیں کبھی غیر کے سامنے جھکنے اور ذلیل نہیں ہونے دیں گے۔"

ہم اس دن بہت رویا تھا پھوٹ پھوٹ کر۔ ہم نے مرنے کی کوشش بھی کی مگر تمہارے بھائی نے ہمیں بانہوں میں لے کر روک لیا تھا پھر کہا حرام موت ایک پکا مسلمان نہیں مرا کرتا' توبہ کا در ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔ موت سے پہلے توبہ کرلی جائے تو وہ رب کائنات کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔

ہوٹل میں ہنگامے اور ہوٹل کے مہمان کی پٹائی پر ہم پریشان تھے کہ تمہارا بھائی یہاں بھی ہمارا ڈھال بن گیا اس نے اس مہمان کو ایک وڈیو فلم دکھائی' پھر سخت درشت لہجے میں بولا تھا "اگر تم نے اس معاملے کی اطلاع انتظامیہ کو دی تو یہ وڈیو فلم تمہاری بیوی کو بھیج دی جائے گی۔ میں نے سنا ہے' وہ غصے میں قتل بھی کر دیا کرتی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے یہ سارے عیش و آرام اور عیاشی اسی کی دولت کے مرہون منت ہے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے تم یہ عیش برقرار رکھنا چاہتے ہو یا گنوا دینا۔

تمہارے بھائی نے اتنے آرام سے ہمارا کیس حل کیا کہ ہماری نوکری بھی نہیں گئی اور آج ہم اپنی گل کی شادی کرنے میں کامیاب ہوا ہے ۔یہ سارا انتظام اور جہیز سب تمہارے بھائی کے ٹرسٹ نے دیا ہے۔ تم بہت خوش نصیب کہ اتنے فرشتے انسان کے ساتھ رہتے ہو' ایسا لوگ ہی تو دھرتی کا حسن ہیں ان کی زندگی دشوار اور مخالفت سے بھری ہوئی ہوتی ہے' مگر ان کے دامن دعاؤں اور محبتوں سے خالی نہیں ہوتے۔"

دائم بہروز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' وہ شاہ میر کو ڈھونڈتا ہوا باہر آیا۔ وہ باہر مردوں کے ساتھ روایتی رقص میں مصروف تھے۔ مگن' خوش' مطمئن۔

"والو سرجری؟" اس ملال بھری اطلاع نے اسے پوری طرح خوش نہیں ہونے دیا اور اس کے دل کو پھر سے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"یہ آدمی بہت کمال آدمی ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک نئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ کون؟" اس نے سوالیہ دیکھا۔ سامنے بیٹھا شخص مسکرانے لگا۔

"کبھی کسی زمانے میں مجھے گمان تھا کہ میں بہت اعلا پائے کا جیب کترا ہوں میں نے ایک بار اس شخص کی جیب صاف کی تھی۔ بہت بڑی رقم ہاتھ لگی تھی پندرہ دن آسانی سے کٹ گئے تھے' پھر پندرہ دن بعد یہ وہیں کھڑا تھا۔ میں نے رش میں پھر اس کی جیب کاٹ لی۔ رقم اس بار بھی بری نہیں تھی' پھر یہ معمول ہو گیا' مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیا شخص ہے اس کی ہر ماہ جیب کٹتی ہے مگر یہ شور واویلا نہیں کرتا آج کے دور میں تو امیر سے امیر آدمی بھی "پورا نہیں پڑتا" کی دہائیاں دیتا ہے۔ یہ کون سی فیری لینڈ کا قصہ ہے' جو یہاں اس دنیا میں آدھرا ہے' یہ افسانوں سی بات سہی مگر میں واقعی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"سر! میں رفیق۔"

وہ ایک پٹھان کے ہوٹل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا اور کہا۔

"اچھا ہوا رفیق صاحب! آپ آ گئے۔ پلیز میری چائے کا بل پے کر دیجیے کیونکہ آج غلطی سے میں ہپ پاکٹ کا والٹ لانا بھول گیا۔"

میرا تو وہ حال تھا کہ سر اٹھاؤں تو کیسے اس شخص نے میرا کندھا تھاما۔

"ہو جاتا ہے رفیق صاحب! جب انسان مجبور ہو' اس پر ذمہ داریاں ہوں' وہ پڑھا لکھا بھی ہو مگر پھر بھی اچھی نوکری نہ ملے تو انسان ایسے شارٹ کٹ مار ہی لیتا ہے' پہلے میں بھی ایسے ہی کام کرتا تھا مگر پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے جس بوڑھے آدمی کا والٹ نکالا' اس کے والٹ میں چند سو کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ اس کی بیوی کینسر کی مریضہ تھی اور وہ اس کے لیے ریڈ سیل کی بوتل لینے نکلا تھا۔ اس نے اس خط میں اپنے بیٹے کو گھر کے حالات سنائے تھے۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ملک سے باہر سیٹل اور وہ اتنا خوددار تھا کہ اس نے وہ خط لکھ تو لیا تھا۔ مگر پوسٹ نہیں کر پایا مجھے وہ چند سو نہیں' سمندر جتنے آنسو لگے' جو اس کی بے چارگی اور کم مائیگی نے بہائے تھے۔ میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور اس کے گھر پہنچا وہ بوڑھا آدمی اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں اداس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں والٹ دیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"شکریہ بیٹا! اگر تم نہ آتے تو میری تو شناخت ہی گم ہو گئی تھی۔ میں کسی کو کیسے بتاتا' میرا کیا نام ہے' میں کون ہوں' کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔"

وہ چپ ہو گئے تب میں نے سوچا تھا یہ شخص نفسیات کی مار' مار رہا تھا۔

"کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔" یہ ایک جملہ مجھ میں اٹک گیا۔ میں رونے لگا تھا۔ اس شخص نے میرے ہاتھ میں ایک کارڈ پکڑایا۔

"یہاں کل چلے جائیے گا۔ میرا ایک دوست ہے اس کو سیلز ورکر کی اشد ضرورت ہے۔ سیلری آپ کے اندازوں سے کم ہو گی مگر عزت کی' ہاں بھرم کی اللہ کے حکم سے میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

میں اٹھا اور اپنی جیب میں سے ان کا والٹ نکالنے لگا مگر وہ والٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

"مجھے لگا اب آپ کو ان پیسوں کی ضرورت نہیں' اس لیے اپنا والٹ نکال لیا۔"

"آپ اتنے ماہر ہیں تو آپ....."

تمہارا بھائی زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا میں باہر نکلا اور ایک ٹھیلے والے نے بتایا "وہ جو بلیک گاڑی کھڑی ہے ناں اسی شخص کی ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے' بس من موجی سا ہے امیر غریب کا فرق نہیں کرتا۔"

میں نے سر ہلایا اور اسی راستے پر چل پڑا جس کا راستہ تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔ بہت قدر کرنا اس کی۔ ایسے لوگ بہت کم کم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔"

اس نے دیکھا' وہ ان سب باتوں سے بے بہرہ ابھی تک آگ کے شعلوں کے گرد رقص کر رہے تھے۔

"اس کی روح پاکیزہ ہے' اسے دنیا داری سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ جبران کے خیالات کا آدمی ہے۔ یہ بڑی بڑی باتیں نہیں کرتا' لمبی لمبی پریس کانفرنسیں نہیں کرتا' چھوٹے چھوٹے عملی قدم اٹھاتا ہے' یہ جانتا ہے' سخاوت کرنا کیا ہوتا ہے' یہ جانتا ہے اگر آج ہم ہاتھ بھر بھر کے دیں گے تو ہمارا دنیاوی صندوق بھلے خالی رہ جائے مگر ہماری ہمیشگی کی جگہ پر سرسبز پھولوں کی کیاریاں بنیں گی' ہماری قبر پر آسمان شبنم افشانی کرے گا اور ہم بہت سارے دلوں میں زندہ رہ جائیں گے زندگی کے بہت سارے قصوں میں آج کے سنے گئے اور ان سے ملتے جلتے بہت سارے قصوں میں امید کی طرح۔"

"شاہ میر! بہت دیر نہیں ہو گئی ہمیں۔" اس نے رقص کرتے شاہ میر کا ندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گئے۔ ان کے گندمی رنگت میں سارے جسم کا خون لشکارے مار رہا تھا۔ بخار اور یہ رقص۔ دائم کو لگا ان کا ٹمپریچر اور بڑھ گیا ہے۔

"آپ کا بخار بہت تیز ہو گیا ہے۔" وہ فکر مند ہوا مگر انہیں پروا کب تھی۔ وہ شمال خان سے گلے مل رہے تھے' رفیق سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آج کی تقریب میں مجھے یاد رکھ کر آپ نے میری عزت بڑھادی شاہ میر صاحب!"

رفیق نے تشکرانہ دیکھا اور وہ ہنس پڑے ہمیشہ کی طرح' پھر مسکرا کے بولے۔

"نہیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں رفیق صاحب!"

"آپ نے اپنی مصروفیت میں سے وقت نکالا' یہ واقعی بڑی بات ہے' ورنہ آج کل تو لوگوں کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔"

رفیق مسکرانے لگا اور وہ گاڑی میں آن بیٹھے۔ دائم کا دل چاہا وہ ہسپتال والی بات کا بھی پوچھے مگر موقع نہیں ملا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں برخوردار؟"

"بابا جان! ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔"

"شام سے گئے ہوئے ہو اور اب آ رہے ہو۔" نیلوفر بھابھی جلبلا کر بولیں۔

اور شاہ میر نرمی سے بولے "شادی کے انتظامات بھی تو دیکھنے تھے بابا جان! اس لیے دیر ہو گئی۔"

"تم دائم کو بگاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے

نہیں دینا چاہتے۔" یہ حیا بھابھی تھیں۔

"بھلا دیر سے گھر آنے کا مطلب ہمیشہ بگڑ جانا ہی کب ہوتا ہے بہو۔"

"بابا جان! اسے آپ کی اور اماں جان کی شہ ہے' جو یہ کسی کے اختیار میں نہیں آتا۔"

شاہ میر خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے' انہیں برا لگتا تھا اگر ان کی وجہ سے ان کے اماں جان یا بابا کو سننا پڑتا۔ وہ اس صورت حال سے بچنے کے لیے کوئی معرکتہ الآرا اقتباس سوچ ہی رہے تھے کہ بابا جان نے انہیں یکدم سینے سے لگالیا۔

"میں سمجھتا تھا میں نے سب کچھ گنوا دیا' شہر کی زندگی نے مجھ سے میری مٹی کی خوشبو رشتے ناتے سب چھین لیے' مگر آج جب بھائی جی کی طرف گیا تو پورے گاؤں نے کسی وی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کیا۔ ہر شخص شناسا' ہر شخص اپنا بن کے ملا' سب ان ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھانے پر میرا شکریہ ادا کر رہے تھے جو میں نے شہر کی زندگی جینے کے باوجود ادھوری اور لاتعلقی کی نذر نہیں کی تھیں۔

آج بھائی جی کا فون آیا تھا' وہ شہر آرہے تھے۔ یہاں کے ایک بڑے ہسپتال میں ان کے دل کی والو سرجری تھی' میں اس لیے بھاگا گیا' شاہ میر! واقعی جب رشتے آپ کے اردگرد ہوں تو آپ کو لگتا ہی نہیں ہے' یہ سرکل کوئی توڑ سکتا ہے یا یہ سرکل ٹوٹ سکتا ہے' مگر یہ بیماریاں دکھ' یہ انسان کے اندر الارم بجا دیتے ہیں۔ میں بھی پہلی بار ڈر گیا بھائی جی کو خود شہر لایا ہوں اور اس وقت تمہارے سامنے کھڑا تمہارا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔

تم نے جس طرح سے میری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لیں' انہیں نبھاتے رہے' ان سب کے دلوں میں مجھے زندہ رکھا' وہ صرف تم ہی کر سکتے تھے بزنس ہر کوئی کر سکتا ہے۔ زندگی بھی بری یا بھلی' ہر کوئی جی سکتا ہے مگر بزنس میں رشتوں کی نگہ داری نبھا دینا' ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ تم واقعی زندگی کی خوب صورتی ہو۔"

شاہ میر حیران اور دائم خوش ہو رہا تھا جیسے یہ ساری تعریفیں اسی کی ہو رہی ہوں۔

"پتا ہے پورے بتیس دانت ہیں' اب اسے اندر بھی کرلو۔"

وہ کان کے قریب گنگنائے۔ وہ جھینپ گیا۔ نیلوفر بھابھی بڑبڑانے لگیں۔ شاہ بہروز مسکرانے لگے اور بابا نے اچانک پوچھا۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے شاہ میر!"

"نہیں تو بابا! بھٹی پر روٹیاں لگا کر آرہا ہوں اس لیے گرم ہو رہا ہوں۔" دائم پھر ہنسنے لگا اور بابا نے شاہ میر کا کان پکڑ لیا۔

"نالائق! اپنے بابا پر پوائنٹ مارتا ہے۔" شاہ میر کچھ نہیں بولے اور دائم نے سوچا "کاش وہ شاہ میر کی بیس فیصد ہی کاپی کر سکتا تو دنیا اور آخرت دونوں سدھر جاتیں مگر اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا بھی تو کم کمال نہیں۔ اچھے لوگوں کو آج کل کون پسند کرتا ہے؟ کوئی نہیں۔ اور وہ یہ کمال رکھتا تھا۔ اس لیے خوش تھا' بہت سی دعائیں اس کا بھی احاطہ کر رہی تھیں' دعائیں جو قسمت' حال' مستقبل سب کچھ بدل دیتی ہیں۔

اور وہ سر سے پیر تک بدلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ باقی گھر والوں کی طرح کفران نعمت نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہی صحیح فیصلہ تھا زندگی کا۔

کچھ دنوں سے رابعہ عجیب سی ہو رہی تھی' کبھی ہنستے ہنستے خاموش ہو جاتی اور کبھی ایسی گم صم جیسے وہ مجھ سے اور ثناء سے کٹ کر لاتعلق سی ہو گئی ہو۔ اردگرد کی دنیا سے اس کا رابطہ برائے نام رہ گیا تھا۔ وہ نہ جانے کن خیالات میں الجھی رہتی تھی۔ ثناء اور میں اس کی یہ کیفیت سمجھنے سے قاصر تھیں۔ وہ پہلے ایسی نہ تھی۔

ہم تینوں کئی کئی گھنٹے ساتھ گزارتے تھے۔ آپس میں ہنستے بولتے رہتے تھے اور ایک دوسرے پر لطیفے فٹ کر کے خوب مزا لیتے تھے' مگر اب وہ بات نہ رہی تھی۔ رابعہ نے ہمارے ساتھ بیٹھنا بہت کم کر دیا تھا۔ اگر کبھی آتی بھی تو اس کا رویہ عجیب و غریب' ناقابل فہم سا ہوتا تھا۔

سعدیہ گرنیس

کبھی ایسا لگتا کہ جیسے وہ خود کو ہم دونوں سے الگ اور برتر سمجھنے لگی ہے اور کبھی ہمارے درمیان رہتے ہوئے بھی وہ ہم سے دور ہوتی۔ ہماری باتوں پر وہ زیادہ توجہ نہ دیتی' بلکہ سرے سے ہماری کوئی اہمیت ہی نہ رہی تھی۔ اس کے اس رویے سے ہم دونوں ہی بے چین ہو گئی تھیں۔

ہم تینوں کی تکون سارے محلے اور خاندان میں مشہور تھی۔ میں' یعنی نورین حمید' ثناء اور رابعہ آپس میں کزنز بھی تھیں اور گہری دوست بھی۔ ہم تینوں کے گھر ایک ہی علاقے میں تھے۔ ہمارا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ ہم بہت سی شرارتوں میں ایک دوسرے کی رازدار اور شریک تھیں۔ بہت سی ڈانٹیں ہم نے اجتماعی طور پر کھائی تھیں اور بہت سی حماقتیں مشترکہ طور پر سرانجام دے کر باجماعت شرمندگی بھی اٹھائی تھی۔ ایک دوسرے کو ہر تہوار خصوصاً" عید اور سالگرہ وغیرہ پر تحفے تحائف دینا ہمارے بچپن کی معصوم سی روایت تھی۔ اس وقت کہ جب دل معصوم اور بے ریا ہوتے ہیں' ایک دوسرے سے بے غرض محبتیں اور رابطے ہوتے ہیں' ہم تینوں جب ہی سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ایک جیسے کپڑے' ایک جیسے پرس اور ایک ہی فلیور کی آئس کریم کھانا ہم تینوں کی معصوم سی ادائیں تھیں۔ بچپن بیتنے کے بعد نوجوانی کا دور بھی ہم تینوں نے بہت مثالی اور یادگار طریقے سے گزارا۔

ہماری ہر تفریح اکٹھی ہوتی تھی۔ ایک ہی کالج میں داخلہ اور واپسی کے وقت ایک ساتھ راستہ طے کرتے ہوئے ایک دوسرے پر شوخ فقرے اچھالنا ہماری عادت تھی۔

اکثر شام کی چائے ہم تینوں اکٹھے ہی پیتے تھے۔ کبھی میں اور ثناء رابعہ کے گھر چلی جاتیں' کبھی رابعہ اور ثناء میرے گھر آجاتی تھیں اور کبھی میں اور رابعہ مل کر ثناء کے گھر پر دھاوا بول دیتی تھیں۔ وہ ساری شام ہلے گلے اور مزے میں گزرتی تھی۔ فلموں پر تبصرہ' ڈراموں کا تذکرہ اور نت نئے فیشن میگزین دیکھنا ہمارا محبوب مشغلہ تھا' یہاں تک کہ شاپنگ کا پروگرام بھی اکٹھے ہی بنتا تھا۔ ایک دوسرے کی پسند اور انتخاب کو مدِنظر رکھ کر ہم تینوں اپنی ہر قسم کی شاپنگ کیا کرتے تھے، مگر اب تو جیسے وہ بات ہی نہ رہی تھی۔

"پتا نہیں اسے ہماری کیا بات بری لگ گئی... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" ایک دن ثناء نے مجھ سے کہا۔

"ہونہہ... محترمہ کچھ زیادہ ہی اونچی ہواؤں میں اڑنے لگی ہیں' جب سے نکاح ہوا ہے دماغ ہی نہیں مل رہا' جیسے دنیا میں ایک صرف اسی کا نکاح ہوا ہے۔"

میں نے اتنے روز سے دل میں پلنے والے جذبات کو زبان دے ہی دی' سچ تو یہ تھا کہ میری طرح اب ثناء بھی رابعہ کے اس سرسری و ثانوی سلوک سے بدگمان ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً" ہی میری بات کی تائید کی۔

"ہاں... مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے' ورنہ رابعہ ایسی تو نہ تھی۔" ثناء نے تنفر سے کہا۔

"حالانکہ اس کا شوہر اتنا بھی حسین نہیں۔" میں نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"تو وہ خود کون سا اتنی خوب صورت ہے' پھر بھی غرور کر رہی ہے۔ نکاح ہو گیا تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کر رہی۔" ثناء نے میری بات کو مزید آگے بڑھایا۔

چھ' سات ماہ قبل ہی رابعہ کا نکاح ہوا تھا اور وہ اس نکاح سے بہت خوش تھی۔ ہم دونوں نے اچھی دوستوں کی طرح اس کے نکاح میں شرکت کی' بلکہ خوب رونق بھی بڑھائی تھی۔ ثناء نے مہندی' شادی کے گیت ڈیک پر تیز والیوم میں چلائے تھے اور میں نے رابعہ کی ہتھیلیوں کی کوری لکیروں میں مہندی کے خوب صورت نقش و نگار سے اس کے شوہر کے نام کے رنگ بھرے تھے۔ نکاح والے دن ثناء نے اس کا میک اپ کیا تھا' کیونکہ وہ گرومنگ کا کورس کر چکی تھی' اس کے ہاتھوں میں نفاست بھی بہت تھی۔ ہم تینوں نے اکٹھے تصویریں اتروائی تھیں۔ اس روز ثناء اور میں نے جی بھر کر رابعہ کو تنگ کیا تھا اور ڈھیر ساری مٹھائی اسے ٹھونس ٹھونس کر کھلائی تھی۔ ہنستے گاتے اس کے نکاح میں شریک ہوئے تھے' مگر اب اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر ہم دونوں کو حقیقتاً" بہت دکھ پہنچا تھا۔

"کوئی اتنی خاص جاب بھی نہیں ہے اس کے شوہر کی... سنا ہے کسی نجی کمپنی میں ایڈمن کے شعبے میں ماتحت کے طور پر کام کر رہا ہے' نہ ہی اتنی شان دار پرسنالٹی ہے' بس سو سو ہے' رابعہ کے ساتھ زیادہ جچے گا تو نہیں' بس کام چل جائے گا۔" میرے دل کے خارِ بدگمانی کی کونپلوں سے پھوٹ پڑے۔

"اور بنتا ایسے ہے' جیسے ہالی ووڈ کا ہیرو ہے۔ رابعہ بے وقوف اس شو آف پر اتنا ریجھ گئی کہ ہماری دوستی کی ویلیو ہی ختم کر ڈالی۔" ثناء نے افسردگی سے کہا۔ اس روز میں ثناء کے پاس سے گھر آئی تو کافی دیر تک اس پہلو پر سوچتی رہی۔ رابعہ کے دل دکھا دینے والے رویے نے مجھے گہری سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نکاح ہونے کے بعد سے کچھ خاص ہونے کے احساس سے اس میں عجیب سی نزاکت آگئی تھی۔ اب میں اور ثناء جب بھی ملتے ہمارے پاس سوائے رابعہ کے موضوع کے کوئی دوسری بات نہ ہوتی تھی۔ ہم دونوں اس کے اس رویے پر دکھی بھی تھے اور شاکی بھی۔

☼ ☼ ☼

اس شام میں بڑی خوش تھی۔ کافی دن بعد رابعہ نے صبح ہی فون کر کے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آج شام وہ ہم دونوں کے ساتھ گزارے گی۔ شاید اس کھنچاؤ کو محسوس کر کے وہ اپنے بدلے ہوئے رویے کا ازالہ کرنا چاہ رہی تھی۔ میں شدت سے اس کی منتظر تھی' مگر وہ نہ آئی۔ ثناء ایک نئی خبر کے ساتھ اکیلی ہی چلی آئی۔

"وہ محترمہ تو اپنے ہس بونڈ ( Husbond ) کے ساتھ آؤٹنگ پر چلی گئی ہیں۔ باؤنڈ کر دیا ہے ان موصوف نے اس کو' اسی لیے میں نے اسے ہس بونڈ کہا ہے۔" اس نے جلے کٹے انداز میں اطلاع کی۔

"واٹ... آؤٹنگ پر... او مائی گاڈ... کتنی آؤٹ ہو گئی ہے رابعہ۔" میں سر پکڑ کر رہ گئی۔

"ویسے تو بڑی مشرقی بنتی تھی... کہ میں شادی سے پہلے ان سے ملوں گی بھی نہیں' بات بھی نہیں کروں گی... اور اب رخصتی بھی نہیں ہوئی اور محترمہ نے اڑان بھر لی۔" ثناء نے باقاعدہ نقل اتار کر اس کی باتیں دہرائیں۔

اسی دوران بوا گرم گرم چائے کے ساتھ پکوڑے اور اسنیکس لے آئیں۔

"کون... کیا... کس کا ذکر ہو رہا ہے؟" بوا نے مداخلت کی۔

"رابعہ اور کون... ذرا دیکھیں تو کیسی بدل گئی ہے وہ۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"ہاں... تھوڑا بہت فرق تو پڑ جاتا ہے۔" بوا نے مختصراً" کہا۔

"تھوڑا بہت نہیں' وہ بالکل ہی بدل گئی ہے۔ ابھی تو اس کی رخصتی بھی نہیں ہوئی اور اس کے مزاج بدل گئے۔" ثناء نے ناگواری سے کہا۔

بوا نے کچھ جواب نہ دیا' بس چپ چاپ چائے بناتی رہیں اور ہم دونوں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے۔

"اب رابعہ ہاتھ سے گئی... اسے ہم سے کوئی سروکار نہیں رہا' اتنی پرانی دوستی کو اس نے کس آسانی سے بھلا دیا۔" ثناء نے صدمے اور حیرت سے چور انداز میں مایوسی سے کہا۔

"ہاں بھئی... اونچی شے سمجھ رہی ہے خود کو... اب وہ ہم دونوں کو کیوں لفٹ کرائے گی۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اس بار ہم بھی اس کے بغیر شاپنگ کریں گے۔" میں نے انتقامی انداز میں پروگرام ترتیب دیا۔

بوا وہیں بیٹھی ہماری باتیں سنتی رہیں' لیکن دوبارہ انہوں نے ہماری باتوں میں مداخلت نہ کی۔ ہم دونوں ناشتے کے سامان سے انصاف کر چکے تو وہ چپ چاپ ٹرے اٹھا کر لے گئیں' کیونکہ ان کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ وہ برسوں سے ہمارے گھر میں مقیم تھیں اور ہم سب بہن' بھائیوں کو پالنے پوسنے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ان سے ہمارا خون کا رشتہ نہ تھا' مگر

محبت اور انسانیت کا رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ پنپ کر اٹوٹ ہو گیا تھا۔

بوا کے جانے کے بعد بھی ہم دونوں دیر تک بیٹھے رابعہ کی باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں نے ہی طے کر لیا تھا کہ رابعہ کی بے رخی کا جواب بے رخی سے دیں گے اور اُسے احساس دلائیں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔

رمضان المبارک بھی قریب آرہے تھے۔ اس کے بعد عید تھی اور ہم تینوں ہمیشہ اپنی رمضان اور عید کی تیاری مل کر کیا کرتے تھے۔ لیکن اس بار ہم نے رابعہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، پھر ہم نے ایسا کیا بھی، اپنی شاپنگ رابعہ کے بغیر کر لی۔ رابعہ نے ایک بار پوچھا تو اسے کوئی واضح جواب نہ دیا۔

ہر سال رابعہ رمضان کا چاند دیکھ کر ہمیں مبارک باد دینے آتی تھی، لیکن اس بار اس نے روکھے سوکھے انداز میں صرف ایس ایم ایس کر دیا۔ مجھے تو اتنا غصہ آیا کہ اسے جوابی ایس ایم ایس بھی نہ کیا۔ اسی وقت ثناء چلی آئی، وہ بھی رابعہ کے اس رویے پر کڑھ رہی تھی۔

"سنا ہے، بہت شاپنگ کرائی ہے اس بار اس کے شوہر نے... اب وہ کہاں ہم کو پوچھے گی۔" ثناء نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"بہت غرور آگیا ہے اس میں... ابھی سے شوہر کو اپنے قابو میں کر لیا۔" میں نے بھی جلے کٹے لہجے میں کہا۔

اسی وقت بوا بھی وہاں پر آگئیں۔ دراصل ان کی نظر کمزور ہو رہی تھی۔ سو وہ مجھ سے سوئی میں دھاگا ڈلوانے آئی تھیں۔ ہماری باتوں پر ان کے چہرے پر بزرگانہ سی مسکراہٹ بکھر گئی، جیسے وہ ہماری باتوں کو بچکانہ پن پر محمول کر رہی ہوں۔ کچھ دنوں سے ویسے ہی وہ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی تھیں۔ میرے کمرے کی کھڑکی پتلی گلی میں کھلتی تھی اور وہاں سے بڑی ٹھنڈی اور تازہ ہوا آیا کرتی تھی، مگر چند روز قبل وہاں کسی نے گندا کوڑا کرکٹ ڈال دیا تھا جس میں سے بو اٹھ رہی تھی۔

"دو، تین روز بعد اسی کوڑے پر کسی نے مزید کوڑا ڈال دیا، جس سے اب بو کے بھبکے اور تعفن اٹھ رہا تھا۔ میں نے بوا سے ایک، دو بار کہا بھی کہ کسی بھنگی کو بلا کر وہاں سے وہ گند ہٹوائیں، مگر وہ بدبودار کوڑا ابھی تک وہیں پڑا تھا اور اس کے تعفن سے میرا کمرے میں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔

"بوا! آخر کب تک یہ کوڑا پڑا سڑتا رہے گا؟" میں نے بوا سے پوچھا۔

"خبر نہیں بیٹا... میں نے بھنگی کو بلوایا بھی تھا، مگر وہ ہڈحرام آیا ہی نہیں۔" بوا معصوم بن گئیں۔

"کتنا تعفن پھیل رہا ہے اس کا... پتا نہیں کون یہاں کوڑا ڈال رہا ہے۔" میں نے کراہیت سے کہا۔

"معلوم نہیں بیٹی، کون ہے؟" بوا پھر سے معصوم بن گئیں۔

اور آج صبح میں نے خود بوا کو وہاں کوڑا ڈالتے دیکھا تو حیرت اور صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ بوا کی یہ عمر اور ایسی حرکتیں دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا۔ ان کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ مجھ سے دیدہ دلیری سے سفید جھوٹ بولے جا رہی تھیں۔

"استغفراللہ... اتنی صوم صلوٰۃ کی پابند اور کرتوت دیکھو۔" مجھے بوا سے نفرت سی محسوس ہوئی۔

یوں تو وہ بڑی نمازی پرہیزگار بنتی تھیں اور اب ایسی گری ہوئی حرکت کی مرتکب ہو کر شرمندہ بھی نہ تھیں۔ میں کمرے سے باہر نکلی تو بوا چوکی پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ ان کے اس دوغلے عمل سے مجھے شدید کراہیت محسوس ہوئی۔ میں انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی آئی کہ اپنے کمرے میں تو بو کی وجہ سے بیٹھا بھی نہ جا رہا تھا۔ ایک تو رابعہ کی وجہ سے دل پہلے ہی اداس اور پریشان تھا اور اب بوا نے عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دی تھیں۔ یا تو وہ اپنی عمر کی وجہ سے سٹھیا گئی تھیں یا پھر زیادہ ہی ہوشیار بن رہی تھیں اور مجھے بالکل بدھو سمجھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رمضان کے مبارک مہینے کا آغاز ہو گیا تھا۔ بوا شدومد سے نماز، روزوں میں لگی ہوئی تھیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے غصے کے ساتھ ساتھ ان سے شدید قسم کی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اب رابعہ اور ہمارے درمیان موجود تناؤ بھی ڈھکا چھپا نہ رہا تھا۔ ہم دونوں نے رمضان کی شاپنگ مل کر کی تھی۔ بعد میں رابعہ نے ہم سے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش بھی کی، مگر ہم دونوں نے اپنے منصوبے کے مطابق اسے لفٹ ہی نہ کرائی اور وہ اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

ہر عید پر ہم تینوں ایک دوسرے کو سرپرائز گفٹ دیا کرتے تھے لیکن اس عید پر میرا اور ثناء کا اسے تحفہ دینے کا بالکل بھی ارادہ نہ تھا۔ ہم نے عید کی شاپنگ بھی رابعہ سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم دونوں اب اسے سبق سکھانا چاہتے تھے۔ رمضان المبارک کے روزے بڑے سبک گزر رہے تھے۔ روزہ داروں پر رب نے اپنی رحمتوں کی بارش کی ہوئی تھی۔ ثناء اور میں بھی روزے رکھنے کے ساتھ ساتھ پرجوش طریقے سے عید کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

اسی دوران ایک روز رابعہ نے مجھے عید کا تحفہ بھجوا دیا۔ مجھے اس پر اور بھی غصہ آیا۔ پتا نہیں کس بات پر اکڑ رہی تھی، وہ پہلے ہمیشہ خود تحفہ لاتی تھی اور اس بار ملازم کے ہاتھ بھجوایا۔ اس کا تحفہ بھی مجھے پسند نہ آیا، اسی وقت ثناء بھی آگئی۔

"دیکھ رہی ہو یہ کیا تحفہ بھجوایا ہے اس نے... خود تو اتنے مہنگے شاپنگ سینٹر سے شاپنگ کرتی پھر رہی ہے اور ہمارے لیے یہ معمولی سی چوڑیاں۔"

ثناء کی شکل دیکھتے ہی میں نے دل کا غبار نکال ڈالا۔ ثناء بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت کا شکار تھی اور اسے بھی رابعہ کی اس حرکت کا دکھ ہو رہا تھا۔

"مگر بیٹا تحفہ تو تحفہ ہوتا ہے، چھوٹا ہو یا بڑا۔" بوا نہ جانے کب وہاں آن وارد ہوئیں۔

ان کی مداخلت پر میں نے ناگواری سے ان کو دیکھا۔ سفید چکن کا دوپٹہ لپیٹے وہ بڑی مقدس بن رہی تھیں، مگر دوغلے پن میں ماہر تھیں۔ ان کی اصلیت مجھ پر تو کھل ہی چکی تھی، اس لیے میں نے ان کے نصیحت نامے کو نظر انداز کر دیا۔ مجھے ایسے دوغلے اور منافق لوگوں سے شدید چڑ ہوتی تھی، جو اندر سے کچھ اور اوپر سے کچھ ہوتے ہیں۔

"مگر بوا... معیار بھی کوئی چیز ہے۔ اسے اتنا سستا تحفہ بھیجتے ہوئے سوچنا چاہیے تھا۔ آخر کیا سمجھتی ہے وہ ہمیں... بہت زیادہ گھمنڈ آگیا ہے اس میں۔ اس نے خود میں اور ہم میں فرق کرنا شروع کر دیا ہے۔" ثناء بوا کی حقیقت سے بے خبر تھی، اس لیے دل کھول کر اپنا غصہ باہر نکالنے لگی۔

"تو آپ ایسا کرو نا کہ انہیں کوئی اچھا سا قیمتی تحفہ بھجوا دو۔" بوا کے دوسرے حماقت بھرے مشورے پر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"واہ، ہم فالتو میں اچھا تحفہ دیں اُسے۔" مجھے غصہ آگیا۔

"مگر بیٹا، آپ دونوں اتنے روز سے یہ ہی تو کر رہی ہو، آپ دونوں رابعہ کو روز ہی قیمتی تحفے بھجواتی ہو۔" بوا یہ کہتے ہی وہاں سے چلی گئیں۔

"میرا خیال ہے کہ بوا کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے ثناء کی استفہامیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

بوا کے جانے کے بعد ہم دونوں عید کی شاپنگ کے بارے میں اپنا پروگرام طے کرنے لگے۔ اس بار ہم دونوں نے رابعہ کو جلانے کے لیے ایک جیسے سوٹ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ رمضان کے دوسرے عشرے کا آغاز ہو گیا تھا اور ہم نے اسی ہفتے شاپنگ نمٹانے کا پروگرام بنایا تھا، مگر ایک نئی مصروفیت نے ہمارا سارا پروگرام درہم برہم کر دیا۔

ہوا کچھ یوں کہ اچانک ہی میرا بہت اچھی جگہ سے رشتہ آگیا اور جھٹ پٹ سب طے ہو گیا۔ اسی عید پر میری منگنی کے ساتھ پہلی عیدی کا پروگرام بھی سیٹ ہو گیا۔ میں اپنی زندگی میں آنے والے اس نئے اور اہم موڑ پر کچھ حیران اور کچھ خوش سی بھی تھی۔ ثناء نے یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئی۔ رابعہ نے بھی

مبارک باد کا فون کیا، مگر میں نے بڑے سرسری اور روکھے پھیکے انداز میں اس سے بات کی۔

تیسرے عشرے کے آغاز میں ثناء چلی آئی، کیونکہ ہمارا شاپنگ کا پروگرام ادھورا رہ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، پھر کل چل کر ہم دونوں اپنے عید کے جوڑے خرید لیں گے۔" ثناء نے فائنل بات طے کر لی۔

"مگر اس بار تو نورین کا عید کا جوڑا اس کی سسرال کی طرف سے آئے گا اور یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے کہ عید پر لڑکی کو سسرال سے آیا ہوا جوڑا پہننا ہوتا ہے۔" امی نے سنا تو فوراً آگاہ کر دیا۔

اس نئے آرڈر پر ثناء کے ساتھ ساتھ میں بھی ششدر رہ گئی۔ اس طرح تو میرے اور اس کے بنے ہوئے پروگرام میں رخنہ پڑ رہا تھا۔

"مگر امی...." میں نے کہنا چاہا۔

"کوئی اگر مگر نہیں.... بس اب تمہیں سسرال سے آنے والا جوڑا ہی عید کے دن پہننا ہے۔" امی نے ڈپٹ دیا۔

میں باقاعدہ روٹھ گئی، مگر امی نے ذرا بھی توجہ نہ دی۔ البتہ رابعہ کو خبر ہوئی تو وہ میرا تماشا دیکھنے چلی آئی۔ اسے دیکھ کر میرا منہ کڑوا ہو گیا۔ اتنی بے وفا اور طوطا چشم دوست میری نظر سے اس سے پہلے نہ گزری تھی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے نورین!" "اب مجھے دیکھو، جب سے میرا شہزاد سے نکاح ہوا ہے، مجھے ان کی پسند ناپسند اور رائے کو فوقیت دینا پڑتی ہے، کیونکہ اب وہ زندگی کے راستوں پر میرے ہم سفر ہیں۔ اب مجھے ان کی بات کو زیادہ اہمیت دینا پڑتی ہے۔ اس بار تمہارا عید کا تحفہ بھی ان کی پسند کا تھا۔" مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی رابعہ نے مجرمانہ سے انداز میں وضاحت دی۔

میں گم صم اور پریشان سی خاموشی سے اس کی شکل دیکھے گئی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی رابعہ واقعی بدلی ہوئی اور کچھ بڑی بڑی سی لگی۔ وہ کب میرے پاس سے اٹھ کر گئی، مجھے خبر نہ ہوئی، جب بوا نے پیار سے میرا گال تھپتھپایا تو میں چونک پڑی۔

"بیٹا! اتنے روزے میں ایک بات تمہیں سمجھانا چاہ رہی تھی، مگر تب تمہاری سمجھ میں میری کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ تم دونوں رابعہ سے بدظن ہو کر آپس میں اس کی برائیاں کر رہی تھیں اور بدلے میں اپنی نیکیوں کا تحفہ اسے دے رہی تھیں۔ دیکھو، دنیا کی زندگی میں کوئی بھی انسان یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنا نقصان کرے یا اپنے مال میں دوسروں کے حصے لگائے، لیکن غیبت جیسے عمل کا مرتکب ہو کر وہ خود ہی اپنے اعمال کے ساتھ گھاٹے کا سودا کر رہا ہوتا ہے، یعنی اپنے نیک اعمال خوشی خوشی اس شخص کے اکاؤنٹ میں جمع کروا رہا ہوتا ہے، جسے وہ ناپسند کرتا ہے یا ناخوش ہوتا ہے۔ وہ خود ہی اپنی نیکیاں اسے دے کر اپنا دامن خالی کر لیتا ہے۔ اس وقت تمہیں کھڑکی کے باہر سے اٹھنے والا تعفن اور بدبو بری لگ رہی تھی تو سوچو کہ غیبت جیسا عمل ایسا ہی ہے، جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا لیا جائے۔ وہ تعفن اور سڑاند ہمارے اپنے اندر سے پھوٹنے لگتی ہے۔ تم انجانے میں اسی عمل کی مرتکب ہو رہی تھیں، میں نے اپنا فرض سمجھ کر تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ آگے تمہاری مرضی بیٹا!"

بوا کے لفظ لفظ میں روشنی تھی اور میں شرمندگی کے احساس تلے اپنا سر بھی نہ اٹھا پا رہی تھی۔

بوا کے سامنے مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا اور کم ظرف سا لگا۔ ایک معمولی بات کو سمجھنے کے بجائے میں نے الٹا اس میں اپنی بدگمانیوں سے پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں اور ایسی برائی کا شکار ہو گئی تھی جس کی ہمارے مذہب میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے، مگر لوگ نماز روزے کے پابند ہونے کے باوجود اس برائی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کے تیسرے عشرے کا آغاز ہو گیا تھا اور میری آنکھوں سے غفلت کا پردہ بھی ہٹ گیا تھا۔ اب مجھے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ اپنی پیاری سی دوست رابعہ کو اس عید پر اچھا سا تحفہ بھیجنا تھا۔

نعیمہ ناز

# بھنور کا سفر

ناولٹ

"یہ منخنجو پھر آگیا؟" عظمیٰ نے تیوریاں چڑھا کر اس وجود کو اوپر سے نیچے تک دیکھا جسے اس نے منخنجو۔ سمیت نہ جانے اور کیا کیا نام دیے ہوئے تھے۔

"ابھی تو تم گئے تھے' دو گھنٹے بیٹھ کر۔" عظمیٰ نے گھور کر اسے دیکھا جو صرف شکل سے ہی نہیں بلکہ حلیے سے بھی سیدھا سادا اور مسکین سا ہی لگتا تھا اور عظمیٰ کے سامنے تو وہ اور بھی دبا دبا اور سہما سہما سا ہو جاتا تھا۔"

"میں اپنا موبائل بھول گیا تھا۔"

"تم اپنے سیل فون پر لڑکیوں سے باتیں کرتے ہو نا!" عظمیٰ نے اس پر بلاوجہ ہی ایک میزائل داغا۔

"میں؟" اس کی آنکھیں حیرت اور خجالت سے مزید پھیل گئیں۔

"تو اور کیا۔" عظمیٰ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے لطف اٹھایا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' مجھے کچھ معلوم نہیں ہے' یہ جو تم سب سے چھپ چھپ کر دھیمی دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہو' کون ہے وہ جلدی سے بتاؤ۔" عظمیٰ ہوا میں تیر چلا رہی تھی۔

"کوئی بھی نہیں' وہ تو بس ایسے ہی... ایک رانگ نمبر تھا تو۔" علی اچھا خاصا بوکھلا گیا تھا اس تھانے دارنی کی تفتیش سے۔

"اچھا' رانگ نمبر اور رائٹ گرل! ہوں۔" عظمیٰ کی "ہوں" خاصی لمبی اور معنی خیز تھی۔

"آپ بلاوجہ شک کر رہی ہیں' ورنہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے' میں نے تو زیادہ بات بھی نہیں کی' وہ خود ہی زبردستی فری ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔" علی نے ذرا جرات کا مظاہرہ کر کے اپنی صفائی پیش کی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم لڑکیاں چھچھوری ہوتی ہیں' بدتمیز ہوتی ہیں۔" عظمیٰ نے اپنی تیوریوں پہ بل مزید ڈال لیے۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ پھر بوکھلا گیا' ایک تو پتا نہیں کیوں وہ عظمیٰ سے اتنا خائف کیوں رہتا تھا۔

"کہا تو نہیں، مگر کہنا تو یہی چاہ رہے تھے نا۔"
"آپ سے بحث میں تو کوئی جیت ہی نہیں سکتا۔" وہ آہستہ سے بولا۔
"صرف بحث میں؟" اس نے آنکھیں چمکائیں۔
"ہر معاملے میں۔" علی نے اعتراف کیا۔
"اب اپنا موبائل اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"
"میں تو وہ ہی لینے آیا تھا، آپ نے باتوں میں الجھا لیا۔" علی نے سادگی سے بولتے ہوئے اپنا موبائل صوفے پر سے اٹھایا۔
"اچھا بھئی، غلطی ہو گئی ہم سے۔" عظمیٰ کے مزاج پر چھائی افسردگی یکدم کہیں غائب ہو چکی تھی، وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔
علی کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر نہ جانے کیا سوچ سوچ کر مسکراتی رہی، پھر اپنا سیل فون آن کر کے گیم کھیلنے لگی۔
"بہت خوب، تم کام کرنے کے بجائے یہ کھلونا لے کر بیٹھی ہوئی ہو۔"
"یاد ہے تم سے بڑی آپا نے کچھ کہا تھا نا، تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"
"کیا کہا تھا؟" سدا کی لاپروا اور بھلکڑ عظمیٰ نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔
"اب تم اپنے ننھے سے دماغ پر زور دینے کی زحمت مت کرو، میں بتا رہی ہوں۔ باتھ روم، واش روم اور صحن کی اچھی طرح صفائی اور دھلائی کر دو۔" یمنیٰ نے اسے وہ کام بتایا جسے بڑی آپا نے عظمیٰ کے سپرد کیا تھا اور وہ سب کچھ بھول بھال کر پہلے میچ دیکھنے، پھر علی کو زچ کرنے اور پھر اپنے سیل فون پر گیم کھیلنے میں مصروف ہو گئی تھی۔
"کتنی اچھی طرح؟" وہ گیم میں مصروف لاپروائی سے بولی۔
"عظمیٰ... اب تم پٹ جاؤ گی، اٹھ جاؤ شرافت سے۔" یمنیٰ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
"صوفے سے یا جہان سے؟" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بھی باز نہ آئی۔

"زبان کا غیر ضروری اور بے تحاشا استعمال بہت بڑا فتنہ ہے، قابو رکھا کرو اسے۔" یمنیٰ کے لہجے اور انداز میں امی کی تربیت اور قربت بول رہی تھی، جس سے عظمیٰ آٹھ سال پہلے ہی محروم ہو گئی تھی، وہ بارہ سال کی تھی جب ان کی امی کا انتقال ہوا تھا۔
"نو لیکچر پلیز۔" بے زاری اور کوفت چہرے پہ سجائے باہر نکل گئی اور صحن میں جا کر بچوں کا پھیلاوا سمیٹنے لگی، فرا کی پرام، احمد کی سائیکل۔ بڑی آپا آتیں تو بچوں کی چیزیں بھی ساتھ آتیں، بڑے بھائی جان کے جوتے، گھر کے سب ہی افراد کی چپلیں، بالٹی، ٹب اور دوسرا الم غلم۔ اس نے ایک ایک کر کے سب چیزوں کو ٹھکانے سے لگایا، پھیلاوا سمیٹا اور باتھ روم دھونے گھس گئی۔ وہ کام چور تو نہیں تھی مگر آج اس کا کوئی بھی کام کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک تو اسے آج شام ہونے والی تقریب سے ہی اختلاف تھا اور اس نے ابو کے سامنے اپنا احتجاج ریکارڈ کروا دیا تھا، مگر پھر بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ابو نے اپنے تئیں تو اسے مطمئن کر دیا تھا مگر اسے یہی لگا کہ انہوں نے اسے ٹال دیا ہے۔ "ابھی تک سب مجھے بچی سمجھتے ہیں، کوئی میری بات کو سیریس لیتا ہی نہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور جھاگ جھاگ سرف کو دیکھنے لگی۔
"پل بھر کی زندگی۔" اس نے سرف میں کپڑا بھگویا اور ٹائلز پر پھیرنے لگی۔ ہاتھ کام میں لگے ہوئے تھے اور دماغ آج رات ہونے والی تقریب میں الجھا ہوا تھا۔
"ابو کو کتنا سمجھایا مگر... یہ بڑے تو ہم چھوٹوں کو ہمیشہ نادان اور کم عقل ہی سمجھتے ہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔
"پچھلے ہفتے یمنیٰ نے کچن میں برتن دھوتے ہوئے اسے بتایا کہ ابو نے چھوٹی آپا کا رشتہ فائنل کر دیا ہے تو کچھ حیرانی اور کچھ صدمے سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"کیوں؟"
"کیوں کا کیا مطلب؟" یمنیٰ نے الٹا اس سے سوال کیا اور پتیلی مانجھنے لگی۔



"پہلے بڑی آپا، اب چھوٹی آپا، کیا ہماری بہنوں کے لیے ایسے ہی رشتے رہ گئے ہیں؟" عظمیٰ کا منہ بن گیا۔
"میں ابو سے بات کروں گی۔" وہ یک دم ہی بہت بڑی بن گئی۔
"اچھا۔" یمنیٰ نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "بہت بڑی ہو گئی ہو تم۔"
"ہاں اتنی بڑی تو ہو گئی ہوں کہ ابو سے بات کر سکوں۔" عظمیٰ نے بڑے فخر اور اطمینان سے جواب دیا تھا۔
شام میں موقع غنیمت جان کر وہ ابو کے پاس جا پہنچی۔ وہ ڈرائنگ روم میں اکیلے بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔
"ابو جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" بغیر کسی تمہید کے وہ ان سے مخاطب ہوئی، آواز سے ناراضی چھلک رہی تھی۔
"اخبار پڑھ رہا ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر ایک نظر اسے دیکھا، اپنی بیٹی کے مزاج اور دل کی بات سے وہ باخبر تھے۔
"آپ نے چھوٹی آپا کے لیے ہاں کر دی؟"
"ہاں..."
"کیوں؟"
"اس لیے کہ ان کی شادی کرنا ہے۔"
"یہاں کرنا ضروری ہے؟"
"کیا برائی ہے؟" ابو نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔
"ان کا ایک بیٹا ہے چھوٹا سا۔" عظمیٰ نے باپ کو یوں جتایا جیسے وہ اس سے لاعلم ہوں۔
"ہوں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کیا ہماری آپا کے لیے ایسا ہی رشتہ رہ گیا ہے، شادی شدہ بچے والا۔" عظمیٰ کے لہجے اور لفظوں میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔
"بات یہ ہے بیٹی کہ مراد صاحب ہر طرح سے تمہاری آپا کے لیے موزوں ہیں۔ شریف النفس ہیں، نیک اطوار ہیں، برسر روزگار ہیں، عمر بھی ٹھیک ہے نہ بہت زیادہ، نہ بہت کم، تمہاری آپا کے ساتھ بہت اچھا جوڑ ہے۔" ابو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"اور بیٹا؟"
"بن ماں کے بچے پہ تو یوں بھی سب کو ترس آ جاتا ہے، ہماری بیٹی اس بچے کی ماں بن کر اسے پالے گی، کتنا اجر ملے گا، یہ تو بہت ثواب کا کام ہے۔"
"بس رہنے دیں۔" وہ فوراً تڑخ گئی۔ "بڑی آپا کی شادی پر بھی آپ نے یہ ہی کہا تھا نا اور دیکھا کیا ہوا؟ بات بات پر سوتیلی ماں ہونے کے طعنے ملتے رہتے ہیں۔ دونوں بچوں کو ان کی دادی، پھوپھی کیسا سکھاتی پڑھاتی تھیں، گھل گھل کر آدھی ہو گئی تھیں ہماری آپا۔" عظمیٰ نے انہیں یاد دلایا۔
"وہ طوفان گزر گئے بیٹا! اب تو وہ بچے اپنی ماں کے ہی ہیں نا، جو ہے تو سوتیلی مگر بچوں کے لیے سگی ماں کی ہی طرح محترم ہے، اور بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں، نادان، نا سمجھ، عقل و شعور کو پہنچے تو اچھا برا خود ہی جان گئے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" ابو کے مزاج کا تحمل اور بردباری ان کے بچوں کے مزاج میں بھی آئی تھی۔
"صبر کے ان صحراؤں کو پار کرتے کرتے انسان بے دم ہو جاتا ہے ابو۔" عظمیٰ نے ڈائیلاگ جھاڑا۔
"اگر ہماری قسمت میں صبر ہے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے راضی سے کریں یا ناراضی سے، خود کو اللہ کی رضا پر چھوڑ دینے سے انسان سکھ میں رہتا ہے۔"
ابو نے ایک نظر اپنی تنک مزاج بیٹی کو دیکھا جو بہت سی خامیوں کی مالک تھی مگر کچھ بھی ہو، اپنے گھر کے ایک ایک فرد سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی اور یہ اس کی محبت ہی تو تھی کہ وہ اپنی چھوٹی آپا کا مقدمہ لڑنے اپنے ابو کے پاس آ گئی تھی۔
"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کے کہنے سے ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، زندگی ہمیں خود سکھاتی ہے۔ تم میری بہت اچھی بیٹی ہو، اللہ تمہیں بہت سی خوشیوں سے نوازے۔" ان کے لہجے میں باپ کی شفقت اور محبت بول رہی تھی۔
"آپ بہت اچھے ہیں ابو جی! سب کے ابو ایسے نہیں ہوتے۔" عظمیٰ ان کے اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میری بیٹی بھی بہت خوب ہے، کبھی آگ، کبھی پانی۔" ابو نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر تھپکا اور مسکرانے لگے۔

"اچھا اب ایسا کرو، جلدی سے مزے دار والی چائے کا ایک کپ لے آؤ۔"

"جی!" وہ بڑی فرماں برداری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

باپ کی باتوں سے وقتی طور پر تو وہ بہل گئی اور خاموش ہو گئی، مگر نہ مطمئن تھی اور نہ ہی خوش تب ہی تو آج جب کہ چھوٹی آپا کا رشتہ طے ہونے جا رہا تھا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا مزاج برہم ہو رہا تھا۔

"کتنا رگڑو گی، بس چمک گئے سارے ٹائلز، آئینہ بن گئے، اب کچھ اور کام بھی دیکھ لو، بلکہ یہ جو باقی کام پڑا ہوا ہے، پہلے اسے مکمل کر لو۔" یمنیٰ نے آ کر اندر جھانکا۔

"آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی سے بچا ہوا پانی ٹائلز پر بہایا اور باہر آ گئی۔

"گملے تو سیٹ کروا لو، میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں کہاں رکھوں۔" عظمیٰ نے ایک گہری سانس لے کر گملوں کو دیکھا، جہاں رنگ برنگے پھول ہرے ہرے پتوں کے ساتھ مل کر عجب بہار دکھا رہے تھے۔

"ارے، اس میں تو کونپل پھوٹ آئی۔"

یمنیٰ تحیر سے بولتی ہوئی اس گملے کی طرف جھک کر دیکھنے لگی، جس میں بیج ڈالے بہت دن گزر گئے تھے۔ مگر کسی کونپل نے سر ہی نہیں اٹھایا، اب تو یمنیٰ بھی مایوس ہو گئی تھی، کل پرسوں ہی تو وہ کہہ رہی تھی کہ اس میں نئے سرے سے مٹی اور کھاد ڈال کر دوبارہ بیج ڈالے گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی، اس کے دبائے ہوئے بیجوں نے ننھی منی کونپلوں کا تحفہ آج دے دیا تھا۔

"اچھا میری بہن، اب جلدی جلدی کام ختم کر لو، ٹائم کا پتا نہیں چلتا، یوں ہی شام ہو جاتی ہے، چلو آؤ یہ گملے رکھوا دوں۔" یمنیٰ گملے کھسکانے لگی۔

"یہ بیل ماشاءاللہ کتنی جلدی بڑھی ہے۔" یمنیٰ نے بڑے پیار سے اس ہری بھری بیل کو دیکھا جو اپنے خوش رنگ پھولوں اور پتیوں کے ساتھ تیزی سے دیوار کے سہارے پھیل رہی تھیں۔

رات میں مہمان وقت پر آ گئے تھے۔ بظاہر سلجھے ہوئے مہذب لوگ تھے۔ تمیز، تہذیب اور قاعدے قرینے سے گفتگو کے آداب سے واقف۔ ابو کے ایک دوست نے یہ رشتہ کروایا تھا، جو ان کے پڑوسی تھے، انہوں نے بھی ابو سے سب گھر والوں کی خاص طور پر لڑکے کی بہت تعریف کی تھی، ابو ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اپنی دانست میں بہترین فیصلہ کر کے انہوں نے آگے کے معاملات اللہ پر چھوڑ دیے تھے۔

یمنیٰ اور باسط بھائی عظمیٰ کو سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے چاری کو کسی نہ کسی کام کے لیے دوڑا دیتے۔

"بڑی امی اور پھوپھو اوپر ہیں، تم انہیں نیچے بلا لو۔"

"اچھا۔" عظمیٰ تقریباً پاؤں پٹختے ہوئے ہی اوپر گئی تھی۔

اوپر لاؤنج میں بڑی امی اور پھوپھو باتیں کر رہی تھیں۔

"اللہ بخشے ہماری بھابھی بھی بہت خوب تھیں۔ خود بھی پردے کی بوبو اور بیٹیوں کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگا۔ اب بھلا آج کل کے دور میں ایسی لڑکیاں کہیں کھپنے والی ہیں۔ بھلا کتنی ہی اعلا تعلیم ہو، کون پوچھتا ہے۔ لڑکیوں میں ذرا چنک مٹک ہونا چاہیے، کیوں؟" پھوپھو نے بڑی امی کی طرف دیکھ کر تصدیق چاہی۔

"ہاں تو اور کیا، اب دیکھو نا اتنی اچھی لڑکیاں تھیں دونوں، نصیب میں شادی شدہ بچوں والے مرد لکھے تھے۔" انہوں نے نند کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بس ایک عفرا کی شادی ذرا ڈھنگ سے ہوئی ہے، اچھا لڑکا ملا ہے، باقی یہ دو بے چاریاں تو بس۔" انہوں نے تاسف بھرا ایک گہرا سانس لیا اور خاموش ہو گئیں۔

"میرے عمران سے دو سال بڑی ہے طلعت، ورنہ اسے تو میں ہی لے لیتی۔" پھوپھو نے چھوٹی آپا کا نام لیا اور کمرے میں گھڑی ڈھونڈتی عظمیٰ کی پیشانی کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"دو سال ہی بڑی تھیں آپا، کوئی دو صدیاں نہیں، ہونہہ، بلاوجہ کی باتیں چھیڑنا۔ امیر کبیر بہو چاہیے تھی، مل گئی اب یہاں بیٹھ کر یہ سب باتیں کیوں بگھار رہی ہیں، بڑا ہمدردی کا بخار چڑھا ہوا ہے۔"

اس نے اپنی پیشانی کے بل ذرا ٹھیک کر کے بڑی امی اور پھوپھو کو یمنیٰ کا پیغام دے دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی دو ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔ اب روز، روز بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ تیاریاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ کبھی بڑی آپا آجاتیں اور باسط بھی کچھ کام سمیٹ دیتیں کہ چار بچوں کا ساتھ تھا، مگر پھر بھی جیسے تیسے وقت نکال ہی رہی تھیں۔ عفرا بے چاری تو اپنے دو بچوں میں لگی رہتی، آتی تو وہ بڑے خلوص و محبت اور نیک نیتی کے ساتھ تھی۔

خدا خدا کر کے تیاریاں بھی مکمل ہو ہی گئیں اور شادی کا دن آ گیا۔ چھوٹی آپا رخصت ہو کر شوہر کے سنگ زندگی کے نئے سفر پر چل پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"اف خدایا، شکر ہے تیرا، ٹھنڈا پانی بھی کیا نعمت ہے۔" دو گلاس پانی پی کر عظمیٰ کی جان میں جان آئی، ورنہ پیاس کے مارے اس کا برا حال تھا۔ آج آخری پیپر دے کر گھر آئی تھی، پیپرز ختم ہوئے تو رزلٹ کی ٹینشن شروع ہو جائے گی۔

"اللہ جانے کیا آئے گا۔" کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

"کیا پکایا ہے؟" اس نے یمنیٰ سے پوچھا۔

"دال، چاول۔" وہ فریم میں اپنی قمیص پر کڑھائی کررہی تھی۔ "گرم کردوں؟"

"نہیں، میں لے لوں گی، تم اپنے یہ پھول بوٹے بناؤ۔" عظمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اپنے لیے کھانا گرم کرکے لے آئی۔

"ہائی داوے، یہ کون سے پھول ہیں؟ خزاں کے یا بہار کے؟" چاولوں میں املی کی چٹنی ملاتے ہوئے عظمیٰ پوچھنے لگی۔

"پھول تو بہار میں ہی کھلتے ہیں، خزاں میں کون سے پھول ہوتے ہیں؟" یمنیٰ نے فریم سے سر اٹھا کر اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو۔

"خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں۔" عظمیٰ نے اپنی بات پر زور دیا۔

"کہاں؟"

"سنا ہے دلوں میں کھلتے ہیں۔" عظمیٰ بظاہر لاپروائی سے بولی، مگر اس کی دبی دبی شرارتی مسکراہٹ یمنیٰ کو نظر آرہی تھی۔

"تم کچھ زیادہ ہی نہیں بولنے لگی ہو؟" یمنیٰ کچھ کنفیوز ہوگئی۔

"ہاں، غالباً" احسن بھائی کا اثر آگیا ہے۔"

"احسن بھائی بیچ میں کہاں سے آگئے؟"

"کہاں سے کیا مطلب، خالہ کے گھر سے آئے ہیں اور کہاں سے، تمہیں ہمارے درمیان سے اڑانے کے لیے۔"

عظمیٰ اطمینان سے کھانا کھاتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھی۔ چھوٹی آپا کی شادی کے دوران، خالہ نے ابو کو عندیہ دیا تھا کہ شادی کے بعد وہ یمنیٰ کا باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی۔ کل بھی ان کا فون آیا تھا۔ اس اتوار کو ان کی آمد متوقع تھی۔

"جو نصیب میں اور اللہ کا حکم ہو، وہ ہی ہوگا، پہلے سے اپنے خیالات بھٹکانے سے کیا فائدہ؟" یمنیٰ سنجیدہ ہوئی۔

"اللہ کا حکم ہے تب ہی آرہی ہیں، رہی نصیب کی بات تو سنا ہے احسن بھائی بڑے ڈائیلاگ مار رہے تھے، تمہیں اپنا نصیب بنالیں گے، دل میں اور زندگی میں بسالیں گے، وغیرہ وغیرہ۔"

"اچھا بس۔ اب چپ ہوجاؤ۔"

"چلو ہوگئی، ویسے چٹنی بہت مزے دار بنائی ہے تم نے، دل چاہ رہا ہے ساری کھا جاؤں۔"

"اللہ کے واسطے خود پر نہیں تو مجھ پر رحم کرو، ٹانسلز کا مسئلہ رہتا ہے تمہیں، خوامخواہ گلا خراب ہوگا اور شامت میری آئے گی، ابو کی ڈانٹ بھی سنو اور تمہاری تیمارداری بھی۔" عظمیٰ کے ٹانسلز کے پیش نظر ابو نے منع کیا ہوا تھا کہ املی اور کھٹی چیزوں کا زیادہ استعمال نہ کرو، پھر بھی کبھی کبھار یمنیٰ کچھ بنالیتی تو عظمیٰ سے پرہیز نہیں ہوتا تھا، جب کبھی وہ بیمار ہوتی ڈانٹ دونوں کو پڑتی، اسی لیے یمنیٰ چوکنا ہوگئی تھی۔

"بے فکر رہو، ساری چٹنی نہیں کھائی، تھوڑی سی چھوڑ دی ہے۔" عظمیٰ کو اس کی تشویش پر ہنسی آئی۔

وہ ابھی کھانا کھا ہی رہی تھی کہ علی چلا آیا۔ سلام کرکے ہاتھ میں پکڑا ڈونگا اس نے عظمیٰ کے سامنے رکھ دیا۔

"وعلیکم السلام، کیا لائے ہو؟" عظمیٰ ڈونگے کا ڈھکن کھول کر جائزہ لینے لگی۔

"پائے لائے ہو اتنی دیر میں، جب میں نے کھانا کھالیا۔" عظمیٰ نے ڈپٹ کر کہا۔

"بھابھی نے دیا ہی اب ہے، میں کیا کرتا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"بیٹھ جاؤ علی، یہ تو ایسے ہی فضول بولتی رہتی ہے۔" یمنیٰ نے سوئی سے ٹانکا بھرتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"خوش نصیب ہو، بڑی اچھی بھابھی ملی ہیں تمہیں۔" عظمیٰ اسے دیکھ کر کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی تھی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" علی نے اس کی بات کی تائید کی۔

"اب تم بھی ایسی ہی اچھی بیوی لانا، اچھا۔" عظمیٰ نے بڑی بوڑھی بن کر اسے نصیحت کی۔

"جی۔" روکنے کے باوجود بھی علی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔



"اوہو، اپنی شادی کا ذکر سن کر بڑی خوشی ہو رہی ہے، ہیں، کہیں کوئی پسند کرکے تو نہیں رکھی۔" عظمیٰ نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"نن.... نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" علی اک دم گھبرا گیا۔

"تو جب بھی ایسی ویسی کوئی بات ہو، سب سے پہلے مجھے بتانا۔"

"جی!" علی تقریباً" ہر ایک سے ہی ایسی تابعداری سے بات کرتا تھا۔

"علی! ذرا ہمارے سنک کا نل تو دیکھ لینا، کل سے لیک رہا ہے، اگر تم سے ٹھیک ہوجائے تو دیکھ لو، ورنہ کسی پلمبر کو لے آؤ، باسط بھائی نے ٹھیک کرنے کی کوشش کی، مگر ان سے ہوا نہیں۔ رات میں دونوں دیر سے گھر آتے ہیں۔ پلمبر کو بلانا بھی ایک مسئلہ ہے، ابو کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ جوڑوں کے درد نے نہیں آنے جانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" یمنیٰ اپنی مروت کی عادت سے مجبور اس کے سامنے وضاحتیں پیش کررہی تھی، حالانکہ علی ان سے زیادہ منکسرالمزاج اور بامروت تھا، ہمیشہ کی طرح جھٹ سے ہامی بھر بیٹھا۔

"ابھی دیکھ لوں؟" وہ مسکرایا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" یمنیٰ سے پہلے عظمیٰ نے اسے جواب دیا۔

"کیوں بلاوجہ بے چارے کو تنگ کرتی ہو؟" علی کے کچن میں جانے کے بعد اس نے عظمیٰ کی کلاس لینا شروع کی جو وہ اکثر لیتی تھی۔

"پتا نہیں کیوں، اس کی اتنی یتیم، مسکین شکل دیکھ کر اسے چھیڑنے کو دل کرتا ہے۔" عظمیٰ ہنسنے لگی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو، وہ بے چارہ یتیم مسکین ہی ہے۔" یمنیٰ نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اُفوہ، میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں اس سے مذاق کرتی ہوں، مذاق اڑاتی نہیں ہوں۔" عظمیٰ بھی بات صاف کرتے ہوئے سنجیدہ ہوگئی۔

"کسی کی سادگی اور مروّت کا یوں مذاق نہیں بناتے، بری بات ہے، وہ بے چارہ کتنا کنفیوز ہوجاتا ہے تمہارے سامنے۔"

"میں یہ ہی تو چاہتی ہوں کہ وہ کنفیوز نہ ہوا کرے، دوبدو جواب دیا کرے، ڈٹ کر مقابلہ کرے، انسان کو اتنا بامروت اور اتنا اچھا نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کہے، چپ چاپ سن لے، کچھ بھی کرے، چپ چاپ سہہ لے، تم از کم ایک مرد کو تو اتنا کمزور اور بودا نہیں ہونا چاہیے۔"

"زندگی سب کچھ سکھا دیتی ہے، وقت اور حالات سے بڑا استاد کوئی نہیں۔ ان کے سکھائے اور پڑھائے ہوئے اسباق انسان کو ساری عمر ازبر رہتے ہیں۔" یمنیٰ نے آخری ٹانکا مکمل کرکے اسے قینچی سے کاٹا۔

"دیکھو، کیسا لگ رہا ہے؟" یمنیٰ نے بڑے فخر سے فریم اس کے آگے کیا۔ ابھی ایک بیل مکمل ہوئی تھی، خوش رنگ ریشمی دھاگوں سے بہت نفاست اور صفائی سے کام کیا تھا۔

"سچ مچ.... بہت خوب صورت لگ رہا ہے، بالکل اصلی پھول لگ رہے ہیں۔" عظمیٰ نے بہن کی محنت کو خراج تحسین پیش کیا، جسے اس نے ایک جگمگاتی مسکراہٹ اور انکساری میں لپٹے شکریے سے قبول کیا۔

"ہائی داوے، ایک ایک ٹانکا بڑا دل لگا کے بھرا ہے۔" عظمیٰ نے شرارتی انداز اختیار کیا۔

"جو بھی کام کرو، محنت کے ساتھ دل لگا کے کرو۔" یمنیٰ نے بچپن میں پڑھا قاعدے کا آموختہ سنایا۔

"ہاں ضرور، خاص طور پر وہ پھول تو بہت ہی محنت سے دل لگا کر بنانے چاہییں جو شاید کسی کے سہرے میں سجیں۔" عظمیٰ اپنی بہن کو چھیڑنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

"اب یہ برتن اٹھاؤ جاکر اپنے ہاتھ دھوؤ اور یہ سالن فریج میں رکھ دینا۔" یمنیٰ نے بے ساختہ امنڈ آنے والی مسکراہٹ اپنے لبوں میں دبائی اور اسے حکم نامہ جاری کیا۔

"ہاں بھئی، کوئی اور آرہا ہے زندگی میں، اب ہمیں تو بھگاؤ گی ہی۔" عظمیٰ نے برتن اٹھاتے ہوئے ایک

مصنوعی آہ بھری۔

وہ کچن میں گئی تو علی سنک ٹھیک کرنے میں لگا پڑا تھا۔

"کیا ہوا، ٹھیک نہیں ہوا ابھی تک۔" عظمیٰ نے برتن کاؤنٹر کے سلیب پر رکھے۔

"لمبا کام ہے، ایک دو چیزیں آئیں گی میں لے آتا ہوں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا! یمنیٰ سے پیسے لے کر جانا۔"

"نہیں، میں لے آؤں گا، پیسے ہیں میرے پاس۔"

"جی نہیں، آپ یمنیٰ سے پیسے لے کر جائیے گا، چیزوں کے لیے، بلکہ اپنی مزدوری بھی لینا، پاگل ہو جو فری میں کام کرو گے۔" عظمیٰ اسے پٹیاں پڑھا رہی تھی۔

"ایسی کیا بات ہے، خالہ کا گھر ہے، کسی غیر کا تھوڑی، میری ذرا سی محنت سے آپ کا کوئی کام سنور جائے اس سے اچھی بات کیا ہو گی۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں معقول بات کر رہا تھا۔

"بس یہ ہی سارا مسئلہ ہے کہ تم دل کے بہت اچھے ہو۔" عظمیٰ نے سالن کا ڈونگا فریج میں رکھا۔

"کیا مطلب؟" وہ اپنے بارے میں عظمیٰ کے اس تجزیے پر حیران پریشان ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ اتنا اچھا بننے اور ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تھوڑی سی چالاکی، تھوڑی سی ہوشیاری بلکہ مکاری بھی سیکھو۔" عظمیٰ بڑے نادر و نایاب مشورے دے رہی تھی اسے۔

"کیوں؟"

"کیونکہ زندگی گزارنے کے لیے یہ سب ضروری ہے۔" عظمیٰ نے سمجھایا۔

"مگر میں تو ٹھیک ٹھاک زندگی گزار رہا ہوں، ان کے بغیر بھی۔" علی نے اپنے اسی سادہ سے انداز میں جواب دیا۔

"اُفوہ!" عظمیٰ اپنے سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ "تمہیں تو کچھ سمجھانا بھی بس بھینس کے آگے۔۔۔ نہیں بیل کے آگے بین بجانا ہے۔" اس نے سامنے کھڑے فرد کے لحاظ سے محاورے میں تبدیلی کی۔

"پتا نہیں آپ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہیں۔" علی کہتا ہوا کچن سے باہر نکل گیا۔

"ارے واہ! ہماری بلی ہم ہی سے میاؤں۔" عظمیٰ اس کے تبصرے پہ جز بز ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم کیا کھٹر پٹر۔ کر رہی ہو اتنی دیر سے؟" یمنیٰ کچن میں داخل ہوئی تو عظمیٰ بڑے انہماک سے سر جھکائے سموسوں کی پٹیوں میں فلنگ بھر بھر کے سموسے بنا کر ایک طرف رکھتی جا رہی تھی۔

"تمہارے مہمانوں کی لذت کام و دہن کا انتظام۔" یمنیٰ کو سلیس اردو میں مختصر جواب ملا۔

"مہمانوں کو خوش کرنا ہے، بھگانا نہیں ہے۔" یمنیٰ اس کی تیار کردہ فلنگ چمچے سے اٹھا کر چکھنے لگی۔

"ماشاءاللہ بڑی چہک رہی ہو آج۔" عظمیٰ جتنی تیزی سے کام نمٹا رہی تھی اتنی ہی پھرتی اس نے جواب دینے میں دکھائی۔

"ابو نے ان تینوں کو پتا نہیں کیوں نہیں بلایا، یہ لوگ بھی آجاتیں کتنا مزا آتا ہے نا۔" عظمیٰ کا اشارہ اپنی تینوں شادی شدہ بہنوں کی طرف تھا۔

"ابو کہہ رہے تھے کہ خالہ اور خالو بس دو افراد ہی تو آ رہے ہیں، بات آگے بڑھے تو سب کو بلائیں گے۔"

"بات تو آگے بڑھے گی ہی بھلا رکاوٹ ہی کیا ہے، نہ کوئی ولن، نہ کوئی ظالم سماج، بالکل سیدھا سادا آسان معاملہ ہے۔" عظمیٰ لاپروائی سے بول رہی تھی۔

"جن چیزوں اور معاملات کو ہم بہت آسان سمجھتے ہیں، وہ کبھی کبھی مشکل بھی نکل آتے ہیں۔" یمنیٰ کا انداز فلسفیانہ ہو گیا۔

"بہر حال یہاں تو سیدھی سیدھی شاہراہ دور تک صاف جاتی نظر آتی ہے، کہیں کوئی روڑا، کنکر، پتھر نہیں ہے۔" عظمیٰ نے آخری سموسہ بنا کر ٹرے میں رکھا۔

"مہمان بہت دیر میں آئے، خالو کو آفس میں دیر ہو گئی تھی، باسط بھائی بھی گھر آ گئے تھے۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر رہے تھے، یمنیٰ اور عظمیٰ دونوں الرٹ ہو گئیں اور جلدی جلدی چائے کے اہتمام میں لگ گئیں۔"

یمنیٰ سنہری سنہری سموسے تل کر ٹشو پیپر پر رکھتی جا رہی تھی، عظمیٰ نے باقی اشیائے خورد و نوش ٹرالی میں سیٹ کیں اور ڈرائنگ روم میں لے گئی، جہاں خالہ، خالو، ابو اور باسط بھائی باتیں کر رہے تھے۔

"ارے بھئی، میری بیٹی کو تو بلاؤ اور یہ تم لوگوں نے اتنا تکلف کیا کر لیا، ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں۔" خالہ بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں۔

"آپ کی بیٹی صاحبہ ابھی آ رہی ہیں اور رہی بات تکلفات کی تو آپ کی جگہ کوئی غیر ہوتے تو شاید اتنا اہتمام نہ کرتے، اپنے ہیں، تب ہی تو کیا ہے۔" عظمیٰ نے ان کی باتوں کا بالترتیب جواب دیا اور سب کو چیزیں پیش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر میں یمنیٰ بھی چائے لے کر آ گئی تھی، وہ بہت کنفیوز ہو رہی تھی۔ سلام کر کے واپس جانے کے لیے مڑی تو خالہ نے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ارے تم کہاں جا رہی ہو، یہاں بیٹھو، میرے پاس۔"

"بس بھائی صاحب! ہماری آپا کی نشانی تو آپ ہمیں دے دیں۔" تھوڑی دیر بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے ابو کو مخاطب کیا۔

"ہاں بھئی، ہم نے طے کیا ہے کہ یمنیٰ کو آپ ہماری بیٹی بنا دیں اور باسط کو ہمارا بیٹا۔" خالو بڑے اطمینان سے چائے کا گھونٹ بھر کے بولے۔

"یہ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" خالہ کے منہ سے بے دم نکلا، ابو سمیت کمرے کے سارے نفوس حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے اور پھر یہ حیرانی بتدریج پریشانی میں ڈھلتی گئی۔

"باسط کے لیے تو اللہ بخشے مرحومہ آپا نے زرین کو مانگ لیا تھا۔" خالہ نے اٹک کر بولتے ہوئے کچھ خائف ہو کر شوہر کو دیکھا جن کا مزاج پل پل بدلتا تھا، گھڑی میں اولیا، گھڑی میں بھوت۔

"تو کیا ہوا؟ احسن کے لیے بھی میں نے اپنی بھتیجی کو سوچ رکھا تھا، مگر اب اس نے یہاں کے لیے ضد پکڑ لی تو ہم یہاں آ گئے، آج کل کے بچے ماشاءاللہ ہوشیار ہیں، اپنے لیے راستے خود ہی نکال لیتے ہیں۔ دوپٹے گلے میں ڈالنے والیاں تو یوں ہی بدنام ہیں، لوگ تو پردے میں رہ کر بھی کام دکھا جاتے ہیں۔" خالو نے ہنس کر سگریٹ سلگایا اور باقی سب کے چہرے اور دل بجھ کر راکھ ہونے لگے۔

کچھ دیر کے لیے عجیب سی خاموشی کی چادر سب کے درمیان پھیل گئی، جو اجنبیت اور دکھ کے تانے بانے سے بنی ہوئی تھی۔

"ہمیں کچھ وقت دیجیے خالو! ہم سوچ کر جواب دے دیں گے۔" باسط بھائی نے اپنے نرم انداز اور لفظوں سے اس چادر میں شگاف ڈالا۔

"ہاں، ہاں صاحبزادے! بے شک جتنا چاہے ٹائم لو، اچھی طرح سوچ سمجھ لو، پھر فیصلہ کر لینا، ہمیں کوئی جلدی نہیں۔" خالو کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

عظمیٰ کو شدید غصے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یمنیٰ کو گہرا صدمہ پہنچا تھا وہ وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتی تھی، مگر اچانک ہی اسے اپنے پاؤں من بھر کے محسوس ہونے لگے تھے، سارا جسم بشمول دل جیسے پتھر کا بن گیا تھا۔

قدموں تلے زمین کا سرک جانا کیا ہوتا ہے، اسے آج علم ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

بھابھی اپنے میکے سے کل ہی واپس آئی تھیں، صحن بچوں کی آوازوں، ہنسی اور شرارتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی محنت اور خوب صورتی سے سجے گملوں کے پھولوں اور بیلوں پر بہار آ چکی تھی۔ رنگ برنگے کھلے ہوئے پھول اور ترو تازہ شاداب بیلیں نظروں کو تراوٹ بخش رہی تھیں، ہوائیں پھولوں کی خوشبو گھلی ملی تھی۔

"بہار آ گئی۔ مگر۔۔۔" یمنیٰ نے خالی خالی نظروں سے

جھومتے پھولوں کو دیکھا۔

دل اور زندگی میں خزاں نے ڈیرے جما لیے تھے اور یوں بھی نہیں تھا کہ یہ کوئی افلاطونی عشق کا معاملہ تھا' بس ایک ان دیکھی اپنائیت کی زنجیر اور انجانے سے احساس کی ڈور نے دونوں کو جیسے باندھ لیا تھا۔ فقط ایک بار احسن نے ان جذبوں کو زبان دی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے ہی کی تو بات تھی جب بڑے ماموں کے اظفر بھائی کی شادی میں' یمنیٰ کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ پل پل احسن کی نظروں کے گھیرے میں ہے' اور پھر موقع پا کر اس نے یمنیٰ کو مخاطب کیا۔

"بات سنو یمنیٰ! ذرا یہ پکڑنا۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوبصورت سا سرخ گلاب اسے تھمایا۔

"کیا کروں؟" ایک لحظہ کو یمنیٰ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' وہ پھول تھامے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"سنبھال کے رکھنا' یہ میرا دل ہے۔" احسن مسکرا کر بولتا ہوا پلٹ گیا۔

بس وہ ایک لمحہ تھا جس نے آج بھی اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا' آج جب کہ وہ پھول مرجھا چکا تھا اور شاید اس کا دل بھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے ان پھولوں کو دیکھے چلی گئی جو مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔

ابو نے بڑی آپا اور چھوٹی آپا سے مشورہ کر کے خالو کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ خود یمنیٰ بھی تو ان کے اس مطالبے سے خائف ہو گئی تھی' اس نے خود بھی ابو سے منع کر دیا تھا زرین نے بچپن سے ہی باسط کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی بھلا اسے کیا حق تھا کہ اپنے دل کو شاد کرنے اور اپنے خوابوں کا نگر آباد کرنے کے لیے وہ زرین کے خواب ان آنکھوں سے نوچ ڈالتی۔ اسے بھلا کیا حق تھا کہ اپنی زندگی میں اجالے بکھیرنے کے لیے وہ زرین اور باسط کی زندگی میں تاریکیاں بھر دیتی۔ ایسی خود غرض تو وہ کبھی نہ تھی' مگر اس کے قدم ڈگمگانے کو احسن پھر راہ میں آ گیا تھا۔

"تم تھوڑا سا تو میرا ساتھ دو یمنیٰ! انکل کو سمجھاؤ' امی راضی ہیں' ابو بھی راضی ہو ہی جائیں گے' میں کوشش تو کر رہا ہوں۔"

"رہنے دیں احسن! اپنے بڑوں سے بغاوت مت کریں' ہو گا تو وہ ہی جو ہمارے نصیب میں ہے۔" اس نے دھیرے سے احسن کو اور خود کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"پلیز یمنیٰ تم!"

"ہمارے بڑوں کو فیصلہ کرنے دیں' ہمیں ان کی باتیں کتنی ہی ناگوار گزریں' بہرحال وہ ہمارے خیر خواہ ہیں۔" یمنیٰ نے اس کی بات کاٹ کر اپنی بات مکمل کی اور پھر لائن کاٹ دی تھی۔

"پتا نہیں کیوں سیدھی راہ چلتے چلتے ہم ان راستوں پر کیوں مڑ جاتے ہیں جو ہمارے راستے نہیں ہوتے' ان منزلوں کی کھوج کیوں کرنے لگتے ہیں جو ہمارا مقدر نہیں ہوتیں' ان بہاروں کی آرزو کیوں کرنے لگتے ہیں جو ہمارے لیے نہیں ہوتیں۔" اس نے ایک گہری سانس لی' خود کو سمجھانے کی کوشش بہت کمزور ہی سہی مگر یہ کوشش ضروری تھی کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

"بہت بزدل اور بے وقوف ہو تم۔" عظمیٰ اس کے پاس آن بیٹھی اور چاول چننے لگی۔

"ہو سکتا ہے۔" یمنیٰ نے اتنی دھیمی آواز میں جواب دیا کہ عظمیٰ بمشکل سن سکی۔

"تمہیں دکھ ہو رہا ہے یمنیٰ؟"

"ہم اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتے۔"

"بزدلی اور بے بسی۔ مقدر کو ملزم ٹھہرا کر خود بری ہو جاتے ہیں۔" عظمیٰ ترخ کر بولی تو یمنیٰ کے لبوں پر ایک بے بس سی مسکراہٹ ٹھہر گئی' کسی خزاں آلود شام کی طرح پھیکی پھیکی ویران سی۔

"اب رو کیوں رہی ہو' شکل ٹھیک کرو اپنی۔" عظمیٰ کو غصہ آ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں' اگر نہیں بھی ہوں تو ہو جاؤں گی' تم پریشان مت ہو' لاؤ چاول ادھر دو' میں چن لیتی ہوں۔" یمنیٰ نے اس کے ہاتھ سے تھال لے لیا۔

"یہ لو۔" عظمیٰ تو جیسے اس کے کہنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جھٹ سے اسے تھال تھما دیا۔

"میرا رزلٹ آنے والا ہے۔" کچھ دیر بعد عظمیٰ نے اسے اطلاع دی۔

"ہوں۔"

"مجھے رزلٹ کی بہت ٹینشن ہو رہی ہے۔" عظمیٰ اضطراری حالت میں اپنا ناخن چبانے لگی' وہ پریشان ہوتی تو یہ ہی کرتی تھی۔

"تم ہر معاملے کو حد سے زیادہ خود پر سوار کر لیتی ہو' اللہ پر چھوڑ دیا کرو' سکون سے رہو گی۔" یمنیٰ نے مشورہ دیا۔

"پتا ہے میں سوچتی ہوں کہ اکثر جو ہم چاہتے ہیں یا جیسا چاہتے ہیں ویسا کیوں نہیں ہوتا' ہمیشہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ کیوں ہو جاتی ہے؟"

"ہر کام اور ہر معاملہ اللہ کے حکم سے وقوع پذیر ہوتا ہے' یہ بات سمجھ میں آ جائے تو ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔"

"تم بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار ہو' میں ایسی نہیں ہوں نا۔" عظمیٰ نے جیسے اعترافی بیان دیا۔

"تم نے ابو کے کپڑے دھو دیے؟" یمنیٰ نے موضوع بدلا۔

"ہاں ابھی کھنگالنے جا رہی ہوں' بہت دیر پہلے بھگوئے تھے۔" عظمیٰ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لی۔

"کام کے نام پر تمہیں جمائیاں کیوں آنے لگتی ہیں؟"

"لو بھئی' اتنا تو کام کرتی ہوں گھر کا' پھر بھی سننے کو ملتی ہے۔" عظمیٰ کا موڈ کب کس بات پہ خراب ہو جائے' کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

"لاؤ دو۔" عظمیٰ کھڑی ہو گئی اور چاولوں کے تھال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"یہ لو۔"

"بات سنو۔" یمنیٰ نے جاتے ہوئے اسے آواز دی۔

"کیا؟"

"کھانا اچھے موڈ میں پکایا جائے تو اچھا پکتا ہے۔" یمنیٰ کی مسکراہٹ بہت واضح تھی۔

"مشورے کا شکریہ۔" عظمیٰ مزید بھنا گئی اور یمنیٰ کی ہنسی نکل گئی۔

"شکر ہے' اتنے دنوں بعد تم کھل کر تو ہنسیں۔" عظمیٰ اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولی۔ یمنیٰ نے اپنے لب بھینچ لیے۔

"درد کیسا بھی ہو' مسکراہٹ نہیں کھونا چاہیے۔"

"اچھا فقرا ہے۔" عظمیٰ بھی مسکرا دی اور کچن کی طرف چل پڑی۔

پورا گھر بھانت بھانت کی آوازوں' ہنسی اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی آپا' چھوٹی آپا' فروا' تینوں کے شوہر صاحبان اور بچے' پھر بڑی امی بھی اپنی دونوں بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔

یمنیٰ اور عظمیٰ تو صبح سے کچن میں مصروف تھیں' بڑی آپا بھی ان دونوں کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ فروا تو خیر بچوں میں ہی الجھی رہتی تھی۔ چھوٹی آپا بھی اس تین سالہ بچے کو سنبھالنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں جو بقول عظمیٰ کے انہیں بری میں ملا تھا۔

گرمیاں آ گئی تھیں' بجلی معمول کے مطابق اپنے وقت پر گئی تو تقریباً سب ہی لوگ چھت پر چلے گئے' سوائے ان دو' تین افراد کے جو بس کچن کا کام آخری مراحل میں سمیٹ ہی رہے تھے۔

"خالو سے یہ امید نہیں تھی ہمیں۔" بڑی آپا نے برتن دھوتے ہوئے بے حد دل سوزی سے کہا۔ "احسن کا بھی فون آیا تھا میرے پاس' کہہ رہا تھا کہ میری ہیلپ کریں۔"

"چھوڑیں آپا! ختم کریں اس قصے کو' کوئی اور بات کریں۔" عظمیٰ نے بے زاری سے کہا۔

"ختم تو ہو ہی گئی ہے بات' ہم کیا ختم کریں' اچھا بھلا

لڑکا تھا احسن' پھر خالہ کا گھر' ہم تو بہت خوش تھے کہ ہماری بہن اپنوں میں جارہی ہے۔" آپا نے ایک آہ بھری۔

"جب آپ تینوں غیروں میں گئی ہیں تو یمنیٰ کا بھی کچھ ایسا ہی بندوبست ہوجائے گا۔ ان شاءاللہ احسن بھائی سے اچھا ہی لڑکا ملے گا ہماری یمنیٰ کو خالو کو تو خدا سمجھے' پتا نہیں کیا سمجھنے لگے ہیں خود کو اتراتی شکل' ہونہہ۔" عظمیٰ نے رائتے کے لیے دہی پھینٹتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالی۔

"ہم ہر معاملے کو فقط اپنی نظر سے دیکھتے ہیں' اسی لیے بہت آسانی سے کسی کو بھی اچھا یا برا بنادیتے ہیں۔ آپ لوگ تھوڑا سا غیر جانبدار ہو کر سوچیں ہر ماں' باپ اپنی بیٹی کے لیے اچھا بر اور اچھا گھر چاہتے ہیں' خالو نے بھی اسی خواہش کا اظہار کردیا کہ اگر وہ اس گھر سے ایک لڑکی لے رہے ہیں تو ایک دے بھی دیں' انہوں نے بھی تو یہ ہی سوچا نا کہ باسط بھائی اچھے لڑکے ہیں' ہم لوگ دیکھے بھالے ہیں' اب بات نہیں بنی تو۔" یمنیٰ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

"کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے' بس ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔" چند لمحوں بعد وہ دوبارہ بولی تو اس کا لہجہ ہموار اور ٹھہرا ہوا تھا۔

"اوپر چلیں!" اپنا کام ختم کرکے وہ سنک میں ہاتھ دھورہی تھی۔

"ہاں تو اور کیا' ذرا دیکھیں تائی امی نے تو اب تک چھوٹی آپا کا مفصل انٹرویو لے لیا ہوگا۔" عظمیٰ نے فوراً" ہامی بھری۔

وہ تینوں اوپر گئیں تو چھت پر بچے الگ دھما چوکڑی مچائے ہوئے تھے۔ زنانہ و مردانہ محفلیں الگ الگ جمی ہوئی تھیں۔ مردوں کے پاس ایک ہی موضوع تھا' سیاست' جس پر دھواں دھار بحث جاری تھی' جب کہ خواتین کی محفل میں مختلف موضوعات زیر بحث تھے۔ بات کہاں سے شروع ہوتی اور کہاں جا نکلتی۔ عظمیٰ کا خیال صحیح تھا۔ تائی امی' چھوٹی آپا کو ہی گھیر کر بیٹھی ہوئی تھیں کہ ان کی شادی کے بعد سرسری ایک' دو ملاقاتیں تو ہوئی تھیں' مگر تفصیلی ملاقات اب ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ کسی کی اولاد پالنا آسان تھوڑی ہے' لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے' بڑا دل جگرا چاہیے تمہاری ہمت کو شاباش ہے۔" وہ چھوٹی آپا سے اظہار ہمدردی کررہی تھیں' جب یہ تینوں ان کے پاس جا کر بیٹھیں۔

"عالیہ کی شادی میں کب بلا رہی ہیں بڑی امی؟" عظمیٰ نے بات کا آغاز کرکے موضوع تبدیل کیا۔

"بس بیٹا! کمیٹی کھلنے کا انتظار ہے۔ تین مہینے بعد ملے گی تو پھر تاریخ دے دیں گے۔ اس کے سسرال والے تو کب سے اصرار کررہے ہیں کہ جلدی کر(دیں)' میں نے کہا کہاں سے کردیں' ہاتھ میں کچھ رقم ہو تو شادی کے لیے کھڑی ہوں' خالی ہاتھ کیا کام ہوگا بھلا' مہنگائی نے تو ہم غریبوں کا خون ہی نچوڑ لیا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے بڑی امی' مہنگائی واقعی حد سے زیادہ ہوگئی ہے' آئے دن کسی نہ کسی چیز پر پیسے بڑھ رہتے ہیں' خاص طور پر کھانے پینے کی چیزوں پر نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ روکنے والا۔"

بڑی آپا نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔ اس ہوش ربا مہنگائی میں شوہر کی محدود آمدنی اور چار بچوں کے ساتھ وہ جس طرح گزارا کررہی تھیں' وہ ہی جانتی تھیں۔

"ہاں میں نے بھی یہ ہی سوچا ہے۔"

"ارے خدیجہ! یہ تمہارے خالو کو بھلا کیا سوجھی' بڑھو سٹھیا تو نہیں گیا' حالانکہ ابھی اتنا بڑھاپا بھی نہیں آیا۔" بڑی امی نے اچانک ہی بڑی آپا کو مخاطب کرکے میزائل داغا تو باوجود موضوع کی سنجیدگی کے سب کو ہنسی آگئی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں بڑی امی! ان کی مرضی کہہ لیں یا نصیب' بات نہیں بننی تھی سو نہیں بنی۔" انہوں نے سبھاؤ سے جواب دیا۔

"اچھا خاصا رشتہ ہورہا تھا' بیچ میں ٹانگ اڑا کر کیا ہوگیا۔ تمہاری خالہ بے چاری تو بڑی بھلی مانس ہے' اچھا تھا یمنیٰ وہیں کھپ جاتی' مجھے تو وہ لڑکا بڑا ہی اچھا لگتا ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں' احسن' کیسی اچھی جوڑی ہوتی۔" وہ عادت کے مطابق نان اسٹاپ بولے جارہی تھیں۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی یمنیٰ کے چہرے پہ تاریک سا سایہ لہرا ہی گیا۔ عظمیٰ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور فرحین بول پڑی۔

"چھوڑیں نا امی! جو بات ختم ہوگئی اس کا بلاوجہ کیا ذکر' آپ بھی بس موقع محل دیکھے بغیر شروع ہوجاتی ہیں۔" اس نے خفیف ہو کر کہا۔

"اے ئے۔۔۔ میں تو بس یوں ہی' مجھے اچانک یاد آگیا تو میں بول پڑی' ارے بچی تو دل پر مت لے' ان شاءاللہ اس سے بھی اچھا بر ملے گا تجھے اور اس بڈھے سے اچھا سسر۔" ان کے اظہار ہمدردی پر سب کے ساتھ یمنیٰ بھی بے ساختہ مسکرا دی۔

"جو اللہ کا حکم بڑی امی! اس سے زیادہ ہمارا خیر خواہ کوئی نہیں۔" یمنیٰ ان سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔" انھوں نے فوراً" ہاں میں ہاں ملائی۔

کچھ دیر اور ادھر ادھر کی باتوں میں ڈیڑھ گھنٹہ پورا ہوگیا اور بجلی آگئی۔ ساری لڑکیاں نیچے آگئیں اور کھانا لگانے لگیں۔

کھانا کھا کر بڑی امی کی فیملی چلی گئی' گھر میں پھر بھی رونق تھی کہ تینوں لڑکیاں آج ویک اینڈ پر رکنے آئی ہوئی تھیں۔

یمنیٰ نے بڑے سے لاؤنج میں سب کے بستر لگا دیے تھے' رات بھیگتی جارہی تھی مگر بہنوں کی آپس کی باتیں ختم نہیں ہورہی تھیں' عفرا کے بچے سوئے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

"سچ آپا! میں تو اکثر سوچتی ہوں کہ ہمارے امی' ابو نے ماشاءاللہ ہم سات بہن' بھائیوں کو کیسے پالا' وہ بھی اوپر تلے کے۔ ہم تو ان دو میں ہی چکرا کر رہ گئے۔" عفرا بڑی آپا سے مخاطب ہوئی۔

"پہلے کے بچے سیدھے سادے اللہ کی گائے ہوتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں۔" یمنیٰ نے تبصرہ کیا۔

"ماؤنٹ ایورسٹ پر کسی کو برف بھی دیں۔" عظمیٰ نے ٹکڑا لگایا۔

"وقت کی رو بھی تو تیز ہوگئی ہے۔ انسانی دماغ کیوں نہ تیز ہو' چاہے بچوں کا ہی سہی۔ سال' مہینے بن گئے ہیں' مہینے دن اور دن گھنٹوں کی طرح جلدی جلدی گزر رہے ہیں' یہ ہی قرب قیامت ہے۔" بڑی آپا نے ایک گہری سانس لی۔ بات کہاں سے نکلی اور کہاں پہنچ گئی۔

"اور چھوٹی آپا! آپ اپنی سنائیے!" یمنیٰ نے چھوٹی آپا کو مخاطب کیا۔

"بس' گزر رہی ہے زندگی' کیا سناؤں؟" ان کا انداز سادہ سا تھا' نہ کوئی شکوہ' نہ شکایت' کوئی طنز نہ حکایت' پھر بھی جانے کیوں عظمیٰ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ پتا نہیں ان تینوں نے بھی کچھ محسوس کیا ہے یا نہیں۔ وہ یک ٹک چھوٹی آپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچنے لگی سانولی رنگت پر سادہ سے نقوش' ان کے دل اور زبان کی طرح۔

"پتا نہیں اللہ تعالیٰ نے میری اتنی اچھی بہنوں کے لیے یہ آزمائشیں کیوں رکھی ہیں۔" وہ بڑی آپا اور چھوٹی آپا کے ان بچوں کے متعلق سوچنے لگی جنہیں جنم دیے بغیر وہ ان کی مائیں بنی تھیں۔

"حسان کو سنبھال لیتی ہو آسانی سے؟" عفرا' چھوٹی آپا سے پوچھ رہی تھی۔

"بہت مشکل سے۔ بہت تنگ کرتا ہے۔ ابھی تک مانوس ہی نہیں ہوا مجھ سے۔" انہوں نے دل گرفتی سے جواب دیا۔

"ہوجائے گا' آہستہ آہستہ ہوگا۔ کچھ وقت لگے گا' پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ان شاءاللہ" بڑی آپا نے گویا تسلی دی۔

"ہاں میں بھی یہ ہی سوچتی ہوں' مگر کبھی کبھی بہت ناممکن لگنے لگتا ہے' اوپر سے لوگوں کی باتیں' ہمت ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے میری' اگر احمد اتنے تعاون کرنے والے نہ ہوتے تو پتا نہیں کیا ہوتا' دراصل۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر رکیں' پھر دوبارہ کہنے لگیں۔ "دراصل گھر والوں سے زیادہ باہر کے لوگوں کو فکرات لاحق ہوتی

ہیں۔ سگی ماؤں کو اتنی تفتیشی نظروں سے نہیں جانچا جاتا، مگر ہم جیسی ماؤں کے لیے لوگ آنکھوں میں خوردبین فٹ کر لیتے ہیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے، کیا سگی کیا سوتیلی۔ کیا سگی مائیں اپنے بچوں کو ڈانٹتی، مارتی نہیں؟ کبھی کسی معاملے میں لاپروا نہیں ہوتیں؟ کیا وہ بچے کبھی بیمار نہیں ہوتے؟ لیکن انہیں اس طرح کانٹوں پر نہیں چلنا پڑتا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں لوگوں کی باتوں کی وجہ سے اس بچے سے ہی متنفر نہ ہو جاؤں، پھر میں سوچتی ہوں کہ اس بے چارے بچے کا کیا قصور ہے۔ لوگوں کی زبانیں جو آتش فشانی کرتی ہیں، میں وہ آگ خود پر تو جھیل رہی ہوں، بچے کو کیسے اس آگ کی نذر کر سکتی ہوں۔" چھوٹی آپا بہت بے بسی سے بول رہی تھیں۔

"حوصلہ رکھو بنیش! دل بڑا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، مگر ایک بار کر لوگی تو بہت آسان لگے گا، اگر اللہ نے ہمارے لیے یہ ذمہ داری لکھی ہے تو راضی سے یا ناراضی سے، اس کا سامنا تو ہمیں کرنا ہی ہے۔ بہتر ہے کہ اللہ کی مرضی پر راضی ہوتے ہوئے اسی سے ہی مدد مانگتے رہیں۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو ہمارے راستے آسان کرے۔" بڑی آپا دھیمے دھیمے سمجھا رہی تھیں۔

"ایک تو نیند بھی نہیں آ رہی۔" عظمیٰ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی۔

"بے کار اور فضول خیالات سے دماغ خالی کر لو، بہت اچھی نیند آئے گی۔" یمنیٰ نے مشورہ دیا۔

"میرا دماغ خالی ہی ہے۔" عظمیٰ نے جلدی سے جواب دیا، اس کا مطلب یہ ہی تھا کہ وہ کچھ بھی الٹا سیدھا نہیں سوچ رہی ہے، مگر وہ چاروں اس کی وضاحت سن کر بے ساختہ ہنس پڑی تھیں اور ان کی ہنسی سن کر عظمیٰ کو احساس ہوا کہ وہ کیا بول گئی ہے۔

"ہمیں پتا ہے، بتانے کی ضرورت نہیں ہے، اب آیۃ الکرسی اور چاروں قل پڑھو اور جو دعائیں یاد ہیں وہ پڑھو اور آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ بہت اچھی نیند آئے گی۔"

"ہاں۔ یہ سب مجھے بھی پتا ہے، مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" عظمیٰ کھسیانی ہو کر لیٹ گئی اور جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

صبح کا اجالا دھیرے دھیرے ابھی پھیلنا شروع ہوا تھا، عظمیٰ تسبیح لے کر صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہے۔" اس نے بے اختیار سوچا۔

بڑی آپا تو نماز اور قرآن پڑھ کر کچن میں جا رہی تھیں۔ آج ناشتے میں حلوہ پوری اور کچوریوں کا پروگرام تھا۔ ابو اور بھائی لوگ تو بازار سے لانے کو تیار تھے۔

"رہنے دو، تم کہاں ان جھنجٹوں میں پڑو گی، شادی سے پہلے کی بات اور تھی، بچوں کے ساتھ سب کام کیسے کرو گی۔" ابو ہمدردی سے بولے اور بڑی آپا مسکرا دیں۔

"کر لوں گی ابو! صبح تو یہ لوگ سو رہے ہوں گے، اتنا مسئلہ نہیں ہوگا، پھر یہ چاروں بھی تو ہیں ہاتھ بٹائیں گی نا۔"

بڑی آپا کو علم تھا کہ ابو کو ان کے ہاتھ کا گرما گرم خوشبودار حلوہ، خستہ پوریاں اور کچوریاں اور آلو چھولے کی ترکاری کتنی پسند تھی اور سچ تو یہ ہے کہ بڑی آپا کے ہاتھ میں جو ذائقہ تھا وہ ان چاروں میں سے کسی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

"بھئی مجھے تو اس گنتی سے باہر کر دیں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ میری یہ لاڈلی اولاد صبح پانچ بجے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اب میں انہیں سنبھالوں یا کام میں ہاتھ بٹاؤں، دونوں میں سے ایک کام ہو سکتا ہے۔" عفرا نے اعلان کیا۔

"پریشان مت ہو، میں کر لوں گی۔" بڑی آپا نے جھٹ انہیں رخصت عنایت کی۔

اب وہ کچن میں گھسیں، میدے میں لوازمات ملا کر گوندھ رہی تھیں۔ ابلے ہوئے چھولے فریج سے نکال کر باہر رکھ دیے تھے، آلو ابل رہے تھے۔

"آپ کا پروجیکٹ شروع ہو گیا؟" عظمیٰ اندر آئی۔

"بالکل ہو گیا۔"

"اچھا، میں سونے جا رہی ہوں۔ جب سب چیزیں تیار ہو جائیں تو مجھے جگا دیجیے گا۔" عظمیٰ نے زوردار جماہی روکتے ہوئے کہا۔

"اب یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟ اٹھ گئی ہو تو اٹھی رہو، کام کرو۔ پہلے چائے کا پانی رکھو چولہے پہ اور سوجی چھنی ہوئی رکھی ہے، اسے بھونو۔" انہوں نے حکم نامہ جاری کیا۔

"یہ لیں چھوٹی آپا اور یمنیٰ آ گئی ہیں، یہ خدمات ان کے سپرد کریں۔" دونوں بہنوں کو اندر آتا دیکھ کر عظمیٰ نے سکون اور اطمینان کی سانس لی۔

"ہاں جی ہم کر لیں گے، آپ جائیے۔" چھوٹی آپا نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"بھئی کوئی اللہ کا بندہ مجھے چائے بنا کر دے دے۔"

"اے یوں نہار منہ کام نہیں ہوتا۔" بڑی آپا میدہ گوندھتے ہوئے بولیں۔

"میں بنا رہی ہوں۔" یمنیٰ نے آگے بڑھ کر چائے کی پتیلی کیبنٹ سے نکالی اور اسے کھنگال کر چائے کا پانی رکھ دیا۔ عظمیٰ موقع غنیمت جان کر وہاں سے کھسک لی اور عفرا کے پاس جا گھسی، جو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لگی پڑی تھی۔

"یار بات سنو۔" تولیے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے عفرا نے یمنیٰ کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔"

"ہمارے پڑوس میں عالیہ آنٹی رہتی ہیں نا، ملی ہو گا تم ان سے۔"

"اچھا!" وہ عظمیٰ نے الفاظ کھینچتے ہوئے ادا کیے۔ "ہاں کیا ہوا؟"

"ہوا کچھ نہیں، دراصل ان کا جو دوسرے نمبر کا بیٹا ہے نا اس کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں۔" عفرا نے بتایا۔

"تو؟"

"انہوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ کوئی اچھی سی لڑکی بتاؤ، تو میں سوچ رہی تھی کہ یمنیٰ کے بارے میں بتاؤں انہیں۔ ہم تو خالہ کی طرف سے مطمئن تھے کہ وہ ہی لے جائیں گی یمنیٰ کو، ورنہ میں تو بہت پہلے ہی کوئی نہ کوئی لڑکا بتاتی اس کے لیے، اب ان سے کہوں؟"

"ابو اور باقی گھر والوں سے پوچھو، میں کیا بتاؤں؟" عظمیٰ گڑبڑا گئی۔

"ہاں... ہاں... سب سے پوچھ کر ہی بات کروں گی ان سے۔ وہ تو ابھی میرے ذہن میں بات آئی تھی تو تم سے کہہ دی۔" عفرا اپنی چوٹی کے بل کھولنے لگی۔

"ان کا بیٹا کرتا کیا ہے؟"

"بی کام کیا ہوا ہے، کسی پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتا ہے، ہماری طرح مڈل کلاس ہیں اور عادت مزاج کے بھی اچھے ہیں۔" عفرا نے مزید تفصیل بتائی۔

"اللہ کرے یمنیٰ کی یہاں بات ہو جائے، وہ بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ شکر ہے کہ اب ٹھیک ہے۔ زندگی کے نئے راستے پہ چل پڑی تو اس کے لیے اور ہم سب کے لیے بہت اچھا ہو گا۔" عظمیٰ نے مچلتے ہوئے اسد کو قابو کیا جو امی کے ہاتھ میں برش دیکھ کر مچل گیا تھا کہ اپنی امی کے بالوں میں کنگھا خود کرے گا۔

"حلوہ پوری تو دیکھ لو کہاں تک پہنچیں۔" تھوڑی دیر بعد عفرا کو خیال آیا۔

"خوشبو تو بہت زبردست آ رہی ہے۔" عظمیٰ نے چہرہ اوپر کر کے گہری سانس لی۔

"بھائی لوگ بھی اٹھ گئے آواز آ رہی ہے۔"

تھوڑی دیر میں ہی گھر میں ہلچل ہو گئی تھی۔ گرم گرم پوریوں، خستہ کچوریوں، مزے دار ترکاری اور خوشبودار حلوے کا ناشتا بڑے اہتمام سے کیا گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر یمنیٰ اور عظمیٰ گھر کے کاموں میں لگ گئیں اور عفرا بڑوں سے عالیہ آنٹی کے بیٹے کے متعلق ڈسکس کرنے لگی۔

"ویسے وہ مجھ سے ایک بار پوچھ بھی رہی تھیں، تمہاری کتنی بہنیں رہ گئی ہیں، کتنی بڑی ہیں، کیا کرتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت میں نے اتنا دھیان ہی

نہیں دیا۔"

"دیکھ لو، مناسب انداز میں ذکر کر دینا اپنی بہن کا۔ آگے جو اللہ کا حکم۔" ابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

دوپہر میں علی اپنی بہن زرین کے ساتھ آ گیا۔

"ہمیں پتا چلا کہ آج گھر میں رونقیں ہو رہی ہیں، لہٰذا ہم آ گئے۔" زرین شگفتہ لہجے میں بولی۔

"رونقیں بھی ہیں، رنگ اور خوشبوئیں بھی۔" عظمیٰ ہنسی "کچن میں جا کر دیکھو۔" علی کچھ دیر ابو اور بھائیوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا، پھر بچوں کے ساتھ لگ گیا، وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت انجوائے کرتا تھا۔

"کیا کھاؤ گی؟" عظمیٰ نے زرین سے سوال کیا۔

"کیا پکا رہی ہو؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"تمہیں پکا کر تھوڑی کھلائیں گے۔" عظمیٰ نے آنکھیں مٹکائیں۔

"پھر؟"

"بھائی کی جیب ہلکی کریں گے، ان سے منگوائیں گے تمہاری پسند کی چیز۔" عظمیٰ اسے یوں ہی چھیڑتی تھی۔

زرین کے چہرے پہ سرخی چھا گئی، وہ لبوں پہ بے اختیار آنے والی مسکراہٹ کو چھپانے کے جتن کرنے لگی۔

"مسکراہٹ چھپانا نہیں چاہیے۔" اور بھی وہ جو دل سے نکلی ہو، عظمیٰ نے بظاہر سنجیدگی سے، مگر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا! مشورے کا شکریہ۔" زرین مسکراہٹ چھپاتے چھپاتے ہنس پڑی۔ باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی، مگر پھر بھی ایک غیر رسمی بات طے تھی اور اب ابو کا ارادہ تھا کہ زرین اور علی کے بڑے بھائی سے شادی کی بات کریں۔ بہن، بھائیوں کی رائے تھی کہ یمنیٰ کا بھی کہیں رشتہ طے ہو جائے تو دونوں کی ساتھ کر دیں۔

"اپنی بیٹی کی وجہ سے ہم دوسرے کی بیٹی کو تو بٹھا کر نہیں رکھ سکتے۔ اگر سال، چھ مہینے میں یمنیٰ کی رخصتی کا کچھ بندوبست ہو جاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ بہو تو گھر میں لے ہی آئیں گے۔" ابو کی بات بھی مناسب تھی، مگر اب عفرا نے جو موضوع چھیڑا تھا تو سب انتظار میں تھے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

عفرا نے عالیہ آنٹی سے جیسے ہی یمنیٰ کا ذکر کیا وہ فوراً" ہی گھر آنے پر تیار ہو گئیں اور وہ گھر کیا آئیں، جھٹ پٹ چٹ، ایک کے بعد ایک شادی کے سارے مراحل طے ہوتے چلے گئے۔ ابو نے زرین کے لیے بھی بات کر لی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ان ہی امنگوں بھرے خوب صورت دنوں میں علی کسی کام سے گھر آیا تھا۔ عظمیٰ، یمنیٰ کے ساتھ بیٹھی جوڑے پیک کر رہی تھی۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ کام کرنے بیٹھ جاتی۔ کبھی چوڑیاں، کبھی جوتے، کبھی کپڑے، بیڈ شیٹس، تھوڑا تھوڑا کر کے کام مکمل ہو رہا تھا۔

"خالو سے کام تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا کام؟" عظمیٰ نے تفتیش شروع کی۔

"ایک جگہ نوکری کے لیے کہا تھا، اسی سلسلے میں بات کرنا تھی۔"

"پیپر کلیئر ہو گئے تمہارے؟"

"تین سال ہو گئے مجھے بی ایس سی کیے ہوئے۔" اس کا انداز جتانے والا تھا۔

"ہمیں کیا پتا، تم نے کوئی مٹھائی کھلائی ہمیں؟" عظمیٰ نے تھیلی میں پن لگاتے ہوئے کہا۔

"کھلائی تو تھی، آپ بھول گئیں۔" علی کو گویا افسوس ہوا۔

"اچھا۔" عظمیٰ نے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہو سکتا ہے، تم نے کھلائی ہو اور ہم بھول گئے ہوں۔" اس نے اپنی غلطی تسلیم کی۔

"تم پاگل تو نہیں ہو، کیوں بے چارے کو تنگ کر رہی ہو؟" یمنیٰ نے مداخلت کی۔

"یہ جو ہمارے علی صاحب ہیں نا اتنے بے چارے بھی نہیں ہیں، جتنے یہ زمین کے اوپر دکھائی دیتے ہیں نا اتنے ہی اندر بھی ہیں۔"

"اچھا! خواہ مخواہ کیوں فضول باتیں کر رہی ہو۔" یمنیٰ نے پھر اسے گھُرکا۔

"تم سناؤ علی! ابو نے کون سی جاب کے متعلق بات کی تھی۔" یمنیٰ اس سے مخاطب ہوئی۔

"اپنے آفس کا ہی کہہ رہے تھے، کوئی ویکینسی ہے، بس سرسری سی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ فارغ ہو تو گھر آ جانا پھر تفصیل بتا دیں گے۔"

"اچھا۔" یمنیٰ نے سر ہلایا۔

"ویسے تو ابو اس وقت تک گھر آ جاتے ہیں۔ بس کبھی کبھار ہی دیر ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے آنے والے ہوں، تم کچھ گرم لو گے یا ٹھنڈا۔"

"جو بھی پینا ہے کچن کا راستہ یہ ہے، جاؤ بناؤ اور لے آؤ۔ ہم بھی پئیں گے۔" عظمیٰ نے پھر ٹانگ اڑائی۔

"چپ کرو تم۔" یمنیٰ نے اسے ڈانٹا۔

"ایسا کرو شربت بنالو... نہیں... علی، شربت پیو گے یا چائے؟" یمنیٰ نے علی سے ہی پوچھا۔

"چائے زیادہ اچھی نہیں لگتی مجھے۔" علی نے سر کھجایا۔

"خبردار، چائے کو کچھ مت کہنا۔" عظمیٰ نے اسے تنبیہہ کی۔

"چلیے، آپ کی پسندیدہ معزز چائے مجھے زیادہ نہیں بھاتی۔" علی نے لفظوں میں ترمیم کی۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" عظمیٰ مطمئن ہو گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے موبائل میں بیلنس ہے؟" اسے اچانک ہی کچھ یاد آیا۔

"کم ہے۔"

"غریبو! جب موبائل رکھتے ہو تو بیلنس بھی رکھا کرو۔"

"تمہیں شربت بنانے کو کہا تھا۔ موبائل سے کیا کام پڑ گیا؟" یمنیٰ کو پھر ٹوکنا پڑا۔

"عفرا کو فون کروں گی۔"

"کیوں؟"

"شاپنگ پہ جانا ہے نا، وہ کہہ رہی تھی میرے ساتھ چلنا، اس کے بچوں کو بھی تو سنبھالنا ہو گا۔"

"تمہیں کچھ لینا ہے یا صرف بچے سنبھالنے ان کے ساتھ جا رہی ہو؟"

"دیکھوں گی، کچھ پسند آ گیا تو لے لوں گی۔" عظمیٰ نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے اچانک علی کی طرف دیکھا۔

"تم موبائل تو دو۔"

"کب سے تو ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوں۔" اس نے چارگی سے بولتے ہوئے سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔

"تم پہلے شربت بنا لاؤ، پھر آ کر بات کرنا۔" یمنیٰ نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

"سچ، بہت ظالم ہو تم۔" عظمیٰ نے منہ بناتے ہوئے بہن کو دیکھا۔

"ودا نیلا گ نہیں، کام کرو، جاؤ۔" یمنیٰ نے اس کے احتجاج کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

"جا رہی ہوں۔" عظمیٰ غیر متوقع طور پر شرافت سے کھڑی ہو گئی۔

"کچھ دیر بعد واپس آئی تو ٹرے میں دو گلاس شربت اور ایک چائے کا کپ رکھ کر لائی۔ شربت کے دو گلاس اس نے علی اور یمنیٰ کو تھمائے اور خود چائے کا کپ لے کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران ابو بھی آفس سے آ گئے۔"

"السلام علیکم۔" تینوں نے تقریباً" ایک ساتھ ہی انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! اچھا بھئی علی! میں تمہیں ابھی کال کرتا، اچھا ہوا کہ تم آ گئے، میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں، پھر بات کرتے ہیں۔" سلام کا جواب دے کر وہ علی سے مخاطب ہوئے۔

"جی۔" اس نے بڑی تابعداری سے جواب دیا۔ ابو اندر چلے گئے اور علی نے شربت کا گلاس خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا۔ اسے ابو کا انتظار تھا جن کے پاس

شاید اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی۔

٭ ٭ ٭

"اللہ عفرا! یہ تمہارے دونوں بھی نا' ایک اور ایک' دو نہیں بلکہ گیارہ ہیں۔" عظمیٰ ہاتھ چھڑانے کے لیے مچلتے ہوئے اسد کو مضبوطی سے پکڑتی ہوئی عفرا سے مخاطب ہوئی۔ عروبہ بڑے مزے سے بابا کی گود میں سوار ادھر ادھر کے نظارے کر رہی تھیں۔ شاپنگ خیر سے مکمل ہو چکی تھی اور اب وہ لوگ گاڑی میں بیٹھنے جا رہے تھے۔

"میں سوچ رہی تھی گروسری بھی لے لوں۔ پھر آپ کو ہی زحمت کرنا پڑے گی دو' چار دن بعد۔" سڑک پار نظر آتے اسٹور کو دیکھ کر عفرا کو کچھ خیال آیا تو وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رک گئی۔

"پھر؟ کیا خیال ہے چلیں؟" وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔

"اف بیوی' تم بھی بس۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"عظمیٰ تم پلیز ان دونوں کا خیال رکھنا' ہم لوگ بس تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔" عفرا اس سے مخاطب ہوئی۔

"جایئے جی' ہم دیکھ لیں گے' ان دونوں بدمعاشوں کو۔" عظمیٰ نے اندر بیٹھ کر گاڑی کا دروازہ بند کیا۔

"دھیان سے رہنا تم بھی۔" عفرا جاتے جاتے پھر پلٹ آئی۔

"توبہ ایسا لگ رہا ہے کہ کسی محاذ پر جا رہی ہو' اب جاؤ بھی' تمہیں دیکھ دیکھ کر تمہارے بچے اور بدک رہے ہیں۔" عظمیٰ نے اسے گھورا۔

"اچھا جا رہی ہوں۔" عفرا جلدی سے پلٹ گئی۔

"عظمیٰ دونوں بچوں کے ساتھ مشغول ہو گئی۔ ویسے تو ابھی چاکلیٹس اور چپس کا تھوڑا ذخیرہ موجود تھا جس کی بدولت وہ ذرا امن سے تھے' مگر کب تک' یہ چیزیں ختم ہوئیں اور دونوں کی اچھل کود پھر شروع ہو گئی۔

"چلو ہم یمنیٰ آنٹی سے بات کرتے ہیں۔" عظمیٰ نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر اسپیکر آن کر دیا۔

"اب ہم آنٹی سے باتیں کریں گے' ٹھیک ہے۔"

"کہاں ہو؟ اتنی دیر لگا دی' کب سے انتظار کر رہی ہوں' تم لوگوں کا۔" یمنیٰ اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گئی۔

"ارے بس آ رہے ابھی تھوڑی دیر میں' دراصل خریداری تو سب ہو گئی تھی' مگر ہماری بہن صاحبہ کو اپنے کچن کا بھی خیال آ گیا تو وہ سودا لینے گئی ہیں' تھوڑی دیر کا بول کر گئی تھیں' اب دیکھو وہ تھوڑی دیر' کتنی دیر میں ہوتی ہے۔" عظمیٰ ہنسی۔

"اسی وقت میں ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی' ان کی گاڑی لرز اٹھی' عظمیٰ کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے اور ایسا لگا جیسے اک دم اس کا دل خوف سے دھڑکنا بند ہو جائے۔ ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے اور وہ کیا کرے؟ بے اختیار اس نے عروبہ اور اسد کو خود سے چمٹا لیا۔ جن کے معصوم چہرے سہم گئے تھے۔

موبائل اس کی گود سے نکل کر نیچے گر گیا تھا' جہاں سے یمنیٰ مسلسل ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔

ہیلو' ہیلو' عظمیٰ' تم ٹھیک تو ہو نا' یہ دھماکا کیسا ہے' کچھ تو بولو عظمیٰ۔" یمنیٰ کی آواز سے بے حد پریشانی اور ڈر چھلک رہا تھا۔

عظمیٰ نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل اٹھایا۔

"سامنے روڈ پر دھماکا ہوا ہے۔ دھواں ہی دھواں نظر آ رہا ہے اور بس۔" عظمیٰ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"عفرا وہیں گئی تھی۔" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

تم...... تم لوگ تو ٹھیک ہو نا اور عفرا' وہ آئی نہیں ابھی تک؟ یمنیٰ اک دم حواس باختہ سی ہو گئی' اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کیا پوچھ رہی ہے؟ کیا بول رہی ہے؟

"اچھا تم' تم ایسا کرو' وہاں سے دور ہٹ جاؤ' میں بھائی کو فون کر کے بھیجتی ہوں' تم پریشان مت ہونا' اچھا!" بولتے بولتے' خود یمنیٰ کی آواز بھرا گئی۔



عظمیٰ فون آف کر کے خالی خالی نظروں سے سڑک کے اس طرف دیکھنے لگی جہاں دھوئیں کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور آگ بھی بھڑک اٹھی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ ایمبولینس سائرن کی آوازیں آ رہی تھی۔ چاروں طرف ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی اور سڑک کنارے گاڑی میں دو سہمے ہوئے بچوں کے ساتھ بیٹھی عظمیٰ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کو اسے سارا منظر اور پس منظر میں اپنا آپ یکسر اجنبی اور لاتعلق سا لگا۔

"یہ سب کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے سامنے دیکھا۔ دور سڑک پار آگ و خون کا یہ منظر کچھ نیا تو نہیں تھا۔ اس نے ہولناک ہوتے ذہن پر زور ڈالا۔ ایسے کئی مناظر وہ ٹی وی اسکرین پر دیکھ چکی تھی' مگر تب وہ اس قسم کے مناظر اور حادثات کا حصہ نہیں تھی اور اب...... اب وہ بھی اس قیامت سے گزر رہی تھی۔

"میں کہاں ہوں؟ کہیں ہوں بھی یا نہیں۔" تھوڑی دیر کو یہ وسیع و عریض کائنات اسے خالی لگی اور اپنا وجود اکیلا تنہا۔

موت کے فرشتے چند قدم کے فاصلے پر اپنا کام کر رہے تھے۔ اگر وہ یہاں بھی پہنچ جاتے تو...... اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

اتنی ارزاں' اتنی بے وقعت اور اتنی بے بھروسا زندگی...... امدادی کارکن' تڑپتے زخمیوں اور لاشوں کو' بکھرے ہوئے انسانی اعضاء کو وہاں سے ایمبولینس میں منتقل کر رہے تھے۔

"میری مما کہاں ہیں' مما کو بلائیں۔" عروبہ نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اسد بھی منہ بسورنے لگا۔

"مما' مما......"

عظمیٰ انہیں دیکھ رہی تھی' سن رہی تھی مگر بے بسی سے اس کا ذہن رفتہ رفتہ تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

کھانا کھانے کے بعد لوگ ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ عظمیٰ' یمنیٰ کے پاس آ گئی۔

"بچے سو گئے کیا؟"

"ہاں کتنا روتے' کتنی ضد کرتے...... تھک ہار کے بے چارے سو گئے۔" یمنیٰ کی آواز میں شکستگی در آئی۔

"اب ہم بھی چلیں گے بیٹی! اللہ صبر دے سب کو'" چھوٹی پھپھو بھی وہیں آ گئیں۔ عظمیٰ اور یمنیٰ کے سروں پہ باری باری ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ایسی جوان موتیں...... نگاہوں میں اب تک دونوں کے چہرے گھوم رہے ہیں' اللہ کی مصلحت وہی جانے۔ بچوں کے لیے دل کڑھتا ہے' جانے ان کے ساتھ کیا ہو۔"

وہ اپنی ہی رو میں بولتی چلی گئیں' پھر عظمیٰ اور یمنیٰ کے چہرے دیکھ کر انہیں یکایک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لاکھ ضبط کرنے کے باوجود بھی دونوں کی آنکھوں سے بہن اور بہنوئی کی اچانک موت کا غم' آنسو بن کر ٹپک پڑا۔

"صبر کرو بچو! اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے' یہ جان اس کی امانت ہے۔ ہر ایک کو اپنے وقت پر جانا ہے' ہمیں بھی' تمہیں بھی' کیا کریں' جس نے غم دیا ہے اسی سے ہی مدد مانگیں گے' صبر مانگیں گے۔" پھپھو کی آواز بھی بھرا گئی' عفرا اور اس کے شوہر کی ناگہانی اموات نے تو غیروں کو بھی آبدیدہ کر دیا تھا' وہ تو پھر سگی پھپھو تھیں۔

ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ بڑی آپا' چھوٹی آپا بھی بھلا کتنے دن رکتیں' گھر تو جانا ہی تھا' سو چلی گئیں۔ دکھی اور پریشان دل کے ساتھ' سب ہی جیسے تیسے وقت گھسیٹ رہے تھے۔ بچے ابھی تک تو یہیں تھے۔ عفرا کے ساس سسر تو حیات نہیں تھے' باقی دو جیٹھ' دو دیور اور تین نندیں' سب شادی شدہ تھے۔ سارے ہی مڈل کلاس گھرانے تھے' اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔ دونوں بچوں کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے ابھی تک کسی نے جھوٹے منہ بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر عظمیٰ فیصلہ کر چکی

تھی۔ اس نے گھر میں سب کو آگاہ کر دیا تھا کہ عفرا کے بچوں کی ذمہ داری وہ اپنے کاندھوں پر لے رہی ہے۔

"جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟" باسط بھائی چونک اٹھے۔

"جی۔"

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے بیٹی! کل کو تمہاری شادی ہو گی پھر؟"

ابو نے سمجھایا۔

میں شادی اس سے کروں گی ابو! جو ان دونوں کے ساتھ مجھے قبول کرے، ورنہ شادی کوئی اتنی ضروری بھی نہیں عظمیٰ نے دھیرے سے مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا تھا۔

"میں اور زرین سنبھال لیں گے بچوں کو، تم ان کی فکر مت کرو۔"

بھائی نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

عفرا نے آخری بار مجھ سے یہی کہا تھا کہ بچوں کا خیال رکھنا اور کیا پتا قدرت نے اس کے منہ سے یہ کہلوایا ہو؟ ان دونوں کی ذمہ داری میں خود اٹھاؤں گی۔" عظمیٰ کا انداز اٹل تھا۔

"تم جذباتی ہو رہی ہو، اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، ویسے بھی زرین نے مجھ سے خود کہا ہے کہ بچوں کے معاملے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان کی ذمہ داری اٹھانے کو بخوشی تیار ہے اور وہ کوئی غیر تو نہیں، گھر کی بچی ہے۔ ہم بچپن سے اسے جانتے ہیں، وہ محبت کرنے والی پر خلوص لڑکی ہے اور پھر یہ بات اس نے خود اپنی مرضی سے کہی ہے۔ ہم نے تو یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ یہ ذمہ داری اسے سونپ دیں، مگر اس نے خود ہی اس خواہش کا اظہار کیا ہے اور رہی بات تمہاری تو بے شک ہم سب تمہارے جذبات سمجھ سکتے ہیں، مگر بیٹی، زندگی فقط جذبات کے سہارے نہیں گزرتی، چاہے اپنے سگے ہی کیوں نہ ہوں، کسی کی اولاد پالنا بڑی کٹھن ذمے داری ہے۔" ابو نے اسے سمجھانے کی پھر اپنی سی کوشش کی مگر ان کی یہ کوشش بے سود رہی۔

"تمہاری بہنیں بھی تو کسی اور کے بچے پال رہی ہیں، یہ تو پھر بھی میری سگی بہن کے بچے ہیں۔" عظمیٰ کے پاس ہر دلیل کا جواب موجود تھا۔

"چپ ہو جائیں، بحث بے کار ہے۔" بھائی نے ابو کو اشارے سے منع کیا۔

☼ ☼ ☼

یمنیٰ کی رخصتی بے حد سادگی سے کر دی گئی تھی، شادی آگے بڑھانے کا مسئلہ تھا، دونوں طرف سے تیاریاں مکمل تھیں پھر ابو نے ہی کہا کہ ایک کام سال چھ ماہ بعد بھی کرنا ہی ٹھہرا تو دو ماہ بعد کیوں نہیں، دو انتہائی عزیز زندگیاں ختم ہونے کا غم اپنی جگہ، مگر کب تک سوگ مناتے، یہ سوگ تو زندگی بھر کا تھا اور زندگی کے معاملات کبھی رکتے بھی ہیں بھلا۔

یمنیٰ خوش نصیب تھی، جیون ساتھی اچھا ملا۔ اس سے وابستہ تمام افراد خانہ بھی سلجھے ہوئے تھے، سو وہ اپنے پچھلے دور خزاں کو فراموش کر کے اس نئی آنے والی بہار میں خوشیوں کے رنگا رنگ جھولے میں جھول رہی تھی۔ ایک ایک کر کے سب کو ہی بہر حال اپنی اپنی زندگیوں میں مگن اور مصروف ہو جانا تھا۔

زرین بھی اچھی لڑکی تھی، گھر میں فوراً ہی گھل مل گئی تھی۔ بچوں کو سنبھالنے اور دل جوئی کرنے کی کوششیں سب ہی کرتے تھے مگر عظمیٰ تو اسی طرح ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی جس طرح ایک ماں پالتی ہے، اور اسے اب علم ہوا تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت کیوں رکھی گئی ہے۔ اتنی محبت مشقت کے کڑے امتحان میں پورا اترنا بڑا ہی مشکل تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی دونوں بچے ایک ہی کام ایک ہی وقت میں کرنے سے قاصر تھے۔ ایک سوتا تو دوسرا اٹھ جاتا، ایک کو بھوک لگتی تو دوسرے کو پیمپر کھلوانا یا بند ہوا ہوتا تھا، پھر اپنی مما، پاپا کو یاد کر کر کے بچے الگ ہلکان ہوئے جاتے تھے۔ اس وقت بچوں کو بہلانا دنیا کا مشکل ترین کام تھا مگر عظمیٰ گھر والوں کے تعاون کے ساتھ ان کٹھنائیوں سے گزر رہی تھی۔



☼ ☼ ☼

آج کا دن بڑا اداس اداس سا تھا یا عظمیٰ کو ہی کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ یمنیٰ کی لگائی ہوئی بیل کے پتے بھی خاموشی سے دم سادھے پڑے تھے۔ عظمیٰ نے غور سے گملے کی طرف دیکھا۔

خزاں کا موسم اتنا طویل تو نہیں ہوتا، کبھی نہ کبھی بہار آ ہی جاتی ہے۔ پھر اس نے بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھے اور گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکا کر چپ چاپ جانے کیا کیا سوچے چلی گئی۔

"زندگی اتنی عجیب کیوں ہے۔" اس کا ذہن سوچتے سوچتے ایک ہی نقطے پر ٹک گیا، ہم سب کے سینوں میں دل کے بجائے پتھر دھڑک رہے ہیں۔

کل کچھ لوگ اسے دیکھنے آئے تھے۔ ایک تو اسے لفظ "دیکھنا" ہی بڑا عجیب بلکہ برا سا لگتا تھا۔

مہمان آئے، بے حد خوش اخلاقی اور ملنساری کے ساتھ باتیں کیں، عظمیٰ انہیں قبول تھی مگر دونوں بچوں کے ساتھ نہیں، حالانکہ انہیں پہلے ہی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ ہاں ایک آپشن ضرور دیا انہوں نے دیکھیں، میں بغیر کسی لگی لپٹی کے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ جب آپ کی بیٹی ہمارے بھائی کو ایک بچی کے ساتھ قبول کر رہی ہے تو آپ کی بیٹی کے ساتھ ایک بچے کو ہم بھی قبول کریں گے۔ آپ اپنی نواسی کو بے شک اپنے پاس رکھ لیں اور نواسے کو بیٹی کے ساتھ رخصت کر دیں۔ ہمیں تو انصاف کی بات لگتی ہے۔" لڑکے کی بڑی بہن نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سوچ کر جواب دے دیں گے۔" کچھ دیر کے خاموشی کے بعد ابو نے جواب دیا تھا۔

"ہاں ہاں بالکل، یہ تو آپ کا حق ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں پھر ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔"

عظمیٰ نے انکار کر دیا تھا، بات ختم ہو گئی، مگر پتا نہیں بات ختم ہوئی تھی یا در اصل شروع اب ہوئی تھی۔

"بہت مشکل راستہ چنا ہے تم نے۔" زرین نے بھی اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔ "مشکل ہو یا آسان، اب تو فیصلہ کر لیا۔" عظمیٰ کے لہجے میں چٹان جیسی مضبوطی تھی۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟" علی کی بلند آواز سن کر وہ اک دم ہڑبڑا گئی۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا ہوا؟ پچھلے دو منٹ سے میں یہاں کھڑا آپ کو مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر آپ ہیں کہ....." علی کرسی گھسیٹ کر وہیں ٹک گیا۔ "اچھا، مجھے پتا نہیں چلا۔" عظمیٰ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "تمہاری آج چھٹی تھی کیا؟" عظمیٰ نے بے وقت اسے گھر پر دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

"ہاف ڈے تھا، تھوڑی دیر پہلے گھر آیا تھا، چینج کر کے یہاں آ گیا۔"

"چائے پیو گے؟"

"نہیں، شربت۔" علی نے اپنی چوائس بتائی۔

"میں بنا کر لاتی ہوں۔" عظمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے لیے چائے اور علی کے شربت لے آئی۔ "تمہاری جاب کیسی چل رہی ہے؟"

"بہت اچھی۔" علی گھونٹ گھونٹ شربت پی رہا تھا۔

"آپ کو دشواری نہیں ہوتی بچوں کو سنبھالنے میں۔" علی نے اچانک سوال کیا۔

"ہاں ہوتی تو ہے۔" عظمیٰ نے چائے کا گرم گھونٹ بھرتے ہوئے اعتراف کیا۔ "مگر آہستہ آہستہ سب سیٹ ہو جائے گا۔"

"اچھا۔" علی نے اس گہرے یقین بھرے انداز پر عظمیٰ کو بغور دیکھا "اور سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں، کیوں؟" عظمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔" علی نے آہستہ سے بولتے ہوئے خالی گلاس ٹرے میں رکھا۔

"نہیں؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"کوئی خاص بات نہیں، بس یوں ہی۔"

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔" علی مسکرایا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ ہو سکتا ہے رات میں چکر لگاؤں، انکل

"علی اچھا لڑکا ہے' سیدھا سادا ضرور ہے مگر بے وقوف نہیں۔ سلجھا ہوا' سمجھ دار لڑکا ہے' ہمدرد اور نرم مزاج بھی ہے۔ مجھے وہ تمہارے لیے پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ باقی سب گھر والوں کی رائے بھی اس کے حق میں ہوگی۔" ابو اپنی بات ختم کرکے منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگے' جو کچھ حیران اور کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔

"میں سوچ کر جواب دوں گی۔" عظمیٰ نے کچھ دیر بعد دھیرے سے کہا۔

"کوئی جلدی نہیں' اچھی طرح سوچو' غور کرو' پھر فیصلہ کرو' علی مجھے پسند ہے مگر یہ میری رائے اور مشورہ ہے تمہارے لیے' کوئی زبردستی نہیں۔ ٹھیک ہے؟" انہوں نے شفقت سے اس کا سر تھپکا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز اتوار تھا۔ ابو نے رات میں بیٹیوں کو فون کرکے آنے کو کہہ دیا تھا۔ تینوں دوسرے روز' ایک ایک کرکے آگئیں۔

"میں کیا کروں آپا! کچھ تو بتائیں؟" کچن میں مسالہ بھونتی آپا کو عظمیٰ نے مخاطب کیا۔

"کیا مطلب کیا کروں؟ بھئی ابھی اتنا سارا کام باقی ہے۔ تم ایسا کرو' سلاد اور رائتہ بنا کر کباب تل لو اور پہلے یہ چاول بھگو دو۔" آپا بڑے مصروف انداز میں دیگچے میں چمچہ چلا رہی تھیں۔

"اُفوہ! میں کام کی بات نہیں کر رہی۔" عظمیٰ جھنجھلائی۔

"تو پھر؟" آپا کی ساری توجہ ابھی بھی مسالہ بھونتے پر تھی۔ خشک ہوتے مسالے میں انہوں نے پانی کا چھینٹا دیا۔

"میں..... علی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ دھیرے سے رُک رُک کر بولی۔

"علی؟ کیا ہوا' بس ہاں کر دو' اچھا لڑکا ہے' دیکھا بھالا ہے۔" آپا نے جلدی جلدی بول کر مسالے میں دو گلاس پانی ڈالا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا' کیا فیصلہ کروں؟"

"اگر تم تذبذب میں ہو تو استخارہ کرلو' اللہ بہتر کرے گا۔" انہوں نے عظمیٰ کو مشورہ دیا اور چاول بھگونے لگیں۔

"میرے لیے استخارہ آپ کردیں۔" عظمیٰ نے جیسے ان سے درخواست کی۔

"جی نہیں' یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اپنے معاملات میں خود استخارہ کرنے کے بجائے کسی اور سے کروالو؟ استخارہ دراصل اللہ تعالیٰ سے مشورہ ہے' جو ہم اپنے کسی بھی اہم معاملے کے لیے اس سے لیتے ہیں' اسے خود ہی کرنا چاہیے' یہی درست اور احسن طریقہ ہے' یہ کوئی اتنا مشکل بھی نہیں ہے' دو رکعت نفل پڑھ کر استخارے کی مسنون دعا پڑھو اور اللہ سے دعا کرو کہ جس معاملے میں بہتری ہو' اسی طرف رہنمائی کردے۔" آپا نے آگے مزید تفصیل سے بتایا۔

"ٹھیک ہے میں استخارہ کرلیتی ہوں۔" عظمیٰ آہستہ سے جواب دے کر کھیرا کاٹنے لگی۔

یمنیٰ رک گئی تھی۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا رات کا کھانا کھا کر اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ رخصت ہوگئی تھیں۔ زرین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ جلدی سونے کے لیے چلی گئی۔ عظمیٰ اور یمنیٰ رات دیر تک باتیں کرتی رہیں یمنیٰ سمیت گھر کے سب ہی افراد کا ووٹ علی کے حق میں تھا اور عظمیٰ؟ وہ متذبذب تھی' سوال فقط اس کے دل اور زندگی کا نہیں تھا' دو معصوم جانوں کا بھی تھا' جن کے لیے اس نے اپنے خوابوں اور امنگوں کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔

"زیادہ سوچ بچار کرکے خود کو ہلکان مت کرو۔" وہ بے چارہ دونوں بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ تمہیں قبول کرنے کو تیار ہے۔ یہ سراسر اللہ کی رحمت ہے اور مدد ہے تمہارے لیے' اسے ٹھکرانے کی غلطی مت کرنا۔" یمنیٰ نے پرزور لہجے میں اسے تنبیہہ کی تھی۔

"ہوں۔" عظمیٰ نے ایک گہری سانس لے کر بس



دیر تک چپ چاپ سوچتی رہی تھی۔ "علی! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں' ٹائم ہے تمہارے پاس؟" اس نے علی کو فون کیا تھا۔

"میں فارغ ہوں۔" بولیے تو گھر آجاؤں؟ علی نے جواب دیا۔

"نہیں میں فون پر ہی بات کروں گی ابھی۔"

"کہیے' میں سن رہا ہوں۔"

"تم' عظمیٰ ایک لمحے کو رُکی۔" تم میرے اور بچوں کے ساتھ ہمدردی کر رہے ہو؟"

"ترس نہیں کھا رہا' ہمدردی کر رہا ہوں اور یہ کوئی بری بات نہیں۔ اچھی خالہ نے بھی تو ہمارے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی۔" علی نے اس کا سوال سمجھ کر جواب دیا تھا۔

"امی' ابو کی نیکی کا بدلہ اتار رہے ہو؟"

"نہیں' ان کی نیکی کا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ میری کیا مجال جو انہیں بدلہ دوں۔ میں تو بس اپنے حصے کے چراغ جلا رہا ہوں۔" علی کی انداز میں قطعیت تھی۔

"جانتے بھی ہو' کیا ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہو۔ کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا تم نے؟"

"آپ نے کیا سوچ کر بچوں کی ذمہ داری اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا؟" علی نے الٹا عظمیٰ سے سوال کیا۔

وہ میری سگی بہن تھی علی! اور مجھے بہت عزیز تھی۔" عظمیٰ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

"تو میں بھی تو اس گھر میں آپ سب کے درمیان پلا بڑھا ہوں' کیا مجھے وہ زرین کی طرح عزیز نہیں ہوسکتیں؟ کیا ان کے بچوں سے میں اس طرح پیار نہیں کرسکتا جیسے آپ کرتی ہیں؟" علی بہت مضبوط لہجے میں مدلل بات کر رہا تھا' عظمیٰ اسے سن کر حیران تھی۔

"کسی کی اولاد کو اپنا بنانا آسان نہیں ہوتا۔" عظمیٰ کے لہجے میں اک دم ہی شکستگی اور تھکن در آئی تھی۔

"بڑی آپا اور چھوٹی آپا کی مثال میرے سامنے ہے۔" علی اس سے برابر بحث کر رہا تھا۔

"عورت کا دل اور ظرف اس معاملے میں مرد سے بڑا ہوتا ہے' وہ ہر بچے کی ماں بن سکتی ہے اور بن جاتی ہے' مگر ہر مرد ہر بچے کا باپ نہیں بن سکتا سوائے اپنی سگی اولاد کے۔"

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں مگر سینکڑوں نہیں تو ہزاروں میں کوئی ایک مرد تو قابل اعتبار ہو سکتا ہے نا؟"

"آپ کسی اور پر نہ سہی' کم از کم مجھ پر تو بھروسا کر سکتی ہیں' میں اتنا ناقابل اعتبار تو نہیں۔" عظمیٰ کی خاموشی پر وہ دوبارہ بولا تھا۔

"علی! تم... تم ابھی چھوٹے ہو' اتنے بڑے نہیں ہو کہ اتنے بڑے بڑے فیصلے کر سکو۔" عظمیٰ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔

"اول تو میں اتنا چھوٹا بھی نہیں اور اگر ہوں بھی تو کیا ہوا؟ میرا دل اور ظرف چھوٹا نہیں ہے۔ یہ تو یقین کر سکتی ہیں نا آپ؟ ویسے آپ سے دو سال بڑا ہوں میں۔" اس نے جتایا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو' تم نے اتنی اور ایسی باتیں کب' کہاں سے سیکھیں؟" عظمیٰ بہت حیران تھی۔

"کچھ باتیں لوگ سکھاتے ہیں' کچھ زندگی اور کچھ باتیں موت سکھا دیتی ہے۔" علی بے حد سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"تو تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟" عظمیٰ نے سوال کیا۔

"جی۔"

"ٹھیک ہے علی! میں تم پر بھروسا کرنے کو تیار ہوں۔ میرا اعتبار قائم رکھو گے؟" عظمیٰ پرسکون انداز میں گویا ہوئی۔

"اگر واقعی مجھ پر بھروسا ہے تو یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں اور میں زبان سے کیا دعوا کروں؟ میرا عمل خود ہی اس سوال کا جواب دے دے گا۔" علی جس اعتماد سے بات کر رہا تھا' عظمیٰ کے لیے ایک نیا خوش گوار احساس تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم وہی خاموش طبع علی ہو' تم نے بولنا کب سیکھا' مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔" عظمیٰ نے بالآخر اس سے اپنی حیرانی کا اظہار کر ہی دیا۔

"محبت سے بڑھ کر اور کوئی جذبہ نہیں جو کسی انسان کو بدل سکے۔ آپ کو بھی تو محبت نے ہی بدلا ہے۔ بہن اور بچوں کی محبت نے ایک جذباتی اور لاابالی لڑکی کو ایک بے حد ذمے دار اور سمجھ دار لڑکی بنا ڈالا۔" علی ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو' میں واقعی پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئی ہوں۔ مگر...." عظمیٰ نے روانی سے بولتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا لیکن اس کے پہلے فقرے پر غور کرتے ہوئے وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔

"علی... تم نے کیا کہنے کی کوشش کی ہے؟" عظمیٰ نے آہستہ سے رک رک کر پوچھا۔

"عظمیٰ...." علی نے اس کے نام سے اسے مخاطب کیا اور چند لمحے چپ رہنے کے بعد گویا ہوا۔

"آپ کے محبت بھرے سادہ اور پرخلوص دل نے آپ کو میرے لیے بہت عزیز اور خاص بنا دیا ہے اور میرے دل نے شدت سے آپ کی رفاقت کی خواہش کی تھی' بس اتنا سا فسانہ ہے۔" علی نے دریا کو کوزے میں بند کیا۔

"تمہیں تو ڈائیلاگز بولنے بھی آگئے۔" عظمیٰ بے اختیار مسکرا دی۔

"نہیں' یہ محض ڈائیلاگ نہیں ہے۔" علی ہنس پڑا۔

"یہ بات تو سچ میں نے دل سے کہی ہے' اپنے بھی اور آپ کے بھی۔" وہ دوبارہ بہت ہولے سے بولا تھا۔

"اچھا علی! میں فون بند کر رہی ہوں۔" عظمیٰ نے اپنے دل کے دروازے دھیرے دھیرے اس کے لیے کھلتے ہوئے محسوس کیے تھے۔

اور فون بند کرتے ہوئے عظمیٰ کو اندازہ ہو چلا تھا کہ آگے ایک خوب صورت زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

حرا قریشی

# اس طرح آتا ہے

"کیا! یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بمع اہل و عیال دو ہفتے پہلے ہی آرہے ہیں؟" مناہل کی سوال نما چیخ' خبر بن کر جنگل کی آگ کی طرح پورے گھر میں پھیل چکی تھی۔ جس نے سنا اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اللہ رحم کرے.... اب وہ رنگ میں بھنگ ڈالیں گے۔" حمر نے سرد آہ بھری تھی۔

"اب حقیقتاً" پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا کہ کہیں وہ دیکھ لیں اور اعتراضات شروع۔" قنبر نے

ساتھ بیٹھی علینہ کی طرف دیکھتے ہوئے پھونک مارتے ہوئے دکھڑا رو دیا۔

"میرے منہ پر کیوں پھونکیں مار رہی ہو۔" علینہ نے چڑتے ہوئے اسے پرے دھکیلا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ اب وہ زمانے گئے جب ہماری ان کی وجہ سے شامت آیا کرتی تھی۔" علینہ نے ان سب کو منہ لٹکائے دیکھ کر تسلی دی۔

"تم انہیں کان پر سے مکھی کی طرح نہ اڑاؤ۔ جب وہ ہر بات پر اعتراض اور شکایتوں کے انبار لگائیں گے اور رائی کا پہاڑ بنائیں گے، تب پتا چلے گا۔" عنبر نے اس کے انداز پر کہا۔

"ایک تو تمہاری ہر بات میں دو تین محاورے ضرور ہوتے ہیں۔ کبھی تو کوئی بات اپنے الفاظ میں کر لیا کرو اور جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس لیے کوئی اوٹ پٹانگ پلان بنا کر دادا کے غصے کو ہوا نہ دو۔" علینہ نے ان سب کو سر جوڑے بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔

"بی بی! آپ تو مایوں بیٹھی ہوں گی۔ اس محاذ پر اب ہمیں اکیلے ہی لڑنا ہے۔" منصور نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"آخر کو ہمارے خاندان کی دوسری شادی ہے اور اسے ہم پہلی کی طرح ان کی دہشت کی نذر نہیں ہونے دیں گے۔" احمر کو اپنی شادی میں ان کی شرکت اب تک یاد تھی۔

"میں اب ان کے لیے دعا گو ہوں۔ تم لوگوں کے ارادے کافی "نیک" لگتے ہیں۔ مناہل نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

علینہ اور عدیل کی شادی کا کارڈ ملتے ہی ساجد نے اپنی فیملی کے ساتھ دو ہفتے پہلے ہی آنے کی اطلاع دی تھی۔ یہ سنتا تھا کہ ہر کوئی گھبرایا ہوا پھر رہا تھا۔ ایک سال پہلے احمر اور عمارہ کی شادی پر بھی وہ کچھ ہفتے پہلے ہی آگئے تھے اور ہر بات پر روٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔

شروع شروع میں سب نے بہت خیال رکھا مگر پھر ان کی اس عادت سے سب ہی چڑ گئے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ دادا کے چھوٹے بھائی کے اکلوتے بیٹے تھے اور بھائی، بھاوج کے انتقال کے بعد انہیں دادا نے ہی پالا تھا اس لیے وہ ہمیشہ سے دادا کے چہیتے رہے تھے۔ شروع سے ہی اتنی اہمیت دی گئی تھی کہ وہ اب ہر بات میں بولنا اپنا فرض بلکہ حق سمجھتے تھے۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا مگر احمر کی شادی کے ہر فنکشن میں انہوں نے کوئی نہ کوئی بدمزگی ضرور کی تھی۔ اسی لیے گھر کا بچہ بچہ ان سے پریشان تھا۔ اس دفعہ دولہا دلہن دونوں خاندان کے ہی تھے، علینہ عدیل کے چچا کی بیٹی تھی۔ اس لیے سسرالیوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی مگر پھر بھی ساجد اور ان کی بیگم شبانہ کا منہ پھٹ انداز کسی کو بھی کسی کے بھی سامنے شرمندہ کروا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اسٹیشن پر پورے آدھے گھنٹے انتظار کروایا منصور نے۔"

گھر آتے ہی سب سے پہلی شکایت منصور کی ہوئی تھی، جو اس گرم دوپہر میں ساجد بھائی اور ان کی فیملی کو اسٹیشن سے لینے گیا تھا۔ اوپر سے ان کا ڈھیر سامان لگا تھا شبانہ بھابھی نے پورے سال کا سامان ہی پیک کر لیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ساجد بھائی نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ منصور بے چارے کو ہی سب گاڑی میں رکھنا پڑا۔

"میں نے کہا بھی تھا کہ تین بجے تک پہنچ جانا۔ یہ اتنا لمبا سفر کر کے آ رہے ہیں۔ اب اس گرمی میں اسٹیشن پر کھڑے رہے۔" دادا نے منصور کو خشمگیں نظروں سے گھورا تھا اور منصور نے بچے کو۔

"دادا! میں تو پونے تین بجے ہی اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا یہ ساجد بھائی ہی دوسری طرف سے باہر نکل گئے تھے۔ انہیں ڈھونڈنے میں تھوڑا ٹائم لگ گیا مگر تب بھی ٹرین آئے مشکل سے پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے۔"



منصور اپنی شکایت سن کر تلملا کر رہ گیا۔

"جانے دیں بڑے ابا! یہ نہیں سدھر سکتے۔ وہ ہم ہی ہیں جو بڑوں کے پہلے حکم پر دوڑ پڑتے تھے۔" ساجد بھائی نے دادا کو تسلی دیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنی تعریف کی تھی۔

"اپنے منہ میاں مٹھو۔ اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے بلکہ زبردستی کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیتے ہیں۔" منصور نے کمرے میں آتے ہی بھڑاس نکالی تھی۔

"یار احمر! تمہاری شادی والا سین نہ ہو۔ ہر بات پر پھڈا۔ کچھ مجھ غریب پر رحم کرو۔ مجھ میں تم جتنی برداشت نہیں ہے۔" عدیل کو اپنی ہی فکر لگی ہوئی تھی۔

"آپ فضول میں پریشان ہو رہے ہیں عدیل بھائی! ورنہ علینہ تو کافی پرسکون ہے۔" عنبر نے تپے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اپنی بہن علینہ کو گھورا۔

"تم کہاں سے جلی بھنی آ رہی ہو؟" عمارہ بھابی نے عنبر کو غصے میں آتا دیکھ کر پوچھا تھا۔

"میں نے سوچا یہ لوگ گرمی میں آئے ہیں تو انہیں کولڈ ڈرنکس پیش کی جائیں۔ جھٹ پٹ کوک گلاسوں میں نکالی اور لے کر پہنچ گئی۔ اس پر شبانہ نے فوراً ہی اعتراض کر دیا کہ کھانے کا پوچھنے کے بجائے کوک تھما دی۔ ناراض بھی ہو گئیں اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس بھی خالی کر گئیں۔ اسے کہتے ہیں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔" عنبر بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔

"ہاتھی کے نہیں ہتھنی کے۔" منصور نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

"پچھلی دفعہ یاد ہے کتنا واویلا کیا تھا، اتنی سردی میں آئے ہیں۔ کسی نے چائے کو پوچھنے کے بجائے زبردستی کھانا ٹھنسوا دیا۔ اب کوئی پوچھے کہ کھانا سامنے رکھا تھا۔ ٹھونسا تو آپ نے اپنی مرضی سے ہے اور پھر کھانے کے بعد چائے بھی پی تھی مگر ساجد بھائی اسی بات پر ناراض رہے کہ وہ کھانے کے بعد چائے نہیں پی سکتے، ان سے پہلے پوچھنا چاہیے تھا۔" مناہل نے احمر کی شادی کی بات یاد دلائی تو وہ سب ہی شروع ہو گئے۔

"بری بات ہے۔ اگر کسی بڑے نے تم لوگوں کی یہ باتیں سن لیں نا تو طوفان ہی آ جائے گا۔ کوئی ہتھنی کہہ رہا ہے تو کوئی کھانا ٹھنسوا رہا ہے۔" عمارہ نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے ان لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ارے ہاں، احمر! تمہیں یاد ہے شادی والے دن ساجد بھائی اور ان کی فیملی اسٹیج پر جم ہی گئی تھی۔ انہوں نے پورے آدھے گھنٹے مووی بنوائی تھی اور مستقل تمہیں ہدایتیں بھی دیے جا رہے تھے کہ دولہا ادھر ادھر دیکھتا اچھا نہیں لگتا۔ شریفوں کی طرح بیٹھو۔" عدیل کی پریشانی سب سے سوا تھی۔

"ہاں جس پر میں نے کہا تھا کہ آپ گھونگھٹ کا بندوبست کر دیں میں وہ نکال کر بیٹھ جاتا ہوں۔" احمر اپنی بات یاد کر کے خود ہی محظوظ ہوا۔

"یار اب ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی نہ ہو۔ انہیں اسٹیج سے دور ہی رکھنا۔ ایک دفعہ بیٹھ گئے تو آسانی سے نہیں اٹھنے والے۔" عدیل نے پریشانی سے کہا۔

"اور وہ شبانہ بھابھی نے مہندی کے فنکشن میں میری دوستوں کے سامنے مجھ سے کہا کہ تم ہلکی آواز میں گانے گانا تمہاری آواز اچھی نہیں ہے اور پھر پورے فنکشن میں اپنی آواز کا "جادو" بلکہ باجا بجایا تھا۔ میری اچھی خاصی آواز کی برائی کر کے خود کو ملکہ ترنم سمجھ رہی تھیں۔" مناہل کو اس دن کی شرمندگی اب تک یاد تھی۔

"وہ نہیں یاد؟ عمارہ بھابی کی کزنز کے سامنے ہی میرے سوٹ کو کہہ دیا کہ 'پرانے اسٹائل کا ہے..... میں نے تو اپنا آرڈر پر بنوایا ہے مگر ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا' میرے اتنے مہنگے سوٹ کی شان میں اتنی بڑی گستاخی..... اور میں لحاظ میں چپ رہ گئی تھی۔" عنبر کو ایک اور بات یاد آگئی تھی۔

"اگر میں نہ ہوتا تو اس قوم کا کیا ہوتا۔" منصور نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے ان سب کو دیکھا تھا۔

"تم نے ہوتے ہوئے کون سے تیر مار لیے ہیں بلکہ سب سے پہلا شکار تو تم ہی ہوئے ہو۔ آتے ہی سب سے پہلے تمہاری شکایت ہو گئی۔" عنبر نے اس کا صاف مذاق اڑایا تھا۔

"اب دیکھنا۔ میں کیسے تیر مارتا ہوں۔ ساجد بھائی نادانستگی میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال بیٹھے ہیں۔" منصور کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر سب کا دل دھک سے رہ گیا تھا کیونکہ وہ کم ہی کوئی ماسٹر پلان بناتا تھا، مگر جب بھی بناتا تھا دوسرے کی درگت دیدنی ہوتی تھی۔

"ہم تمہارے ساتھ ہیں میرے بھائی۔" عدیل کے سر سے سارا بوجھ ہی اتر گیا تھا اس نے پرجوش انداز میں منصور کو تھپکی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی اور دادی! ذرا ایک سیکنڈ سکون سے بیٹھ کر میری بات سن لیں۔" کمرے میں علینہ کا سامان پھیلائے بیٹھی اپنی امی اور دادی کو منصور بڑی مشکلوں سے اپنی طرف متوجہ کر پایا تھا۔

"کیا بات ہے جلدی کہو۔ ابھی مجھے بہت کام کرنے ہیں۔" دادی نے تنگ آ کر ہاتھ میں پکڑا سامان اپنی بہو کو پکڑایا اور اس کی طرف دیکھا۔

"دادی! وہ ساجد بھائی کہہ رہے تھے کہ انہیں دلی صدمہ پہنچا ہے کہ اب بزرگوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دینا چھوڑ دیا ہے۔ ورنہ پہلے سب بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیا کرتے تھے۔ بہت افسوس کر رہے تھے کہ بچے تو بچے بزرگ بھی پرانی قدریں بھلاتے جا رہے ہیں۔" منصور نے اپنے لہجے میں دکھ سموتے ہوئے بتایا اور دادی کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔

"کہتا تو ٹھیک ہے مگر اس میں بزرگوں کی کوتاہی نہیں ہے۔ یہ نئی نسل ہی ہے جو سر پر ہاتھ رکھوانے سے بدکتی ہے کہ جیل لگا کر کھڑے کیے بال بیٹھ جائیں گے۔" دادی نے منصور کو گھورا کیونکہ ایسے اعتراضات وہی کیا کرتا تھا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں دادی کہ اگر ہم غلطی پر ہوتے ہیں تو آپ لوگ کیوں ہماری ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پرانی اور خاندانی قدروں کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آج سے صبح شام ہم سب بڑوں سے سر پر ہاتھ رکھوا کر دعائیں لیا کریں گے۔ پورا خاندان جمع ہے سب کو پتا چلنا چاہیے کہ آپ اور دادا نے اپنے بچوں کی کیسی تربیت کی ہے۔ بس آپ سب بڑوں کو کہہ دیں کہ بچوں کو سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دینی ہے، خاص کر ساجد بھائی کو، انہوں نے تو یہ بات دل پر ہی لے لی ہے۔"

منصور نے سعادت مندی کی انتہا کر دی تھی ورنہ اتنی محنت سے سیٹ کیے اپنے بالوں پر دادا کا وزنی ہاتھ رکھنا۔ اسے سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی تھی لیکن یہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی تھا مگر اس کی امی منصور کو ہی گھور رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی تھیں، وہ اتنا سیدھا تو نہیں تھا جتنا بن رہا تھا۔ منصور نے گھبرا کر دادی کی طرف دیکھا جو بہت محبت پاش نظروں سے اپنے سعادت مند پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مہندی والے دن صبح سے ہی گہما گہمی تھی۔ ساجد بھائی نے پورے دن باہر کی تیاریوں پر اتنی تنقید کی تھی کہ اب وہ جدھر جاتے سب لڑکے ادھر ادھر نکل جاتے تھے۔ دوسری طرف شبانہ بھابھی بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ لڑکیوں کی تیاری کے بارے میں پوچھ پوچھ کر انہیں پریشان کر دیا تھا۔ ابھی بھی مناہل کے پیچھے لگی ہوئی تھیں کہ وہی لپ اسٹک استعمال کریں گی جو اس نے کی ہے مگر وہ مناہل ہی کیا جو کسی کو اپنا "اسٹائل" کاپی کرنے دے۔

"تم پر یہ رنگ زیادہ سوٹ نہیں کر رہا۔ تم میری براؤن شیڈ والی یوز کر لو نا۔" شبانہ بھابھی نے ایک اور حربہ آزمایا۔

"ابھی عمارہ بھابھی تو تعریف کر کے گئی ہیں اور میں ان پنک کپڑوں کے ساتھ براؤن لپ اسٹک لگا لوں؟" مناہل نے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی، دوسری پنک آئی شیڈز پر اور تیسری شبانہ بھابھی کے ہاتھ میں پکڑی ڈارک براؤن لپ اسٹک پر۔

"ہاں تو کیا ہوا، اچھی لگے گی۔ ذرا دکھانا یہ پنک والی اور تم نے مسکارا کون سا یوز کیا ہے یا نقلی پلکیں لگائی ہیں؟ آج کل تو بھئی لڑکیاں گھر میں ہی لگا لیتی ہیں میری تو شکر ویسے ہی اتنی گھنیری ہیں کہ ضرورت ہی نہیں ہے۔" شبانہ بھابھی نے اس کے ہاتھ سے لپ اسٹک لینے کی کوشش کی جو شاید مناہل نے نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"جی واقعی آپ کی پلکیں بہت "گھنیری" ہیں مگر آپ کوشش کیجیے گا کہ آنکھیں کم جھپکیں ورنہ یہ اپنی جگہ سے ہل بھی جاتی ہیں۔" مناہل نے انہیں تھوڑی دیر پہلے بیوٹیشن سے پلکیں لگواتے دیکھا تھا۔ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے مناہل نے عنبر کو اشارہ کیا جس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔

"بھابھی! بیوٹیشن سے گلیو لے لیجیے گا، اگر ہل وِل جائیں تو میں دوبارہ چپکا دوں گی۔" عنبر نے ان کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھے تو مناہل کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"یار! آج اگر انہوں نے میری آواز کو کچھ کہا نا تو میں ان کا نقلی پلکوں والا پول سب کے سامنے کھول دوں گی۔" مناہل نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

"انہیں کیا فرق پڑے گا۔ تم رہنے دو، بس منصور سے کہہ دو، وہ دیکھ لے گا۔ دیکھا نہیں عدیل بھائی سب کچھ اس پر چھوڑ کر کتنے پرسکون ہو گئے ہیں۔" عنبر کی بات ابھی بیچ میں ہی تھی کہ منصور بھی وہیں آ گیا۔

"کسی نے میرا نام لیا؟" اس نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں شیطان کا نام لیا اور وہ حاضر۔" عنبر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی تعریف کر رہی تھی اب چڑانے سے باز نہیں آئی۔

"لگتا ہے تم باقی سب کی طرح پرسکون نہیں رہنا چاہتیں۔ اب میرے پاس اپنا کوئی مسئلہ لے کر مت آنا اور مناہل میری اچھی بہن! تمہیں پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ آج شبانہ بھابھی گانے ہی نہیں گائیں گی۔ تم سکون سے انجوائے کرنا۔" منصور نے اپنی بہن کو بالکل ایسے تسلی دی جیسے پتا نہیں کتنا گمبھیر مسئلہ ہو۔

"بھائی! یہ اپنے سارے مسئلے آپ کے پاس نہ بھی لائے تو بڑوں نے یہ سب سے بڑا مسئلہ آپ کے سر ہی ڈال دیا ہے اس لیے اگر آپ کو پرسکون رہنا ہے تو اسے پرسکون رکھنے کی پوری کوشش کیجیے گا ورنہ یہ آپ کو کبھی پرسکون نہیں رہنے دے گی۔" مناہل کے گھورنے کی پروا کیے بغیر کہا تھا اور آگے بڑھ گئی۔

"مجھے اپنے مسئلے خود سلجھانے آتے ہیں۔ آپ کی ضرورت نہیں ہے۔" عنبر نے منصور کو مسکراتے دیکھا تو خود بھی مناہل کے پیچھے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

مہندی کا فنکشن گھر کے لان میں تھا۔ سارا لان پورے دن کی محنت کے بعد جگ مگ کر رہا تھا۔ سب مہمان باتوں میں مصروف تھے۔ پھولوں سے سجے جھولے پر عدیل اور علینہ کو بٹھا کر رسمیں کی جا رہی تھیں لیکن عدیل کی نظریں مستقل ساجد بھائی پر تھیں اور کان تھے کہ ان کی گوہر افشانیوں کی تاب نہیں لا پا رہے تھے۔

"منصور یار! ان کا کچھ کرو، بعد میں ہمارا ہی مذاق اڑے گا۔ مستقل پتا نہیں کیا کیا بتائے جا رہے ہیں۔ یہ بچپن کے قصے سنانے کا کون سا وقت ہے۔" عدیل پتا نہیں کب سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے توجہ دلانے پر

منصور نے اسے تسلی دی اور ساجد کی طرف بڑھ گیا۔
"ساجد بھائی! ادھر آئیے گا ذرا۔" ساجد کو اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر منصور نے ایک طرف بلا لیا تھا۔
"کیا آفت ہے جو اس طرح بلا رہے ہو؟ تمیز نہیں ہے کہ بڑے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں ان کی بات نہیں کاٹتے۔" انہوں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
"ساجد بھائی! بات ہی ایسی ہے۔ دیکھیں، مجھے اندازہ ہے یہ آپ کے لیے کافی حساس موضوع ہے مگر آپ کی عزت ہماری عزت ہے۔ اب اگر کوئی آپ کا مذاق اڑائے تو ہمارے دل پر تو چھریاں چلیں گی ہی۔" منصور نے ان کے تیز لہجے کو برداشت کرتے ہوئے بھرپور ایکٹنگ کی۔
"کیا اول فول بک رہے ہو؟ کیا بات ہے کھل کر کہو۔" ساجد میں برداشت کی ہمیشہ سے کمی تھی۔ اب بھی فوراً" بھڑک اٹھے تھے۔
"بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ نے وگ پہنی ہوئی ہے۔ اس لیے آپ اسٹیج سے دور ہی رہیے گا۔ یہ مووی والے بہت تیز ہوتے ہیں۔ ذرا جو انہیں اندازہ ہو گیا' آپ گنجے ہیں تو بار بار آپ کے بالوں پر فوکس کریں گے۔" منصور نے رازدارانہ انداز اپنایا۔
"کیا فضول باتیں ہیں! میں کوئی وگ نہیں پہنتا۔ خبردار جو تم نے کسی سے یہ بکواس کی۔" منصور نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ تلملا ہی گئے۔
"نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے بھائی! جیسے آپ کی مرضی میں نے تو بھائی سمجھ کر کہہ دیا تھا۔" منصور نے انہیں ترحم بھری نظروں سے دیکھا اور وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بڑے ابا کی طرف بڑھ گئے۔
"ساجد بیٹا! تم ادھر کھڑے ہو' وہاں کھانا لگ چکا ہے' کچھ لو نا۔" دادا ابا نے پیار سے کہتے ہوئے ان کے سر پر ہاتھ رکھا مگر اب ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔
"میں کھا چکا ہوں بڑے ابا! شکریہ۔" بے مروت لہجے میں کہتے ہوئے وہ کونے والی میز کے قریب پڑی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئے۔ دادا کو پہلی دفعہ ان کا انداز برا لگا تھا۔
"یہ بچے اتنا بھی غلط نہیں کہتے۔ ساجد کا مزاج کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔" ان کی بڑبڑاہٹ پاس کھڑے احمر نے سن لی اور منصور کو اس کے پلان کی کامیابی کی خوش خبری دینے کے لیے اس کی تلاش میں نظر دوڑانے لگا۔
"آخر مسئلہ کیا ہے؟ سب نے میری چڑ بنالی ہے۔ جسے سلام کر دیا بات ہی کرو فوراً" پاس بلا کر میرے بال خراب کر دیتے ہیں۔ یہ سر پر ہاتھ رکھنے کی کیا تک بنتی ہے۔" اب ساجد کی برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ شام سے کوئی پچاسویں دفعہ ان کے سلام کرنے پر بڑوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دی تھیں اور ساجد کی جان پر بن آئی تھی۔ اگر جو ان کی وگ اپنی جگہ سے لڑھک جاتی تو جو ان کا حشر ہوتا یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ بڑبڑاتے ہوئے ساتھ بیٹھی شبانہ کی طرف دیکھا جو اپنے ہی خیالوں میں گم تھیں۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟ ویسے تو پورا دن اپنی سریلی آواز میں گنگنا گنگنا کر میرے سر میں درد کر دیتی ہو۔ اب لڑکیاں بیٹھی گانے گا رہی ہیں تو تم ادھر آ کر کیوں بیٹھ گئیں؟" انہوں نے حیرت سے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔
"ارے میں ان کی طرح بے وقوف تھوڑی ہوں جو آج ہی گا کر اپنی آواز خراب کر لوں۔ کل کے فنکشن میں ابرار الحق انوائیٹڈ ہیں اور ان کو اپنے ساتھ گانے کے لیے کسی سریلی آواز والی لڑکی کی ضرورت ہے۔ میں تو کل ہی گاؤں گی اور یہ سب جیلس ہوں گی۔" وہ آج ہی کل کے خیالوں میں گم تھیں۔
"تمہیں یہ کس نے بتا دیا؟" ساجد بھائی نے "سریلی آواز" اور "لڑکی" کو بمشکل ہضم کرتے ہوئے ان کی بات پر بے یقینی سے پوچھا۔
"منصور نے اور کس نے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے بھئی۔ ان سب میں ایک وہی معقول لگا۔ میں تو اپنی کرن کے

سے کچھ کام ہے'' علی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا' عظمیٰ نیم توجہی سے اسے دیکھنے لگی۔

''گیٹ بند کرلینا۔''

''ہاں۔'' عظمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پچھلے دس دنوں کے دوران محلے کے دو گھروں میں دن دہاڑے ڈکیتیاں پڑچکی تھیں' اس لیے محلے کے باقی لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔

علی کے جانے کے بعد عظمیٰ دروازہ بند کر کے واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں براجمان ہو گئی۔ عجیب سی دُھند بھری اداسی نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ سامنے کا منظر کچھ واضح ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''روشنی عطا کر مہربان رب۔'' عظمیٰ کے دل سے خود بخود صدا نکل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

''ہم دونوں بہت چھوٹے سے تھے' جب ہمارے والدین یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ ہم اتنے چھوٹے تھے کہ کچھ دھندلی دھندلی یادوں کے سوائے اور کچھ ٹھیک سے ہمیں یاد بھی نہیں۔ ہاں! مجھے یہ یاد ہے کہ میں روتا بہت تھا۔ زرین مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی تھی' ہو سکتا ہے وہ بھی بہت روتی ہو' مجھے اس کا ٹھیک سے اندازہ نہیں مگر میں کافی بڑا ہو جانے کے بعد بھی بہت روتا تھا۔ پڑھائی کا معاملہ ہو' کھانے پینے کا' کہیں آنے جانے کا' یا ہماری ضروریات کا' قدم قدم پر ماں' باپ کی محرومی کا احساس ہوتا تھا' گو کہ عظمیٰ کی امی جنہیں ہم اچھی خالہ کہہ کر پکارتے تھے' ہم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے اور انکل نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ اس گھپ اندھیرے دور میں یہ گھرانا ہمارے لیے روشنی کی مشعل تھا۔ زرین تو رہتی ہی یہیں تھی' بس پتا نہیں کیوں' تمام تر محبتوں اور شفقتوں کے باوجود بھی میرا دل یہاں ذرا کم ہی لگتا تھا۔ مجھے اپنے گھر کا وہ بڑا کمرا اچھا لگتا تھا' جو امی ابو کا تھا ان کی مسہری پر چت لیٹا چھت کو گھورتے ہوئے میں گھنٹوں جانے کیا کیا سوچتا تھا اور مزید بڑے ہونے کے بعد اس محرومی کا احساس اور شدید ہو گیا کہ اللہ نے ہم سے ہماری کیا نعمت واپس لے لی ہے۔

پھر خالہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہم سب محبت و شفقت کی اس گھنی چھاؤں سے بھی محروم ہو گئے۔ میں اس وقت نویں جماعت میں تھا۔ پھر انکل' بڑی آپا اور چھوٹی آپا کا دست شفقت ہمارے سروں پر رکھا گیا۔ انکل نے میرے بڑے بھائی کی پڑھائی اور نوکری میں مدد کی اور نوکری لگتے ہی کافی کم عمری میں ان کی شادی کر دی۔ بھابھی اچھی تھیں یا شاید ہمارے نصیب بہت اچھے تھے کہ ہماری زندگیوں سے محرومی اور اداسی کے جو گنے چنے چند نقوش باقی تھے' وہ بھی مٹ گئے۔

اچھی خالہ کے گھرانے سے میرا صرف کزن کا رشتہ ہی نہیں بلکہ ایک قلبی تعلق بھی ہے' ایک ان مٹ اچھوتا اور خوب صورت رشتہ جو دل سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے۔ جو اس گھر کے مکینوں سے مجھے ہے بلکہ ہم بہن بھائیوں کو ہے' اسی گھر کی ایک فرد عظمیٰ ہے' کبھی کبھی مغرور' چلبلی اور اکھڑ مزاج اور کبھی نرم' مہربان' خوش مزاج... ہاں! اچھی خاصی جذباتی بھی ہے۔ میں اس کے بارے میں اس لیے بات کرنے لگا ہوں کہ آج کل... نہیں بلکہ پچھلے کئی مہینوں سے میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کیا؟

یہ ہی میں سوچتا ہوں کہ آخر میں اس لڑکی کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں؟

لوگ کہتے ہیں کہ میں ایک سیدھا سادا لڑکا ہوں۔ بقول عظمیٰ کافی حد تک بے وقوف' شائد وہ بھی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ آج کل سادگی کا دوسرا نام بے وقوفی ہی ہے' مگر میں کوئی اتنا سادہ مزاج یا زاہد خشک بھی نہیں' زندگی بہرحال اپنی تمام تر رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ متوجہ کرتی ہی ہے۔ خواب دکھانے کو نہ سہی' مگر دیکھنے کو تو دل کرتا ہے اور آج کل تو دل کا عالم کچھ اور ہی ہے۔ بے شک کوئی افسانوی بے چینی و بے قراری نہیں' کوئی ڈرامائی سچویشن بھی نہیں' غیر معمولی دھڑکن دل بھی نہیں مگر پھر بھی' کچھ نہ کچھ مختلف اور انوکھا ضرور ہے' جانے کہاں... اس دنیا میں یا دل کی دنیا میں؟

بہار اپنے جوبن پر کب کی آچکی' پھول نکلے بہت دن گزر گئے' خوشبو پھیل کر مشام دل و جان مہکا گئی' پھر بھی وہ لب مسکراہٹ سے بہت دور ہیں' جس کی ہنسی میں زندگی مسکراتی تھی' وہ خموشی کے دبیز چادر کی بکل مار کے اداس کیوں بیٹھی ہے' میں اس کے لیے تارے توڑ کر نہیں لانا چاہتا کہ ستارے تو خود اس کی آنکھوں میں دمکتے ہیں نہ کلیوں کی ہنسی چرا کر اس کے ہونٹوں پہ سجانے کی خواہش ہے کہ یہ سب اس کے شایان شان نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ اس کے راستے کے سارے کانٹے چن کر ان کی جگہ پھول رکھ دوں تاکہ اسے زندگی کا سفر طے کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری اس خواہش کو پذیرائی بخشے گی یا نہیں' اگر جواب ہاں میں ہو گا تو مجھے بہت خوشی ہو گی' اگر جواب انکار ہوا تو افسوس تو ہو گا' بہت ہو گا' یا شاید بہت زیادہ ہو گا' مگر بہرحال زندگی تو یونہی رواں دواں رہے گی' اور جو اس کا ساتھ مل جائے تو... تو یقیناً'' زندگی میں اچھی خاصی روشنی آجائے گی' ویسی ہی' جیسی عظمیٰ کی آنکھوں میں ہے۔

کبھی کبھی مجھے واقعی بہت سنجیدگی کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ زندگی کا سفر بہت خوب صورت اور انوکھا ہو گا' اس کے علاوہ کسی اور کا تصور... بہت مشکل ہے۔''

☼ ☼ ☼

''ابو جی! آپ کے لیے کھانا لے آؤں یا نماز پڑھ کر کھائیں گے؟'' عظمیٰ ابو سے پوچھنے آئی تھی۔

''کیا پکایا ہے؟''

''کریلے قیمہ۔''

''ہوں۔'' ابو نے ہنکارا بھرا۔

''نماز پڑھ کر سب کے ساتھ ہی کھالیں گے۔''

''اچھا۔'' وہ پلٹ کر جانے لگی۔

''ادھر آؤ بیٹا!'' ابو نے اسے پکارا۔

''جی۔''

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' انہوں نے اپنے برابر جگہ کو ہاتھ سے تھپکا۔

''جی۔'' عظمیٰ آکر ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹی! پریشان کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' عظمیٰ کچھ کہنا چاہتی تھی' مگر اس کے منہ سے لفظ نکلنے کے بجائے آنکھوں سے آنسو نکل پڑے' فقط آنسو' جن کی اپنی ہی ایک الگ زبان ہوتی ہے' انسان کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتا ہے۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے عظمیٰ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں' بس...'' عظمیٰ اپنا گیلا چہرہ صاف کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولی۔

''عروبہ اور اسد کو دیکھ کر کبھی کبھی مجھے بہت رونا آتا ہے' شدت سے دل چاہتا ہے کہ کہیں سے بھی کیسے بھی' عفرا اور بھائی جان کو ان کے سامنے لے آؤں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ابو! اللہ ہمارے پیارے ہم سے کیوں چھین لیتا ہے؟''

''چھیننے کا کیا مطلب ہے بیٹی' اللہ اپنی ہی دی ہوئی نعمتیں ہم سے واپس لے لیتا ہے جب اور جیسے اس کی مرضی ہوتی ہے' ہمارا کام تو بس راضی برضا رہنا ہے' شکوے شکایت کا تو ہمیں حق ہی نہیں۔'' ابو نے ایک گہری سانس لی۔

''اچھا' اب میں ایک ضروری بات کروں اپنی بیٹی سے؟''

''جی' عظمیٰ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''سجاد میاں آئے تھے۔'' انہوں نے علی اور زرین کے بڑے بھائی کا نام لیا۔

''جی' شام میں میرے سامنے ہی تو آئے تھے' خیریت تو ہے نا۔'' عظمیٰ نے ابو کے غیر معمولی انداز پر چونک کر انہیں دیکھا۔

''وہ علی کا رشتہ تم سے کرنے کے خواہش مند ہیں۔'' ابو نے مختصر لفظوں میں بتایا۔

''جی؟'' عظمیٰ ان کی بات سن کر بھونچکا رہ گئی۔

لیے سوچ رہی ہوں۔ کتنا جچے گا اس کے ساتھ۔ آپ بات کریں نا بڑے ابا سے۔" شبانہ نے سامنے کھڑے منصور کو دیکھتے ہوئے کہا اور ان کے قریب اپنی دوستوں کو کھانے کا پوچھتی عنبر کو تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔ وہ تیر کی طرح منصور کے پاس پہنچی تھی۔

"منصور! یہ شبانہ بھابھی کے زیادہ آگے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ساجد بھائی ہیں۔ شبانہ بھابھی سے ہم خود نمٹ سکتے ہیں۔ ان سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے اور کل ان کی بہن بھی آئے گی۔ خبردار! جو مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کیں" اس نے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا فرق پڑ رہا ہے میرے مسکرانے سے۔ ویسے بھی میرے مسکرانے پر تو لوگ پٹ پٹ گرتے ہیں۔" منصور نے فرضی کالر اکڑائے۔

"تمہیں مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو مچھر دہشت سے پٹ پٹ گرتے ہیں کیونکہ انسان پٹ پٹ نہیں گرا کرتے، دھڑ دھڑ گرتے ہیں اور وہ شبانہ بھابھی کی کزن گرے گی۔ اگر میں نے اسے زیادہ فری ہوتے دیکھ لیا تو..." عنبر نے اسے اپنی بات مذاق میں ٹالتے ہوئے دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔

"آخر ہوا کیا ہے، جو تم اس کی جان کو آگئی ہو؟" منصور نے اس کے غصے سے لال ہوتے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہونا کیا ہے، شبانہ بھابھی کو آپ اپنی لاڈلی بہن کے لیے بہت پسند آگئے ہیں، اور آگے پیچھے پھریں۔ شبانہ بھابھی! کھانا لیں نا۔ شبانہ بھابھی! آپ کی آواز بہت اچھی ہے، کل ابرارالحق آپ کے ساتھ ہی گانا پسند کرے گا۔ شبانہ بھابھی! ساجد بھائی کو وگ کا خیال رکھنے کو کہیں ورنہ آپ کا ہی مذاق اڑے گا کہ کہاں آپ اتنی نفیس لڑکی کہاں وگ پہنے ساجد بھائی۔" عنبر نے اس کے انداز کی نقل اتاری اور منصور کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

"اب خود ہی غور کر لو ان میں سے کون سی ایسی بات ہے، جس سے لگے میں ان کی لاڈلی کی وجہ سے دیوانہ ہوا جا رہا ہوں۔ ہر بات اپنے پلان کو کامیاب کرنے کے لیے کہی ہے اور تم زیادہ نہ تپو، میں انہیں بتا دوں گا کہ مجھے زبردستی تمہارا منگیتر ہونے کی ذمہ داری دی جا چکی ہے۔" منصور نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور عنبر پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

حیرت انگیز طور پر شادی کا فنکشن مہندی سے بھی زیادہ پرسکون رہا تھا۔ میرج ہال میں ہر طرف گہما گہمی تھی۔ چھوارے بانٹتے منصور اور احمر کے چہروں پر کی مسکراہٹ ان کے پلان کے ہٹ بلکہ سپر ہٹ ہو جانے کی گواہی دے رہی تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے عدیل نے بھی سکون کا سانس لیا کہ اس کی شادی میں احمر جیسی بدمزگی ہوئی نہ ہی ساجد بھائی نے زیادہ نکتہ چینی کی۔ وہ اور ان کی بیگم ایک طرف بیٹھے سب ہوتا دیکھتے رہے۔ دادا نے بھی اس دن والی بات کے بعد انہیں زیادہ لفٹ نہیں کروائی تھی۔ ایک طرف ساجد بھائی اپنی وگ اور مووی میکر سے پریشان تھے جو مستقل انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا (منصور کی ہدایت جو تھی) اور ہر تھوڑی دیر بعد کوئی بچہ آکر ان سے کہہ جاتا تھا "انکل! آپ کے بال اچھے لگ رہے ہیں۔" اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیں۔

دوسری طرف شبانہ بھابھی کو رہ رہ کر منصور کے جھوٹ پر غصہ آرہا تھا کہ ابرارالحق مدعو ہے۔ مہندی کے دوسرے فنکشن میں وہ کتنا دل لگا کر تیار ہوئی تھیں مگر فنکشن ختم بھی ہو گیا اور ابرارالحق کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ان کے پوچھنے پر منصور نے حیرت سے کہا تھا۔

"ارے وہ تو میں مذاق کر رہا تھا۔ ابرارالحق کو ہم بلا بھی لیتے تو وہ کون سا دوڑے چلے آتے۔" اس سے پہلے کہ شبانہ بھابھی اس جھوٹ پر اسے کچھ کہتیں وہ ایک دفعہ پھر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو چکا تھا۔

صرف یہی نہیں وہ عنبر اور منصور کی باقاعدہ انگیجمنٹ پر مزید برامان گئی تھیں۔ ان ہی کے کہنے پر ساجد نے بڑے ابا سے بات کی تھی اور انہوں نے عدیل کے ولیمے والے دن ہی عنبر اور منصور کی جھٹ پٹ منگنی کر دی۔

☆ ☆ ☆

"مزا آگیا یار۔" احمر نے منصور کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ آج ولیمہ کا فنکشن بھی ہو گیا تھا اور اب وہ سارے کزنز احمر بھائی اور عمارہ بھابھی کے کمرے میں بیٹھے تبصرے کر رہے تھے۔

"میں نے کہا تھا نا میں نہ ہوتا تو اس قوم کا کیا ہوتا۔" منصور اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

"مان گئے آپ کو اور خالی ہم ہی کیا بہت سے لوگ مان گئے۔ جدھر جاؤ منصور کی تعریفیں سننے کو مل رہی ہیں خاص کر شبانہ بھابھی۔ کل تک بڑی تعریفیں کر رہی تھیں تمہاری تب ہی تو اپنی بہن کے لیے کہلوایا تھا۔ اپنی عنبر تو بہت غصے میں تھی۔" عمارہ بھابھی نے مسکراتے ہوئے کہا اور عنبر کی طرف دیکھا جو اب بڑی پرسکون بیٹھی تھی۔

"اس میں غصہ کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جہاں بیر ہو وہاں پتھریاں تو آتی ہی ہیں اور بیر بھی مجھ جیسا ہینڈسم۔" منصور نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اترا کر کہا۔

"جہاں بیری ہو وہاں پتھر آتے ہیں یہ ہے اصل محاورہ اور یہ لڑکوں کے لیے استعمال ہوتا ہے لڑکیوں کے لیے نہیں۔" عنبر جو بہت شرمیلی بنی بیٹھی تھی منصور کی بات پر ایک دفعہ پھر اپنے ازلی موڈ میں واپس آئی تھی۔

"اچھا! آئے تو کوئی پتھر۔ میں پتھر کا جواب اینٹ سے دوں گا۔" منصور نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

"اف! پتھر کا جواب اینٹ سے نہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔" محاوروں کا یہ حشر ہوتے دیکھ کر عنبر کا دل چاہا کہ سر پیٹ لے 'اپنا نہیں منصور کا۔'

"چلو تم فکر نہ کرو اینٹ پتھر دونوں سے دے دوں گا۔" منصور نے اسے تسلی دی۔

"میں اپنی بات کب کر رہی تھی؟"

عنبر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا اور باقی سب ہنس دیے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اصل مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔ شاید ساجد بھائی اور شبانہ بھابھی جیسے لوگوں کو روکنے کے لیے منصور جیسے شیطانی دماغ کی ہی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ایسے لوگوں کو جب تک برداشت کرتے رہو، وہ دوسروں کے احساسات کا خیال کے بغیر اپنی اہمیت جتانا نہیں بھولتے۔ منصور نے بہت چالاکی سے ساجد بھائی اور شبانہ بھابھی کو اپنے خاندان کی دوسری شادی میں ٹینشن پھیلانے سے روک دیا تھا بلکہ ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک طرف ان دونوں کو ہر بات میں مداخلت کرنے سے روکا تھا اور دوسری طرف اپنی منگنی بھی کروالی تھی اور اب ان دونوں کی نوک جھونک یونہی چلتی رہی تھی۔

☆

راحت جبیں

# گلِ صنوبر

مکمل ناول

آم کے درخت پر بور آنے کے ساتھ ہی کوئل کی کوک سنسان دوپہر کے سینے میں چھید ڈالنے لگی۔ اس کی کتنی کوشش تھی کہ وہ صاحبِ آواز کو دیکھ لے، مگر ناکام ہے۔ پھر وہ سفید پلیٹ میں نیچے گرے فالسے اکٹھے کرتی گردن اٹھا اٹھا کر درخت کی شاخیں کھوجا کرتی۔

آم پر بور آتا تو شہد کی مکھیاں ہلہ بول دیتیں۔ بچوں کو ادھر آنے کی ممانعت ہوتی مگر وہ چپکے سے کچن کا پچھلا دروازہ کھول کر پچھلے برآمدے میں نکل آتی۔ آم کا بور جھڑتا، ننھی منی امبیاں اس کی جگہ لے لیتیں۔ فر... اور زیبا کی موج ہوجاتی، وہ کچی کھٹی امبیاں پھر... کھاتیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں نئی آنے والی ر... کوکب بخاری کے ناولٹ اور بشریٰ رحمٰن کے ناول پڑھتی رہتیں اور بیلا کے دانت خوامخواہ کھٹے ہو... رہتے۔ اسے امبیاں کبھی اچھی نہ لگیں۔ بس آموں کے پکنے کا انتظار کرتی۔ پھر کبھی کوئی آم پٹ سے...

فرش پر گرتا اور پھٹ جاتا تو اس کی دوڑ لگ جاتی۔

بچپن بیت گیا، مگر اس رسیلے پختہ آم کا ذائقہ آج بھی اس کے لبوں پر تازہ تھا۔ پھر بڑی امی آگے بڑھتیں جو بیلا کی تائی بھی تھیں اور خالہ بھی۔ کچا پھل درخت سے اترتا، لکڑی کی پیٹیوں میں بند کر کے پال ڈالی جاتی۔ پیٹیاں اسٹور میں، چابی بڑی امی کے بٹوے میں۔ تھوڑے دنوں میں سبز پر پیلا رنگ غالب آنے لگتا تو پکے آموں کی خوشبو اسٹور کی کھڑکیوں، دروازے کی درزوں سے پھوٹتی کچن تک آنے لگتی۔ ذکی، فیضان اور سفیان کی آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوتے اور بڑی امی سارے گھر میں اسٹور کی چابی ڈھونڈتی پھرتیں، جو کبھی وہاں سے نہ ملتی، جہاں انہوں نے رکھی ہوتی اور جب اسٹور سے پیٹیاں نکلتیں تو ایک آدھ خالی ہوتی۔ جب تک داجی زندہ تھے، ایسے میں پچھلے برآمدے میں پلنگ پر آبیٹھتے، کسی کو ٹب لینے بھگایا، تو کسی کو برف، بڑے سے ٹب میں آم بھگو کر خود نگرانی کرتے۔

"نہ۔۔۔ نہ ابھی ان کی گرمی نکلنے دو، بڑی بہو کچی لسی کا ڈول بنا لاؤ۔"

ٹب کے پہلو میں کچی لسی کا سرخ ڈول رکھا جاتا۔ پھر سب کو آوازیں پڑتیں۔ ذکی، فیضان اور سفیان، داجی کا خوب ہی مقابلہ کرتے۔ فرح اور زیبا کی کوشش ہوتی زیادہ سے زیادہ آم چھپا کر خفیہ ٹھکانے تک پہنچا دیں، تاکہ بعد میں اطمینان سے کھائے جاسکیں ورنہ لڑکوں کی اسپیڈ کا کون مقابلہ کر سکتا۔ عاشر اور بیلا چھوٹے ہونے کی بنا پر ایک ایک آم ہاتھ میں لیے عقب میں بیٹھے گٹھلی چوستے رہتے، پھر وہ تھی، جو سب میں موجود ہونے کے باوجود کہیں نہ ہوتی۔

پھر داجی کو اپنے عقب میں بیٹھے وجود کا احساس ہوتا تو پکار اٹھتے۔

"گل صنوبر۔۔۔ تم بھی لو نا۔"

مگر اسے خود سے ہاتھ بڑھا کر لینے کی عادت کہاں تھی۔ بس دوپٹے میں چھپی مسکراتی جاتی۔ کوئی ہاتھ میں تھما دیتا تو وہ ہاتھ ہی میں پکڑا رہ جاتا یا وہ چپکے سے عاشر اور بیلا کی سمت بڑھا دیتی اور بیلا کو تو وہ ہی آم اچھا لگتا تھا جو درخت سے ٹپکا ہو۔ نہ جانے کیوں اسے سب کے درمیان بیٹھ کر کھانے کی عادت ہی نہ تھی۔ حالانکہ پھل کسی بھی موسم کا ہو، اسے بے حد مرغوب تھا، اسی لیے بڑی امی اگر اس کا حصہ رکھنا بھول بھی جاتیں تو امی کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ پھر داجی سب کو لائن میں کھڑا کر لیتے۔

"آموں کی تاثیر گرم ہوتی ہے، اور کچی لسی اس گرمی کا توڑ ہے۔"

بیلا کو یہ دودھ، پانی اور نمک سے بنی لسی زہر لگتی تھی، سو فوراً ہی کھسک لیتی مگر اس کا ہاتھ عاشر کے ہاتھ میں جکڑا جاتا جو اس سے پورے ساڑھے تین سال بڑا تھا اور گھر میں واحد بیلا ہی تھی جس پر وہ اپنے بڑے پن کا رعب جما سکتا تھا۔ داجی سے شکایت لگائی جاتی اور اسے سب کے سامنے کھڑے ہو کر پورا گلاس پینا پڑتا، پھر ذکی بھیا ہاتھ منہ صاف کرتے کھڑے ہو جاتے۔

"اچھا امی! ہمارا حصہ ہمارے گھر پہنچا دیجیے گا۔"

اور ان کا گھر آٹھ سیڑھیاں عبور کر کے اوپر والا پورشن تھا۔ جہاں بیلا کی بیوہ پھپھو اپنے دو بیٹوں ذکی اور عاشر اور بیٹی مریم کے ساتھ قیام پذیر تھیں، جبکہ نچلے پورشن میں دونوں بھائی داجی کی وفات کے بعد بھی باہم شیر و شکر رہ رہے تھے کہ ان کی بیویاں، آپس میں بہنیں بھی تھیں۔ سو روایتی دیورانی، جٹھانی والی رقابت درمیان میں آئی ہی نہیں۔ وہ بڑی امی کہلائیں تو یہ چھوٹی امی، وہ بڑے ابو تو یہ چھوٹے ابو۔۔۔ سب سے بڑی گل صنوبر پھر سفیان بھیا، فیضان بھائی اور آخر میں زیبا۔ چھوٹے ابو اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ وہ دو ہی بہنیں تھیں، فرح اور بیلا، پھر یوں ہوا کہ۔۔۔

ذکی بھیا کو اپنی تایا زاد شائستہ بھا گئیں۔ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھیں، جو ایم بی اے کر رہی تھیں۔ خوب صورت، طرح دار، اعلا تعلیم یافتہ، فر فر انگریزی بولتی



اور جدید فیشن سے آراستہ شائستہ کے سامنے خاندان کی ساری لڑکیاں پانی بھرتیں اور بے حد معمولی دکھائی دیتیں، پھر ذکی بھیا بھی تو ایسے تھے، ایک دم دراز قامت، جاذب خدوخال، ہالی ووڈ کے ہیرو جیسے شان دار اعلا تعلیم یافتہ اور مزید تعلیم کے لیے باہر جانے کے لیے کوشاں۔ اب پھپھو کی بھلے اپنے جیٹھ، جٹھانی سے کبھی نہ بنی ہو، مگر شائستہ اور ذکی ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے۔

سو دونوں کی شادی ہوئی اور دونوں باہر جا بسے اور ایسے بسے کہ پھر لوٹ کر نہ آئے۔ ہاں ان دونوں کی مزید کامیابیوں کی اطلاع کے ساتھ پھپھو کے نام ڈرافٹ باقاعدگی سے پہنچتے رہے۔

مریم بیاہ کر جدہ چلی گئی۔ عاشر نے اپنے لیے آرمی کا شعبہ پسند کیا۔ اوپر کا پورشن بالکل ہی خالی ہو گیا تو پھپھو جنہوں نے ساری زندگی دونوں بھابھیوں کو گھاس نہ ڈالی تھی، اوپر کی تنہائی سے گھبرا کر سارا دن نیچے گزارنے لگیں۔ سفیان اور فیضان کے لیے خاندان ہی سے دلہنیں پسند کی گئیں۔

فرح کو اس کے ماموں نے مانگ لیا۔ دونوں کی شادی چھ ماہ قبل ایک ساتھ، ایک ہی دن ہوئی۔ فیضان کے ولیمہ والے دن فرح کی بارات تھی۔

داجی دنیا سے رخصت ہوئے اور آم کے پیڑ نے پھل دینا بند کر دیا تو ایک دن کٹوا دیا گیا۔ مگر اب بھی کالونی میں آم کے درختوں پر بور آتا تو اس کی گھنی شاخوں میں کوئل کوکتی چلی جاتی۔

"مگر۔۔۔ یہ کس کو پکارتی ہے؟"

"دور دیس میں بسنے والی سکھیوں کو آواز دیتی ہے زیبا، فرح کو بہت یاد کرتی تھی۔

"اوں ہوں۔۔۔ آنے والے ساون کی راہ دیکھتی ہے۔"

"ساون کی یا ساجن کی؟" ایک معنی خیز سرگوشی، ابھرتی ہنسی۔

"نہیں۔۔۔ کسی کے ہجر میں کرلاتی ہے۔"

پاس بیٹھی گل صنوبر گھبرا کر فریم ہاتھ سے رکھ کر یوں دوپٹے کی بکل میں چھپتی جیسے گھنی شاخوں میں کوئل۔ اسے لگتا اس کا وجود کوئل کی کوک میں ڈھل کر آنے والے ساون کی راہ دیکھتا ہے، یا کسی کے ہجر میں کرلا رہا ہے۔ یہ کرلاہٹ زیادہ بڑھتی تو وہ وضو کر کے پنج سورہ کھول لیتی۔ اس کا وجود آم کی گھنی شاخوں میں بدل جاتا، جس میں کوئل کوکتی چلی جاتی۔

☼ ☼ ☼

بالکونی کا دروازہ کھلا تو تازہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ کوئل کی کوک کمرے میں چکرانے لگی۔ اسے ابھی اور سونا تھا، سو تکیے میں سر گھسا دیا مگر تکیہ بھی کھینچ لیا گیا۔

"اٹھ جاؤ۔۔۔ ورنہ مزے دار سے ناشتے سے محروم رہ جاؤ گی۔"

"کیوں؟ سونیا بھابھی میکے سے واپس آگئیں؟" اس نے کسل مندی سے کروٹ بدلی۔

"ہاں۔۔۔ رات کو فیضان بھائی جا کر لے آئے تھے۔ تم تو کھانا کھا کر یوں مدہوش ہوئیں کہ ساری رات کروٹ بھی نہیں بدلی۔"

فرح کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

رسالے‘ واک مین‘ برش‘ واٹر کلرز‘ نائٹ کریم.... وہ سرعت سے ہر چیز ٹھکانے لگا رہی تھی۔ بیلا نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر تکیہ گود میں رکھا اور باہر جھانکنے لگی۔ اسے یہ کمرہ اور اس کا یہ نظارہ ہمیشہ سے بے حد پسند تھا۔ جہاں بیڈ پر بیٹھ کر باہر دور تک پھیلے درختوں کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ اس نے کھڑکیوں سے پردے ہٹا دیے‘ سامنے دو رویہ درختوں میں گھری سڑک بے حد سیاہ محسوس ہوتی۔ کالونی کے درختوں‘ خوب صورت گھروں کی چھتوں پر ایک روشن خوش گوار صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔

”ایک اچھے دن کا آغاز۔“ امتحانوں کی طویل تھکا دینے والی روٹین کے بعد اس نے خود کو بے حد تر و تازہ اور ہشاش محسوس کیا۔

نیچے کچن میں ہنگامہ بپا تھا۔ شن کی آواز سے پوری گھی میں پڑتی اور سوندھی سوندھی مہک سارے گھر میں منڈلانے لگتی۔ پوریاں بنانے میں جو مہارت سونیا کو تھی‘ کسی کو نہ تھی۔ کسی بیلن کی ضرورت نہیں بس ہاتھ سے جھٹک کر گھی میں اور نرم خستہ پوری تیار۔ ایک کڑاہی میں خوشبودار میوے والا حلوہ‘ دوسری میں آلو کی بھجیا اور ایک چولہے پر الائچی والی چائے دم پر۔ سونیا سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے چولہوں کے گرد چکرا رہی تھی اور پوریوں کے لیے بے تاب افراد خانہ‘ جہاں جہاں سما سکے‘ سما گئے‘ کچھ ناشتے کی میز کے گرد تو کچھ نیچے پیڑیوں پر۔

بیلا دروازے میں ہی ٹھٹھک گئی۔ پوری کا نوالہ بناتے ہاتھ رکے اور عاشر نے چمکتی براؤن آنکھوں کے ساتھ دروازے میں ایستادہ بیلے کی کلیوں سی نازک لڑکی کو دیکھا‘ جس کے چہرے پر تحیر آمیز سادہ سی خوشی رقم تھی‘ جبکہ براؤن آنکھوں میں جہان شوق امڈ آیا تھا۔

”تم کب آئے؟“ وہ اس سے پورے ساڑھے تین سال بڑا تھا مگر گھر کے دو چھوٹے افراد ہونے کی بنا پر ساری زندگی خود کو مظلوم عوام سمجھتے رہے۔ سو دونوں میں بچپن سے بلا کا ایکا رہا۔ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے عاشر کو گڑیاں کھیلنے پڑیں تو عاشر کو بوریت سے بچانے کے لیے بیلا کو بیٹ پکڑنا پڑتا۔

”تم ٹھیک ٹھاک نکمی ہو‘ دیکھو ناشتے کے لیے بھابھی کو ان کے میکے سے لانا پڑا۔“ گویا وہ رات ہی آ گیا۔

”خیال سے‘ نکمے پن کا یہ طعنہ صرف مجھے نہیں‘ باقی سب گھر والوں کو بھی لگے گا۔“

”اوہو‘ بچی تو سیانی ہو گئی ہے۔“

”اب تم سیٹ خالی کرو‘ بچی نے بھی ناشتا کرنا ہے۔“

”ارے... ارے۔“ ایک ساتھ کئی آوازیں اس کی بد تہذیبی و بد تمیزی پر ابھریں‘ جبکہ وہ سعادت مندی سے اٹھا۔ ایک فوجی سلوٹ اسے پیش کیا اور جگہ خالی کر دی۔ وہ پوری تمکنت اور وقار کے ساتھ خالی جگہ بیٹھ گئی۔

”عاشر! اور لونا۔“

”نہیں بھابھی! بس کھا چکا۔“ وہ دروازے سے پلٹا پھر ذرا سا رکا‘ وہ اسی کی پلیٹ میں اسی کی چھوڑی ہوئی پوری کھا رہی تھی۔ وہ باہر نکل کر واش بیسن پر ہاتھ دھونے لگا۔ سنعیہ بھابھی ابرار کو کندھے سے لگائے گھوم رہی تھیں‘ وہ خواہ مخواہ ریں ریں کیے جا رہا تھا۔ اسے زیبا نے لے لیا تاکہ وہ بھی ڈھنگ سے ناشتا کر سکیں۔ سونیا نے چولہے بند کیے ٹرے میں بڑے اور چھوٹے ابو کے لیے چائے کے برتن رکھے‘ باہر نکلی تو فیضان آفس کے لیے جا رہے تھے۔

”ارے... آپ ناشتا تو کر لیں۔“

انہوں نے اک خفا سی نظر بیوی پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے گئے۔ سونیا اپنی جگہ حق دق رہ گئی۔ چھوٹی امی غالباً ”چائے“ ہی کے لیے کہنے آئی تھیں۔

”کیا ہوا؟“

”پتا نہیں۔“

”بغیر ناشتے کے چلا گیا؟“

سونیا نے گردن جھکا لی‘ آنکھیں خواہ مخواہ بھر آئیں۔ ابھی شادی کو کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ صاحب کے تیور بدلنے لگے۔

”بیوی ناشتا نہیں کرنا چاہتا تھا‘ تو تم پوچھ کر کچھ ہلکا پھلکا بنا دیتیں۔“

سونیا کیا پوچھتی‘ وہ تو اپنے ہاتھوں کا جادو دکھانے کو ایمان کے اٹھنے سے پہلے ہی کچن میں موجود تھی۔

”لاؤ مجھے ٹرے دو‘ تم بھی اچھی طرح ناشتا کرو‘ اس کی فکر نہ کرو‘ آفس میں کچھ کھا لے گا۔“

انہوں نے نرمی سے تسلی دی‘ تو وہ پلکیں جھپکاتی کچن میں آ گئی۔ جہاں سب ان کے ہاتھ کے ذائقے کے معترف ہو رہے تھے‘ اس کی آنکھ کی نمی خشک ہونے لگی۔

کھاتے کھاتے بیلا کا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے ذرا سا اچک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہیں زرد چنبیلی کے جھاڑ کے پاس وہ ہی سفید جھولا‘ جس کے جوڑ جوڑ میں زنگ کے بد نما داغ نمایاں ہونے لگے تھے۔ اب ہلتا تو کھائیں چرخ‘ چوں کی بد صورت آوازیں ابھرتیں۔

گل صنوبر سر جھکائے تکیے کے سفید غلاف پر گلاب کے پھول کاڑھ رہی تھی۔

اتنا انہماک‘ تسلسل اور روانی۔

مگر... یہ تسلسل اور روانی... خود ان کی اپنی زندگی میں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟

سوال کی سوئی ایک جگہ اٹک کر ذہن کی شفاف سطح پر ٹک ٹک کرنے لگی۔ اسے دیکھ کر بیلا کو ہمیشہ گھنے جنگل سے گزرتی ایسی ندی کا خیال آتا‘ جس پر سورج کی کرنوں نے کبھی قوس قزح نہ بکھیری ہو۔ جس کے وجود کو ہاتھی ڈباؤ لمبی گھاس نے ڈھانپ رکھا ہو‘ بیلا کو اس شدید ٹھہراؤ سے ڈر لگتا‘ کہیں یہ شفاف‘ اچھوتی‘ کنواری ندی‘ متعفن بدبودار دلدل میں نہ بدل جائے۔

بہتا پانی‘ ندی۔

کھڑا پانی‘ دلدل۔

وہ ٹرے اٹھا کر پچھلے دروازے سے باہر آ گئی۔

”میں ناشتا آپی کے ساتھ کروں گی۔“

اس کے بیٹھنے سے جھولا چرخ‘ چوں‘ چرخ چوں کرنے لگا‘ اس نے الٹی پالتی مار کر ٹرے درمیان میں رکھ لی۔ گل صنوبر نے فریم میں سوئی اٹکائی اور فریم کڑھائی والی چھوٹی سی بید کی ٹوکری میں رکھ دیا۔ اب وہ ہولے ہولے نوالے توڑنے لگی تھی۔ بیلا نے چور نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ارے...“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا‘ گل صنوبر نے چونک کر دیکھا۔ بیلا کی نظریں اس کے دوپٹے سے جھانکتے بالوں پر تھیں۔ جہاں سیاہی پر سفیدی غالب آ رہی تھی۔ اس نے ماتھے تک دوپٹہ کھینچ لیا۔ بیلا خاموشی سے اٹھ کر چائے لینے کچن میں چلی آئی۔ وہاں زیبا بکھرا سمیٹ رہی تھی۔ وہ ٹرے لے کر باہر آئی تو ٹھٹھک گئی۔

وہ زرد چنبیلی جیسی لڑکی وہاں کہیں نہ تھی۔ سفید جھولے کے عقب میں چنبیلی کے جھاڑ پر کوئی ایک پھول بھی نہ تھا۔ اسے لگا گل کا وجود اس جھاڑی میں ڈھل گیا ہے‘ جس پر خواہشوں کا کوئی پھول نہیں کھلتا۔

بیلا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں ناشتے کے بعد کی افراتفری تھی۔ گھر مختلف آوازوں سے گونج رہا تھا۔ افراہیم نفیس یعنی بڑے ابو چونکہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے‘ سو ان کے کمرے کا ٹی وی اک تواتر کے ساتھ خبریں سنا رہا تھا۔ کچن میں برتن دھلنے کی کھٹ پٹ‘ صحن میں شڑاپ شڑاپ کی آوازیں‘ اندر ہی کہیں واشنگ مشین کی گھوں گھوں‘ سب کمروں سے گندے کپڑے‘ چادریں اکٹھی کرتی زیبا کے چپلوں کی گھسٹ‘ گھسٹ عاشر نے دیکھا‘ ایک وہ ہی بیلا تھی‘ جو برآمدے میں کرسی پر براجمان اخبار دیکھ رہی تھی۔

”یہ ہفتہ کیسا رہے گا۔“

اس نے عقب میں کھڑے ہو کر با آواز بلند پڑھا۔ اس نے کھسیا کر اخبار لپیٹ دیا۔ ”تم لڑکیوں کو ان چیزوں میں کیا دلچسپی ہوتی ہے۔“

"دلچسپی کیا' میں تو یوں ہی دیکھ رہی تھی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"ایک پیالی اچھی سی چائے ملے گی۔"

"ابھی لیجیے۔" وہ کچن کی طرف چل دی۔ ایک چائے ہی تو اچھی بنانا آتی تھی' ورنہ ہنڈیا میں ابھی تک نمک' مرچ کا تناسب ٹھیک نہ ہو سکا' اور روٹی گول کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ چائے لے کر آئی تو عاشر کرسی پر بیٹھا آنکھیں موندے بڑے پر سکون انداز میں گنگنا رہا تھا۔

"تو ہی حقیقت خواب تو
دریا تو ہی پیاس تو
تو ہی دل کی بے قراری تو سکون
جاؤں...."

"چائے... تمہاری آواز ذرا بھی اچھی نہیں۔" کپ تھماتے ہوئے منہ بنا کر بتایا گیا۔

"اور تمہاری چائے۔" اس نے سپ لیتے ہوئے بدلا چکایا۔

"ارے... سنو بیلا... میں نے ایک بہت ہی عجیب خواب دیکھا۔" ناراضی سے پلٹتی بیلا کو روکنے کے لیے وہ تیزی سے بولا اور بیلا نہ صرف رک گئی' بلکہ اس کی طرف پلٹ بھی آئی کہ بچپن کی عادت تھی۔ وہ اپنے سارے خواب ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔

"اک بہت ہی خوب صورت وادی ہے۔" بیلا اس کے قریب موڑھا کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"بے حد سر سبز و شاداب' ڈھلانی چھتوں والے گھر جن کے کھلے دریچوں میں پھول ہی پھول ہیں۔ بے حد نیلا شفاف امبر' خوشبوؤں سے بوجھل ہوائیں' میں اک بڑے سے سفید پتھر پر کھڑا ہوں اور مجھے اپنا آپ اتنا سبک محسوس ہو رہا تھا' گویا میں ہوا میں تیرتا وہاں تک آیا ہوں' اسی پتھر کے پاس بہتی ندی کے کنارے اک لڑکی پھول چن رہی ہے۔ اس کے کندھوں تک کھلے بال بے حد سیاہ ہیں۔ اس کا نیلا آنچل بار' بار اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرا رہا ہے۔ پھر وہ آہستگی سے پلٹی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔"

"وہ کون تھی؟"

"افسوس.... تم۔" عاشر نے اس کی پر اشتیاق آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"ایں.... میں کیوں؟" وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

"یہ تو تم بتاؤ۔" وہ مزے سے چائے پینے لگا۔ "مسلو اس خواب کی تعبیر کیا ہو گی۔"

"عاشر! مجھے لگتا ہے عنقریب تمہارا ٹرانسفر کسی خوب صورت سی وادی میں ہونے والا ہے۔ پلیز مجھے ضرور ساتھ لے جانا.... تمہیں پتا ہے' مجھے خوب صورت وادیاں دیکھنے کا کتنا کریز ہے۔" وہ جوش سے گویا ہوئی.... پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "زیبا آپی کو بتاتی ہوں۔"

"ارے۔" مگر گرم گرم چائے اس کے ہونٹ جلا گئی مگر وہ لمحوں میں غائب ہو گئی تھی۔

"بے وقوف لڑکی' جو سمجھانا چاہتا ہوں' نہیں سمجھتی۔"

اور وہ بے وقوف لڑکی جب زور و شور سے زیبا کو عاشر کا خواب سنا رہی تھی تو آخری حصے میں تنہا عاشر کے ساتھ اتنی خوب صورت وادی میں موجود ہونا اچانک قابل اعتراض لگا' تو اپنی طرف سے زیبا آپی کا اضافہ خود ہی کر دیا۔

وہ ٹیرس کی ریلنگ پر جھکی نیچے زیبا سے باتیں کر رہی تھی' جب گیٹ کے اس پار ایک سیاہ لمبی سی گاڑی پانی کی طرح پھسلتی چلی آئی۔ اس کا لشکارا پورے منظر پر حاوی ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکا کر سیدھی کھڑی ہوئی اور اعلان کے انداز میں بولی۔

"لیڈی توصیف ہمدانی تشریف لا رہی ہیں۔"

زیبا نے آن واحد میں کپڑوں کا ڈھیر دونوں بازوؤں میں دبوچا اور غڑاپ سے اندر.... برآمدے کے تخت پر سبزی کاٹتی بڑی اماں نے ٹوکری پرے کھسکائی اور دوپٹے کے پلو سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ صاف کیے۔ چھوٹی امی مہمان کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھیں' جن کے ساتھ امارت کا مخصوص رعب و دبدبہ گھر میں گھستا چلا آیا اور فوراً" ہی بڑی اماں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بیلا

بغیر آستین بلاؤز والی ساڑھی میں لپٹا وجود حسن، تمکنت اور وقار کا مجموعہ تھا۔ انداز میں ٹھہراؤ اور ہونٹوں پر ایسی دلفریب مسکراہٹ جو دیکھنے والے کو مسحور کرنے کے ــ ساتھ ساتھ مرعوب بھی کردیتی تھی۔

یہ سونیا کی ممی تھیں۔ مسز منیبہ توصیف ہمدانی رسمی سی ملاقات کے بعد وہ سیدھی سونیا کے کمرے میں چلی گئیں اور بڑی اماں نے ملازم کے لڑکے کو بیکری دوڑا دیا۔ دنیا جہاں کے لوازمات، جن کے بارے میں سب جانتے تھے کہ ان میں سے صرف کولڈ ڈرنک کے ایک دو سپ لیے جائیں گے۔

تو پھر کیا ہوا!؟

آخر وہ اس گھر کی بہو کی ماں اور ان کی سمدھن تھیں۔

چھوٹی امی کے چہرے پر تفکر کی ہلکی سی لکیریں تھیں۔ انہوں نے سونیا کی آنکھوں کو سرخ دیکھا تھا اور ناشتے کے بعد سے وہ کمرے سے باہر بھی نہیں نکلی تھی۔ پون گھنٹے کے بعد جب ناشتے کے تمام لوازمات میں سے حسب توقع کولڈ ڈرنک کے چند سپ لینے کے ساتھ ہی وہ رخصت ہوئیں، انہوں نے اپنے اندر طمانیت کا احساس ابھرتے دیکھا تو حیرت سے خود سے سوال کیا۔

"کیا میں بھی ان سے مرعوب ہوں؟"

☼ ☼ ☼

عاشر نے کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا۔ یہ کھڑکی پچھلے صحن کی طرف کھلتی تھی اور اس میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ وہ وہیں جھولے کے پاس چوکی پر بیٹھی تھی اور گل صنوبر اس کے بالوں میں تیل کی مالش کررہی تھیں۔ نہ جانے کون سے قصے تھے، جو وہ اسے سنائے جارہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے حسب عادت اس کے دونوں ہاتھ متحرک تھے۔ لاکھ ٹوکنے کے باوجود وہ آدھی باتیں ہاتھوں کے اشارے سے کیا کرتی۔ عاشر ہمیشہ اسے چھیڑتا۔ "کیا انٹینا ہلائے بغیر تمہاری آواز صاف نہیں آتی۔"

تو کبھی کہتا۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو تو یہ بات کرنا ہی بھول جائے گی۔"

لڑکپن میں ایسی ہی باتوں پر ان کی لڑائی ہوجاتی تھی۔

عاشر نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، انگلیوں کی پوروں میں اس کی خواہش دبی تھی یا دل دھڑکتا تھا۔ اس نے ادھ کھلے گلاب کو لبوں سے چھولیا۔ اسے ابھی واپس جانا تھا اور وہ چاہتا تھا جانے سے پہلے اپنی اس لاپروا سی کزن کو بتائے، دن ہو یا رات، کوئی بھی موسم ہو کیسی بھی رت ہو، جانے انجانے، وہ اسی کو سوچنے لگا تھا۔ وہ چنبیلی کی خوشبو جیسی لڑکی کب اس کے حواسوں پر چھائی چلی گئی، خود عاشر کو بھی خبر نہ تھی، وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"کیا یہ محبت ہے؟"

اس نے کھڑکی بند کی اور خود اس کمرے میں آگیا، جو زیبا اور بیلا کا مشترکہ تھا۔ بیلا کی ساری کتابیں اک ترتیب سے الماری میں لگی تھی مگر اک کتاب بیڈ کی سائیڈ پر اوندھی پڑی تھی۔ عاشر نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھالی۔ پہلا صفحہ کھولا، اس پر بیلا کا نام جگمگا رہا تھا۔ یہ کتاب پچھلی برتھ ڈے پر اس کی کسی سہیلی نے گفٹ کی تھی۔ عاشر نے ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔

"خانہ بدوش۔" اک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

"میں بھی خانہ بدوش ہوں، مگر یہ خانہ بدوشی مجھے راس نہیں آئی اب کوئی ٹھکانا چاہتا ہوں۔"

اس نے وہ ادھ کھلا گلاب کتاب میں رکھا اور کتاب بند کرکے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کسی کی نظر اس کتاب پر پڑے۔

اور جب وہ اس کتاب کو تلاشے گی اور کھولے گی تو۔

اک خوش گوار سے تصور کے ساتھ وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼



زیبا کب سے نیٹ پر چیٹنگ میں مصروف تھی اور وہ موبائل پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ میسجنگ میں۔۔۔ پھر اکتا کر موبائل ایک طرف رکھ کر زیبا کو دیکھنے لگی، اس کے ہونٹوں پر پھیلی مدھر مسکان ان کہے افسانے سنا رہی تھی۔

"فہد بھائی ہیں؟"

"ہوں۔" زیبا کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"میرا بھی سلام لکھ دو۔"

"لکھ دیا۔" وہ بے توجہی سے بولی۔

"دو گھنٹے سے تم چیٹ کررہی ہو۔ آخر وہ کون سی باتیں ہیں، جو ختم ہی نہیں ہورہی ہیں۔" زیبا کے انداز سے وہ ذرا سی جیلس ہوئی۔

"تم ابھی بچی ہو۔"

"اور یہ فہد بھائی وہاں پڑھنے کا بہانا کرکے بیٹھے ہیں۔ سارا وقت تو تمہارے ساتھ باتوں میں گزر جاتا ہے۔"

"تم کیوں جیلس ہورہی ہو۔" وہ ہنسی۔

"میں کیوں جیلس ہوں گی، ایسی ہی بے تابی تھی تو تمہیں بھی ساتھ لے جاتے، نکاح تو ہوگیا تھا۔"

"سویٹی! یہ محبت کے معاملے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے، اس دوری میں بھی نزدیکیاں ہیں۔" اس نے غالباً "فہد کو گڈ نائٹ لکھ دیا تھا۔ تب ہی کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرکے کلینزر اٹھایا اور اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"اتنی فریش اسکن ہے، پھر بھی رگڑے لگاتی رہتی ہو۔"

"اسی لیے فریش ہے۔" وہ ہنسی، جب بھی اس کی فہد سے بات ہوتی، ہنسی بات بے بات لبوں سے پھوٹتی۔

"وہ واپس کب آئیں گے؟"

"اوائل سرما میں۔"

"پھر فوراً" تمہاری رخصتی ہوجائے گی۔" بیلا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"ظاہر ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ، کیا یہ ضروری ہے کہ جس بندے کے ساتھ شادی ہو، اس کے ساتھ محبت بھی ہوجائے۔" دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجاتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا، کیونکہ وہ جانتی تھی، اگرچہ فہد ان کا رشتے دار ہی تھا مگر زیبا اور اس کی بے تکلفی نکاح کے بعد ہی شروع ہوئی تھی۔ اب دونوں کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے سے بات کیے بنا نیند ہی نہ آتی۔

"اللہ تعالیٰ نے اس رشتے میں ایک قدرتی کشش رکھی ہے، بیلا ڈیئر۔"

"اگر تمہارا نکاح فہد کی جگہ کسی اور سے ہوتا، تب بھی تم اس سے ایسی ہی محبت کرتیں؟"

"اللہ نہ کرے، کیا بے تکے سوال کررہی ہو۔" زیبا نے دہل کر کہا اور کلینزر واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تم سچ مچ ان سے محبت کرنے لگی ہو؟" بیلا مسکرا دی۔

"اب لائٹ بند کردوں؟" اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"کردو، میں نہیں چاہتی تمہارے خواب ڈسٹرب ہوں، ویسے خواب سنسر پالیسی کو مدِ نظر رکھ کر دیکھتی ہونا؟" بیلا نے شرارت سے پوچھا۔

"ہمارے تو اب ڈراموں میں بھی کوئی سنسر پالیسی نہیں رہی، تم خوابوں کی بات کرتی ہو۔" زیبا نے لائٹ بند کی تو وہ بھی تکیہ کھینچ کر لیٹ گئی۔ تب ہی ہاتھ کتاب سے ٹکرایا۔ اس نے کروٹ بدلی اور کتاب کو اندھیرے میں شیلف میں گھسا دیا۔ کبھی کچھ باتیں ان کہی ہی رہ جاتی ہیں۔ گلاب کی خوشبو کتاب کے صفحوں میں مقید ہوکر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

زیبا کے لاکھ اکسانے کے باوجود وہ اس کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ جانے پر رضامند نہ ہوئی، جہاں زیبا مختلف قسم کے کورسز کرکے ٹائم پاس کررہی تھی۔

اسے تو گھر میں رہ کر سونیا بھابھی سے مختلف چائنیز، اٹالین اور انگلش کھانے پکانا سیکھنے تھے۔ گل آپی سے کشیدہ کاری سیکھنا تھی۔ اس کا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور اس کے اس فیصلے کو سب سے زیادہ عاشر نے سراہا۔ وہ جو اپنی سخت ترین روٹین میں بھی سوچتا، جب اس نے کتاب میں ادھ کھلا گلاب دیکھا ہوگا تو کیا سوچا ہوگا، اور فون پر اس کے لہجے میں کچھ الگ، کچھ ان کہی سی محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہاں تو وہ ہی لاپروائی اور ازلی بے نیازی تھی۔ بس جلدی جلدی باتیں کیں اور ریسیور پھوپھو کو تھما دیا۔ یہ تک نہ پوچھا کہ "عاشر! تم کب آؤ گے؟ یا ہم سب تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔" وہ خود ہی ان فقروں میں اپنے مطلب کی بات چن لیتا مگر بیلا کو تو سونیا بھابھی سے بریانی کی پوری ترکیب سیکھنا تھی۔

اور بریانی کا مسالہ تیار کرتے ہوئے دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی، کب گیٹ پر سیاہ گاڑی رکی، کس نے دروازہ کھولا اور کب مسز منیبہ توصیف ہمدانی ان کے سر پر آ کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی اور بڑی امی دونوں کسی کی عیادت کے لیے گئی تھیں۔

"مما۔" سونیا ٹھٹکی، پھر پذیرائی کو آگے بڑھی۔

"یہ اتار کر کمرے میں آؤ۔" ان کا اشارہ ایپرن کی طرف تھا۔ خود وہ تیزی سے پلٹ کر اس کے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ فضا میں کچھ لمحے ان کی ہیل کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔ پھر سونیا کو ہوش آیا۔ اس نے ایپرن اتارا۔ ہاتھ دھوئے اور ان کے پیچھے لپکی۔

"اب میں کیا کروں۔" بیلا نے اناڑی باورچی کی طرح اردگرد پھیلے سامان کو دیکھا۔ پھر خیال آیا۔ یوں ہاتھ لٹکانے سے کچھ نہ ہوگا۔ عزت مآب مہمان کی خاطرداری کرنا ہے اور گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں... منیبہ بھابھی بھی اپنے میکے گئی تھیں۔ اس نے فریزر سے کباب نکال کر باہر رکھے۔ خود کرسٹل کے نفیس گلاس میں کولڈ ڈرنک انڈیلی... مگر سونیا بھابھی کے کمرے میں داخل نہ ہو سکی کہ وہاں ماحول کچھ اور تھا۔

"یہ کمرے کی حالت کیا بنا رکھی ہے؟"

"مما! آج ملازمہ ابھی تک نہیں آئی تو۔" وہ گڑبڑا کر کمبل تہ کرنے لگی۔

"ملازمہ نہیں آئی یا تمہیں کچن سے فرصت نہیں ملی، اپنا حلیہ دیکھا تھا۔" وہ کسی انسپکشن آفیسر کی طرح ہر چیز کو جانچ رہی تھیں۔ سونیا نے کچھ جھنجلا کر کمبل چھوڑا۔

"کیا ہوا مما! سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔"

"تم نے فیضان سے بات کی؟"

"کس بارے میں۔" وہ لب بھینچے بیٹی کو گھورتی رہیں، سونیا بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"سونو! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" انہوں نے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "کیا تمہیں ابھی تک احساس نہیں ہوا کہ تم نے کیا کچھ کھویا ہے۔"

"نہیں... کیونکہ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ میں فیضان سے محبت کی ہے۔ اور اسے پانے کے لیے سب کچھ بھی کھونے کو تیار تھی اور جہاں تک بات ہے علیحدہ گھر میں شفٹ ہونے کی تو وہ مجھ پر یہ بات واضح کر چکے تھے کہ وہ ابھی علیحدہ نہیں ہو سکتے اور مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں، میں یہاں خوش ہوں، آپ بار بار ایک ہی بات دہرا کر مجھے ڈسٹرب مت کریں۔" سونیا کو لگا اسے ماں سے دوٹوک بات کرنا ہی ہوگی۔

"یہ گھر ہے؟"

"اب یہ ہی میرا گھر ہے۔" سونیا نے اعتماد سے جواب دیا۔ "یہاں کے لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں، مان دیتے ہیں اور میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

"نوکرانی بن کر رہ گئی ہو۔"

"اپنے گھر کا کام کرنے سے کون نوکر بنتا ہے۔"

"تمہیں تمہاری دادی نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ورنہ اس لوئر کلاس کے فیضان سے شادی نہ کرتیں۔"

"ٹھیک... لیکن یہ سب آپ کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا، جب مجھے دادی کے پاس چھوڑ کر فارن ٹور پر نکل گئی تھیں۔ بہرحال یہ لاحاصل بحث ہے۔ آپ

کولڈ ڈرنک لیں گی یا کافی؟"

تب ہی باہر کھڑی بیلا کو ہوش آیا تو وہ ہڑبڑا کر اندر داخل ہوئی۔ انہوں نے اک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔

"چلتی ہوں، لیکن زندگی میں جب کبھی اپنی حماقت کا احساس ہو، چلی آنا۔"

بیلا کی موجودگی سے سونیا خجل سی ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے اک بوجھل سی خاموشی چھوڑ گئی تھیں۔ بیلا نے سونیا کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، آؤ کچن دیکھیں۔"

"بھابھی! آپ یہاں خوش تو ہیں ناں؟" بیلا نے فکرمندی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہنس دی۔

"ہاں بھئی! اب یہ کولڈ ڈرنک تو بے کار گئی۔"

"ایسی بے کار چیز اب میرے پیٹ میں ہی جائے گی۔" بیلا نے بے چارگی سے کہا اور گلاس منہ کو لگا لیا۔

فرح اپنے میاں کے ساتھ اچانک ہی وارد ہوئی۔ اس کے میاں کو یہاں کچھ کام تھا اور انہیں ایک ہفتہ یہیں رکنا تھا۔ وہ صبح کا گیا شام کو آتا اور فرح سارا دن سسرال میں گزرے پچھلے ماہ کے شب و روز انداز بدل بدل کر سناتی، ہر روز رات کے کھانے کے بعد لاؤنج میں محفل جم جاتی۔ وہ تھی بھی بہت زندہ دل، اپنے قصوں میں کوئی نہ کوئی گیم نکال لیتی، منیبہ ابرار کو سلانے کے بہانے اٹھ جاتیں، گل صنوبر عشاء کے بعد نوافل اور تسبیحات میں مشغول ہو جاتیں، ایسے میں سونیا اپنی بامروت طبیعت کی بنا پر پھنس جاتی۔ فیضان بیڈ روم میں تنہا غصے میں کھولتے کروٹیں بدلتے رہتے اور جب تک سونیا اس سب سے جان چھڑا کر کمرے میں آتی، ان کا موڈ بگڑ چکا ہوتا یا وہ سو چکے ہوتے اور سونیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گھر اور شوہر کے درمیان توازن کیسے رکھے۔

"سونیا! فیضان کو دودھ کا گلاس دے دیا تھا۔" فیضان کو کچن میں جاتے دیکھ کر چھوٹی امی نے نرمی سے اسے ٹوکا، وہ سب کے ساتھ کیرم کی بازی جمائے بیٹھی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھی۔ بیلا کچن میں سب کے لیے چائے بنا رہی تھی اور فیضان فریج کھولے کھڑے تھے۔

"دودھ سادہ لو گے یا..." سونیا نے جلدی سے دودھ کا برتن نکالا مگر فیضان نے جھپٹ لیا۔

"خود ہی لے لوں گا۔"

ان کا لہجہ بے حد سرد اور سپاٹ تھا۔ سونیا کی رنگت متغیر ہو گئی۔ بیلا دانستہ رخ بدل کر مگ نکالنے لگی۔ فیضان نے دودھ گلاس میں نکالا، گلاس مائیکرو ویو میں رکھا، پھر اوولٹین کا ڈبہ نکالنے لگے۔ سونیا تیزی سے باہر نکل گئی۔

"کچھ گڑبڑ ہے۔" بیلا کو شدت سے احساس ہوا۔ چائے لے کر لاؤنج میں گئی تو سونیا اور فیضان دونوں ہی وہاں نہ تھے۔ وہ سونیا کا کپ لے کر دانستہ ان کے کمرے کی طرف آ گئی مگر وہاں بہت گہری چپ دروازے کے دوسری طرف سرسرا رہی تھی۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہی۔ دستک دے یا نہ دے، پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی مگر اس رات ماں کے پہلو میں دبک کر ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی۔

"ہاں، محسوس تو... میں نے بھی کیا ہے، دونوں کے درمیان کچھ فاصلے ہیں۔" ماں کے دوسری طرف لیٹی فرح اٹھ بیٹھی، وہ تو سن کر ہی پریشان ہو گئیں۔

"آپ کہیں تو میں بات کروں۔" فرح نے اپنی خدمات پیش کیں۔ شادی کے بعد وہ خود کو خاصا معتبر اور سیانا تصور کرنے لگی تھی۔

"نہیں، ابھی تو کچھ بھی واضح نہیں، میں دیکھ لوں گی۔" انہوں نے منع کر دیا اور اگلے چند دن جائزے کے بعد انہیں مسئلے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔

جو باتیں ابھی معمولی تھیں، آگے جا کر بگاڑ کا باعث بن سکتی تھیں۔ انہیں افسوس سا ہوا، کہیں نہ کہیں چوک ہو گئی تھی۔ گھر کا توازن گھر کے بڑوں کے ہاتھ ہوتا ہے اور یہاں توازن بگڑ رہا تھا۔ منیبہ اکثر ابرار

کے بہانے ادھر ادھر ہو کر ذمہ داری سے پلو بچا جاتی اور سونیا مروت میں بہت ذمہ داریاں خوامخواہ اپنے اوپر لیے بیٹھی تھی۔ اور وہ دونوں یعنی ثوبیہ اور ثمینہ گھر میں بہوئیں لا کر بے فکر ہو گئی تھیں۔ ثمینہ آپا کو بیرونی دوروں سے فرصت نہ تھی اور خود انہوں نے نہ جانے کب کے سنبھال کر رکھے شوق ابھی پورے کرنا تھے۔ ثمینہ آپا سے تو توقع ہی فضول تھی۔ وہ لاپروا خاتون تھیں اب جو کچھ کرنا تھا خود ان ہی کو کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فیضی! تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" کھلی کھڑکی سے آواز باہر کو لپکی، تو پچھلے برآمدے میں سب سے چھپ کر بیر کھاتی بیلا کے کان کھڑے ہو گئے۔

"مسئلہ... مجھے تو لگتا ہے ہمارے درمیان اب کچھ رہا ہی نہیں۔"

"جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

"واہ فیضان واہ... میں تمہاری خاطر کیا سے کیا ہو گئی اور تم۔"

"تم نے جو کچھ کیا اپنی خوشی سے کیا اب پچھتا رہی ہو تو۔"

"میں نہیں پچھتا رہی ہاں تم اور تمہارا رویہ ضرور پچھتانے پر مجبور کرے گا۔"

"اور تمہارا رویہ؟"

"کیا ہوا میرے رویے کو؟"

"تم بدل گئی ہو سونیا بیگم... مجھ سے کتراتی اور بھاگتی ہو۔ تمہارے پاس وقت ہی نہیں میرے پاس بیٹھنے اور بات کرنے کا۔ کیا ثابت کرنا چاہتی ہو یہ صبح سے شام تک کچن میں گھس کر کہ ہم لوگ بہت ظالم ہیں۔ روایتی لوگوں کی طرح ساری ذمہ داریاں تم پر لاد رکھی ہیں تمہارے..."

"خدا کے لیے فیضان اتنی بدگمانی کچھ تو خیال کرو میں دو، دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتی ہوں۔"

"کون سے محاذ کھولے ہیں اور آواز دھیمی کرو۔"

ساتھ ہی کھڑاک سے کھڑکی بند ہو گئی، وہ بگٹٹ ماں کی طرف بھاگی انہوں نے پہلے بیلا کو ہی لتاڑا۔

"یہ دروازے کے ساتھ لگ کر کن سوئیاں لینے کی عادت کہاں سے پڑ گئی تمہیں۔"

"میں تو پچھلے برآمدے میں بیٹھی تھی۔" اس نے احتجاجاً "پاؤں پٹخے۔

"ٹھیک ہے جاؤ، کچھ کرتی ہوں اور خبردار جو آئندہ ٹوہ لی۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے، ہونہہ! میں نہ بتاتی تو پتا کیسے چلتا، خود تو سارا دن کالج گرلز کی طرح نت نئی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں اور بڑی اماں.... انہیں سیاپوں سے فرصت نہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

اور رات فیضان کے ساتھ ثوبیہ بیگم کی طویل نشست ہوئی اور اگلے دن گھر کے کام تقسیم کر دیے گئے۔ جس پر سب سے زیادہ اعتراض سنیعہ بھابی کو تھا، جن کے ذمے رات کا کھانا لگا۔ "ابرار تنگ کرتا ہے اس کے سونے کا وقت..."

"بھئی، ابرار کو ہمیں دے جایا کرو، آخر اس کی دو، دو دادیاں موجود ہیں۔"

انہوں نے خوش مزاجی سے اعتراض ٹالا ورنہ بڑی اماں تو دو، چار سنانے کو پر تول رہی تھیں۔ آخر انہوں نے بھی چار، چار بچوں کے ساتھ کچن سنبھالا تھا۔ وہ ایک وقت کا کھانا نہیں بنا سکتی تھی۔ سونیا کے ذمے دوپہر کا کھانا تھا۔ اب وہ شام کو فری تھی۔ سو میاں کے ساتھ کہیں بھی سیر سپاٹے یا خاندان میں نکل سکتی تھی۔ زیبا کو شام کی چائے ملی، وہ سستا چھوٹ جانے پر خوش تھی۔ شامت بیلا کی آئی، جس کے ذمے صبح کا ناشتا تھا۔

"میں ہی کیوں؟"

"بعد میں سارا دن فارغ بھی تو ہو گی۔" بڑی اماں نے پچکارا۔

"ہاں، صبح صبح اٹھو، کسی کو پراٹھے چاہئیں تو کسی کو آملیٹ، کبھی بریڈ، تو کبھی فرائی انڈے، مجھ سے تو نہیں



اردی ٹوٹ جاتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم وہ ٹوٹا پھوٹا انڈا کھا لیں گے، ہمیں یقین ہے وہ ہمارے پیٹ میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں مچائے گا۔" زیبا نے ڈنڈیاں نکالتے ہوئے تسلی دی۔

"بڑے ابا چھ بجے بیڈ ٹی لیتے ہیں۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"اچھی بات ہے تمہاری فجر کی نماز نہیں چھوٹے گی جس کا آئے دن بہانا کرتی ہو۔"

"ہاں... تم تو پانچ وقت کی نمازن ہو۔" وہ لڑنے کو تیار ہوئی۔

"بیلا! مجھے لڑکیوں کا زیادہ بکواس کرنا پسند نہیں۔" امی نے "راجہ گدھ" سے نظریں ہٹا کر سکون سے کہا اور اس کی بولتی بند ہو گئی اور یوں اک بڑا مسئلہ ثوبیہ بیگم کی مداخلت اور بروقت اقدام سے خود بخود دب گیا۔

شام کو سونیا تیار ہو کر ان سے دعا لینے آئی تو انہوں نے اس کی نظر اتارتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

"میں جانتی ہوں، تم یہ سب اس گھر کو اپنا بنانے کے لیے کر رہی تھیں، لیکن سونیا! تمہاری سسرال روایتی سسرال نہیں ہے، جہاں جگہ بنانے کے لیے دن رات گھن چکر بننا پڑے۔ یہاں کے مکین ہر آنے والے کو بصد احترام اس کی جگہ دے دیتے ہیں، تم ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتی ہو، ہمیں بہت اچھا لگتا ہے، اور قدر بھی ہے۔ تم جو اتنی آسائشوں سے نکل کر یہاں ایڈجسٹ کر رہی ہو، لیکن ایک بات یاد رکھو، تمہاری اولین ذمہ داری تمہارا شوہر ہے، جس کے حوالے سے تم یہاں ہو، شوہر اور گھر میں توازن رکھنا سیکھ لو گی تو بہت خوش رہو گی۔"

"جی امی۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" فیضان کلائی پہ گھڑی باندھتا اندر آیا۔

"فیضی! آج میری بہو کو ڈنر باہر کروانا۔"

"امی! آپ کا بیٹا خاصا غریب ہے۔" اس نے دہائی دی۔

"ہاں... یہ غریب بیٹا مہینے میں ایک، دو ڈنر تو افورڈ کر سکتا ہے۔"

"بیلا! تم بھی چلو۔" سونیا نے مروتاً" کہا، وہ جو ابھی تک خاموشی سے سب سن رہی تھی۔ پرجوش ہو اٹھی، مگر اس کی ہاں ماں نے اپنے پیر سے دبائی تھی، وہ لبوں سے اٹھتی چیخ کو دباتی سابقہ پوزیشن میں بیٹھ گئی۔

"کیا تھا، جو میں چلی جاتی۔" دونوں کے جانے کے بعد وہ اپنا پیر سہلاتے ہوئے بولی۔

"کباب میں ہڈی والا محاورہ سنا ہے؟" ماں نے عینک کے پیچھے سے جھانکا۔ "شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ جایا کرنا۔"

"اچھا... جو میری ساس آپ جیسی دیالو نہ ہوئی تو، یا میری شادی ہی نہ ہوئی۔" وہ چمک کر بولی تو پاس ہی ابرار کے ساتھ مشغول ثمینہ تڑپ اٹھیں۔

"خدا نہ کرے، اللہ سب بچیوں کو اپنے گھر بار کا کرے، وہ ایک بدنصیب کافی نہیں۔" ان کی آواز بھرا سی گئی، بیلا نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔ وہ یقیناً "گل صنوبر کی بات کر رہی تھیں۔

"بڑی اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ گل آپی کی شادی بہت اچھی جگہ ہو گی۔" اس نے نادانستگی میں ان کے زخم چھیڑ ڈالے۔

"گل اتنی بخت آور ہوتی تو وہ اسے یوں ٹھکراتا؟" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔ اس سے قبل کہ بیلا کوئی سوال کرتی ماں نے ڈانٹ کر اٹھا دیا۔

"جاؤ، اپنی پھوپھو کو دیکھ آؤ، آج صبح سے نیچے نہیں آئیں۔"

وہ کچھ الجھتی اوپر گئی تو پھوپھو مزے سے خراٹے لے رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں واپس آ گئی۔

☼ ☼ ☼

فضا میں آتی بہار کی آہٹیں اور کلیوں کے چٹکنے کی صدائیں گھلی ملی تھیں۔ دھوپ چلچلاتی اور کمروں میں خوش گوار ٹھنڈک کا احساس، ایسی خوش گواریت، جس میں خوامخواہ آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

پھوپھو نیچے آئیں تو ساتھ ہی ذکی کے پاکستان آنے کی خبر بھی آ گئی۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے آنکھیں نم۔ اتنے سالوں کے بعد بیٹا پردیس سے آ رہا تھا۔

"میں تو سمجھی تھی اب جیتے جی اس کی شکل نہیں دیکھ پاؤں گی۔"

"ایسا کیوں کہتی ہیں کیا شائستہ بھی ساتھ آ رہی ہے۔" ثوبیہ بیگم نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تو اکیلا ہی آئے گا۔" ایسا کہتے ہوئے ان کے لہجے میں ہلکی سی یاسیت گھل گئی۔ بیٹے کی بے اولادی کا دکھ انہیں اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ ثمینہ خاموش سی تھیں۔ زیبا نے اس خبر کو نارمل ہی لیا جبکہ بیلا پرجوش تھی۔ وہ بچپن ہی سے ان سے بہت متاثر تھی۔

"گل آپی! آپ کو پتا ہے ذکی بھائی آ رہے ہیں۔" انہیں اطلاع دینے والی بیلا ہی تھی۔ وہ کچھ لمحے ساکت سی رہ گئی۔ دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے دوپٹہ سر پر پھیلاتے ہوئے سوچا۔

"میں جانتی تھی تم اسی موسم میں لوٹ کر آؤ گے۔"

☼ ☼ ☼

"تم نے خانہ بدوش پڑھ لی۔"

وہ دونوں آج بھی اس گھر کے ننھے بچے تھے، جو سب کی نظر بچا کر پچھلے برآمدے میں ایک دوسرے سے زمانے بھر کی شکایتیں لگانے اکٹھے ہوئے تھے۔ سامنے جھولے پر صنوبر کا سامان بکھرا تھا اور کچن میں ہوتی کھٹ پٹ بتاتی تھی کہ صنوبر وہیں ہے۔

"مجھے سفرنامے اچھے نہیں لگتے۔ اچھا بھلا اپنا گھر چھوڑ کر مارے مارے پھرتے رہو۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ چائے کا کپ اپنے اور اس کے درمیان رکھ لیا۔

اوپر کی منزل پر نیا رنگ روغن کروایا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بڑی اماں کی بڑبڑاہٹیں اور غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ خوامخواہ سب سے الجھنے لگتیں۔ ثوبیہ بیگم چپکے چپکے انہیں کچھ سمجھاتی رہتیں اور جب وہ اکتاتیں تو خاندان کے دورے پر نکل جاتیں۔

"اچھا۔" عاشر کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی در آئی۔ اس نے گردن موڑ کر سبز کپڑوں میں ملبوس لاپروا سی لڑکی کو دیکھا، جو اس سے دنیا جہاں کی باتیں کر جاتی تھی مگر وہ اس سے اپنے جذبات، ایک نئے اور اچھوتے احساس کو بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے بیلا کا رکھا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

"اوں ہوں... میری جھوٹی کیوں پی رہے ہو، میں اور لا دیتی ہوں۔"

"بچپن سے لے کر آج تک ہم نے ایک دوسرے کی ہر چیز شیئر کی ہے، خواہ وہ لسی کا ایک گلاس ہی کیوں نہ ہو، پھر آج یہ احساس کیوں؟" اس نے کپ نہیں رکھا۔

"امی کہتی ہیں اب تم بڑی ہو گئی ہو۔"

"ہاں... وہ تو ہے۔" عاشر نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ اب وہ اس کے سامنے دوپٹہ خوب پھیلا کر اوڑھتی تھی۔

"دیکھو عاشر! نئی کلیاں چٹکنے لگی ہیں۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔" اس کا لہجہ و انداز دونوں ہی بدلے۔

"پھر سفید اور پیلی تتلیاں آئیں گی، یاد ہے تم مجھے تتلیاں پکڑ کر دیا کرتے تھے۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔" بیلا نے مشکوک نگاہوں سے دیکھا تو وہ سنبھل گیا۔

"اچھا عاشر! ذکی بھائی سے ایک موبائل کی فرمائش ہی کر دو۔"

"کیوں، میرے پاس تو آل ریڈی ہے۔"

"بدھو، میرے لیے۔"

"آئندہ مجھ سے اس ٹون میں بات مت کرنا ورنہ..." اس کا بدھو کہنا بہت برا لگا تھا۔

"سوری کہہ دو گے نا؟"

"دیکھوں گا۔"



"گھر میں سب کے پاس ہے۔"

"سب کو ضرورت ہے۔" اس نے چائے ختم کی۔

"زیبا کو کیا ضرورت ہے، سوائے سارا دن اپنے منگیتر کے ساتھ باتیں کرنے کے۔"

"تو تمہیں کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"تو میں بھی تو..." کچھ کہتے کہتے زبان لبوں تلے دبالی۔ عاشر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"واہ... منگنی ہوئی نہیں اور موبائل پہلے سے ارینج کیا جا رہا ہے۔"

بیلا نے غصے و خجالت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کپ اس کے ہاتھ سے جھپٹا تو عاشر نے اس کا ہاتھ تھام لیا، پھر بچوں کی طرح پچکار کر بولا۔

"اچھا، وعدہ تمہیں موبائل میں گفٹ کروں گا۔"

"ہونہہ! مجھے نہیں چاہیے۔" وہ ہاتھ چھڑا کر پچھلے دروازے سے کچن میں چلی گئی۔ عاشر نے دونوں ہاتھ عقب میں رکھے اور پاؤں پھیلاتے ہوئے گنگنانے لگا۔

تو ہی حقیقت، خواب تو

☼ ☼ ☼

ادھ کھلی چاندنی، خاموش فضا، ہوا چنبیلی کے جھاڑ میں پتے اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کی ہلکی سی کروٹ پر پھول اوڑھے سفید تتلیاں کسمساتیں، ہلکے سے پھڑپھڑاتیں اور پھر سے محو خواب ہو جاتیں۔

"کیا تتلیاں بھی رات کو نیند اوڑھتی ہیں۔"

اس نے اک بے تکے سے خیال کے ساتھ اپنی سوچ کے زاویوں کو بھٹکانا چاہا۔

"کیا ان کی آنکھیں بھی خواب دیکھتی ہیں۔"

ہلکی سی جنبش سے جھولا چرخ چوں، چوں کرنے لگا تو وہ اپنے ہی خیالوں سے چونکی اور گڑبڑا گئی، سوال ہی ایسا تھا۔

"تمہاری نیندوں نے پہلی بار خواب کا ذائقہ کب چکھا۔"

پہلی اور آخری بار؟

اس نے ادھر ادھر دیکھا، ریشمی سفید دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ اسے لگا وہ اپنے ہی سامنے بے نقاب ہو گئی ہے۔ اپنی دانست میں دھیان کے طاقچے میں سارے چراغ بجھائے بیٹھی تھی تو آج یہ ہلکی سی روشنی کیوں؟

یہ کس نے بے خواب اندھیاری راتوں کی دہلیز پر دھرا، بجھا دیا، پھر سے جلا دیا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ وہ سب کچھ بھول گئی، مگر سرہانے رکھے یادوں کے گلاب اب بھی ترو تازہ تھے۔ پہلا خواب، یہیں اسی آنگن میں جب لیموں کے سفید پھولوں پر پیلی تتلیاں منڈلاتی تھیں اور زرد چنبیلی اپنے جوبن پر تھی۔ دا جی نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اعلان کیا تھا۔

"یہ میرے ذکی کی دلہن بنے گی۔"

تب پہلی بار معصوم ہاتھوں نے گڑیا کو دلہن بناتے بناتے ٹیکا اپنے ماتھے پر سجا کر دیکھا اور شرما گئی تھی، زیست کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ، اس نے خود کو ذکی کی امانت سمجھا اور جب وقت آیا تو وہ سرے سے انکاری تھا۔ اک اضطرابی لہر اٹھی اور دوپٹہ کندھے سے پھسل کر گود میں آ گرا۔ اس نے گھبرا کر ننگے پاؤں نیچے رکھے، وہاں اس کے ادھورے خواب کی کرچیاں بکھری تھیں۔ وہ چاہتی تو بھی خود کو لہولہان ہونے سے بچا نہ پاتی اور یہاں تو زخم بھی عزیز تھے۔ اس نے کس حوصلے سے اپنے محبوب کو رخصت کیا۔

تم جاؤ
سمندر، سمندر اپنی پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں اترو
جس دل میں ڈوبو
میری تنہائی تمہیں آواز نہ دے گی

اور اس نے آج تک اسے کبھی نہیں پکارا۔ کبھی اپنی راکھ ہوتی جوانی کا حساب نہ مانگا کہ حساب کتاب تو برابری میں ہوتا ہے۔ وہ تو در پر بیٹھی سوالی تھی، جسے چاہو تو چند سکے دان کر دو، چاہو تو دھتکار دو... اور وہ دھتکار دی گئی تھی، اس کا کشکول خالی کا خالی رہا۔

"کہاں میں اور کہاں وہ۔ ایف، اے پاس

بے وقوف سی لڑکی کیا میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہے؟ یوں بھی میں اس بچپن کی منگنی و نگنی کو نہیں مانتا۔ میں شائستہ سے شادی کر رہا ہوں اور بس۔"

اور اس ایف۔ اے پاس بے وقوف لڑکی نے یہ سب کس صبر اور حوصلے سے سنا' بنا آنکھ سے آنسو بہائے۔ محبت کی کتاب بند کر کے سنبھال کر دل کے طاق میں سجائی اور خود رب سے لو لگالی۔ حال دل محرم راز جان سکتا ہے اور رب سے بڑا محرم کون ہو سکتا تھا' لیکن آج لگا وہ تو صدیوں سے خود کو اور رب کو دھوکا دیتی آئی ہے۔ یا شاید صرف خود کو کہ رب کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ وہ تو اک ایسی ماں کی طرح جو بچے کی ہر غلطی اور نقصان کو جانتے بوجھتے انجان بننے کا کھیل کھیلتی' اپنے دامن میں سمیٹ کر تھپکنے لگتی ہے' وہ بھی شفقت سے اسے اپنی پناہ میں لے کر مسکراتا رہا تھا۔

اسے ایک دم بے پناہ رائیگانی کے احساس نے نڈھال کر دیا تو گھٹنوں میں سر چھپا کر بے آواز سسکتی چلی گئی۔

"تو نے مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ ورنہ وہ آج بھی میرے اندر کیوں بستا؟ یا میرے اندر ہی خلوص نہ تھا۔ میرے سجدے ہی بے کار تھے۔ مجھے اپنا بنا لے یا اسے مجھے بخش دے کہ میں دو کشتیوں میں سوار نہیں ہو سکتی۔"

وہ آپ ہی اپنی دعا پر ٹھٹک گئی۔ گزرے ماہ و سال میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا کہ اس نے رب سے ذکی کو مانگا ہو۔

یا شاید ہر لمحہ مانگا ہی اسی کو تھا۔

دل کا چور آج آنگن میں دندناتا پھر رہا تھا۔

ادھ کھلی چاندنی میں تیز ہوتی کال بیل نے سوئے ہوئے مکینوں کو ہڑبڑا دیا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ دوپٹہ اس کے پیروں میں آ گرا تھا۔

☆ ☆ ☆

"گڈ مارننگ بے بی۔"

وہ بڑی سرعت سے آملیٹ بنا بنا کر بڑی سی پلیٹ میں رکھ رہی تھی' جب عقب میں آواز سن کر پلٹی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ایک ہاتھ میں سگار دبائے فریش موڈ کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

"گڈ مارننگ۔" وہ مسکرائی۔ وہ آج بھی ویسے کے ویسے تھے شاندار' اور چھا جانے والے۔

"اس گھر میں پہلی صبح آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔" وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

"اوہ تھینک یو لیڈی۔" انہوں نے سر کو ہلکے سے خم کیا۔

"ناشتے میں کیا لیں گے؟ یہ آپ اتنی صبح کیسے اٹھ گئے؟"

"رات بھر نیند ہی نہیں آئی' کافی ملے گی؟"

"ٹائمنگ کا فرق ہے نا۔" اس نے آخری آملیٹ پلیٹ میں نکالا اور کیبنٹ کھول کر کافی کے لوازمات نکالنے لگی۔

"تم اپنا کام سمیٹو' میں بنا لیتا ہوں۔"

"میں بنا دیتی ہوں۔" وہ جانتی تھی اگر کسی نے ذکی کو یوں پہلی صبح کچن میں کام کرتے دیکھ لیا تو اس کی خیر نہیں' پھوہڑپن کی مہر لگ جائے گی۔

"مجھے کافی صرف اپنے ہاتھ کی اچھی لگتی ہے۔" ذکی نے مگ اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا اور پوچھنے لگے۔

"باقی لوگ اٹھے نہیں۔"

"اس گھر میں اگر کوئی کام کی بندی ہے تو وہ میں ہوں۔" اس نے فخر سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اب یہ ہی دیکھ لیں۔ صبح نماز کے فوراً بعد سب کو بیڈ ٹی پہنچانا میرا کام ہے' ناشتے کے اتنے ڈھیر سارے لوازمات بنانا کسی اور کے بس کی بات کہاں۔ اور۔۔۔"

وہ آملیٹ کے بعد اب دلیہ بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بات کرنے کے انداز میں بلا کی روانی اور بے ساختگی تھی۔ اک نپے تلے ماحول سے نکل کر یہ خالص پن اور جوش بڑے عرصے کے بعد نصیب ہوا تھا۔

وہ گھونٹ گھونٹ کافی پیتے دلچسپی سے سنتے رہے۔ اسے بولنے کا شوق تھا اور کافی ختم ہونے تک ذکی کو خاندان کے بارے میں وہ ساری معلومات مل گئیں جو آج تک فون پر نہ مل سکی تھیں۔

"یہ کس کے لیے؟" اس نے ٹرے میں صرف دلیہ اور دودھ پتی کا مگ رکھا تھا۔

"گل آپی کے لیے۔ انہیں رات سے بہت تیز بخار ہے' دوا کھلانا ہے۔"

"سنو! یہ بڑی اماں نے تمہاری گل آپی کی شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟" بڑی سرعت سے سوال کیا گیا۔

بیلا نے ایک لمحے غور کیا' پھر لاعلمی سے کندھے اچکا دیے اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی جبکہ وہ خالی مگ سنک میں رکھتے کچن کے اس دروازے پر آ گئے' جو پچھلی طرف کھلتا تھا۔ لیموں کی ہلکی ترش مہک لیے سپید کلیاں' انار کے نارنجی پھول اور زرد چنبیلی۔ ہوا تیز تھی اور نیچے ان پھولوں کا ایک فرش سا بچھا تھا اور وہ جھولا' جس کی ہر ہر کڑی کو زنگ کھانے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس جھولے کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان کے اردگرد ان کا بچپن کھیلنے لگا۔ انہیں ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ بیمار گل کی مزاج پرسی ہی کر آئیں۔ یہاں تک کہ فیضان انہیں ناشتے کے لیے بلانے آ گئے۔

☆ ☆ ☆

اگلے کچھ دن خاصے ہنگامہ خیز رہے۔ ذکی کی وجہ سے نت نئے پروگرام بنتے۔ انواع و اقسام کے کھانے بنتے۔ وہ سب کے لیے مختلف تحائف بھی لائے تھے۔ ایک عدد شاندار موبائل بھی۔ مگر وہ سیل فون عاشر کے لیے تھا' جو بھائی کی آمد کا سن کر محض دو گھنٹے کی چھٹی لے سکا تھا۔ وہ بیلا کو ڈھونڈتا بڑی امی کے کمرے میں آیا۔ وہ گل کا سر دبا رہی تھی۔ عاشر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ بظاہر لاپروا نظر آنے والی لڑکی سب کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ وہ دوسری طرف بیٹھ کر گل کی خیریت پوچھتا' کن اکھیوں سے بیلا کا پھولا ہوا منہ دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا' بیلا یوں ہی ناراض تھی۔ آخر اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"یہ تم نے ناراض بلی جیسا منہ کیوں بنایا ہے؟"

بیلا نے غصے سے اسے گھورا۔ "تم چیٹو ہو۔"

"میں نے کسے چیٹ کیا ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"تم نے ذکی بھائی سے سیل فون کی فرمائش کی مگر اپنے لیے۔ تم کتنے خود غرض ہو۔" وہ غصے سے بول رہی تھی اور عاشر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

گل صنوبر نے دونوں کو ایک نظر دیکھا۔ پھر لاتعلقی سے چادر منہ تک کھینچ لی' عاشر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور ذرا آگے کو جھکتے ہوئے اس کی گود میں ڈال دیا۔ بیلا نے تحیر سے موبائل کو' پھر اسے دیکھا۔

"ہاں' تم رکھ لو۔"

"نہیں' میں نہیں رکھ سکتی۔"

"رکھ لو' تمہیں اپنے منگیتر کے ساتھ لمبی لمبی باتیں نہیں کرنا کیا؟"

"بدتمیز' مذاق اڑاتے ہو' میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔" وہ موبائل کو الٹ پلٹ رہی تھی' پھر مایوسی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔ میرے پاس کسی نے نہیں چھوڑنا۔ کوئی نہ کوئی لے لے گا۔"

"اوہ۔ تو پھر تم اپنے فیانسی سے باتیں کیسے کرو گی؟" وہ مصنوعی فکر مندی سے کہنے لگا۔

"تمہیں میرے فیانسی کی اتنی فکر ہے تو اپنا پرانا موبائل مجھے دے دو' یہ تم رکھ لو۔" اس نے آرام سے حل نکالا۔

"واقعی۔"

"ہاں۔۔۔" کسی کو اعتراض بھی نہ ہو گا۔ میں کہوں گی' عاشر کے پاس فالتو رکھا تھا' اس نے مجھے دے دیا۔" وہ خوش ہو کر بولی تو عاشر اک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"میں تمہیں فالتو چیز نہیں دینا چاہتا دوست۔ پر اس وقت یہ ہی مناسب ہے۔"

شام کو وہ عاشر کے پرانے موبائل میں نئی سم ڈالے

اتراتی پھر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"جب سے گل کا بخار اترا ہے' بالکل ہی خاموش ہو گئی ہے۔" تائی اماں فکر مندی سے کہہ رہی تھیں' وہ جو تیل کی شیشی اٹھائے بال بکھرائے چلی آ رہی تھی' فوراً" ہی بول اٹھی۔

"وہ تو ہمیشہ ہی کم بولتی ہیں' تیل لگا دیں۔" اس نے ماں کی طرف شیشی بڑھائی۔

انہوں نے "خاکم بدہن" سے نظریں اٹھا کر پہلے آپا کو ایک "ہوں" سے نوازا' پھر اسے حکم دیا۔

"گل سے لگوالو۔"

"آپ کا صبح پرچہ ہے؟" وہ چڑ کر بولی' تو انہوں نے گھور کے اسے دیکھا۔

"ساری عمر لگا دی' اس گھر کو سنبھالنے' مہمان داری اور تم لوگوں کو پالنے پوسنے میں' تمہارے اسکولوں' کالجوں کے مسئلوں سے نمٹتے نمٹتے اس عمر میں اپنے شوق کی تسکین کرنے لگی ہوں تو بیٹی کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

"اچھا... تائی امی! آپ تو خیر' ساری زندگی عیش ہی کرتی رہیں۔"

وہ ابھی تک گل کی چپ میں الجھی تھیں' سو جواب نہ دیا' البتہ ماں کی اک تنبیہہ بھری نگاہ نے وہاں سے کھسکنے پر مجبور کر دیا۔ گل ہاتھ میں فریم لیے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بیلا نے محسوس کیا' وہ گل سے اسی ایک پھول پر اٹکی تھیں۔

"گل آپی! کیا ہوا ٹانکا بھول گیا۔" وہ جان بوجھ کر زور سے بولی تو گل چونک گئی' پھر سر جھکا کر پھول کو گھورنے لگی۔

(دھیان کا ایک ٹانکا بھی غلط لگ جائے تو جذبوں کے پھول بے وقعت سے لگنے لگتے ہیں۔)

"کتنا خوب صورت دوپٹہ ہے نا۔" بیلا نے شیشی ایک طرف رکھی اور اس کا دوسرا پلو اٹھا کر دیکھنے لگی' جو مکمل ہو چکا تھا۔ وہ یہ دوپٹہ زیبا کے جہیز کے لیے بنا رہی تھیں۔

"ایسا ایک دوپٹہ اپنے جہیز کے لیے بھی کاڑھیں۔" اس نے عجیب سی فرمائش کی۔

"سرخ دوپٹے ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتے بیلا! تمہارے لیے بنا دوں گی۔"

"خوامخواہ۔" بیلا نے چمک کر کہا اور پھر اک عجیب سی حرکت کی۔ وہ سرخ دوپٹے کا پلو ان کے سر پر ڈال چکی تھی۔

"ارے واہ! آپ تو بنا سنگھار کے بھی دلہن لگتی ہیں۔" وہ کھلکھلائی۔

گل اپنی جگہ ششدر سی رہ گئی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا' پھر چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ سیڑھیوں کے کنارے ذکی کھڑے ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

سادی نے اپنی چنری رنگ ساز کی گود میں پھینکی اور کہنے لگی۔

رنگ ساز میری چنری سرخ رنگ نہ رنگنا کہ سرخ ملن کا رنگ۔

اور میرا پریتم سمندر پار ہے۔

اے رنگ ساز! میری چنری لاجوردی نہ رنگنا کہ لاجورد امید کا رنگ۔

اور میرے ساجن نے نہ لوٹنے کی قسم کھائی ہے۔

ہاں! اسے سرمئی رنگ دے کہ سرمئی ہجر کا رنگ۔

اور یہ ہی میرا سنگھار ہے۔

"دیکھا' ذکی بھائی! گل آپی کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔"

"کیسی ہو گل! تمہارا بخار اتر گیا؟" وہ عام سے لہجے میں کہتے قریب آئے۔

سرخ آنچل ڈھلک کر گل کی گود میں آ گرا' وہ گھبرا کر اپنا سرمئی دوپٹہ ٹھیک کرتی منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

"ٹھیک ہوں۔" پھر تیزی سے اٹھ کے کچن میں چلی گئی۔

"یہ تمہاری گل آپی کچھ بدل نہیں گئیں۔" انہوں نے وہ ہی دوپٹہ ہاتھ میں لے کر ادھورے پھول کی خالی پتی پر انگلی پھیری۔

"نہیں' بچپن سے ایسی ہی ہیں۔"

"کس کے بچپن سے....."

"میرے بچپن سے۔" وہ ہنس دی۔

"اچھا... تم بھی بچپن سے ایسی ہو۔" انہوں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

"میں بچپن میں خاصی شریف ہوا کرتی تھی۔"

"اچھا' تو اب؟"

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

کچن میں کانچ کا گلاس گل کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کو سفیان اور فیضان نے ذکی کو گھیر لیا۔

"سچ سچ بتاؤ' شائستہ نے تمہیں پاکستان آنے کی اجازت کیسے دے دی؟"

"مجھے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں۔"

"جانے دو' خوب جانتے ہیں تم کتنے پانی میں ہو۔"

"بھئی' یہاں میری ماں ہے' تم لوگ ہو' میں کبھی بھی آسکتا ہوں۔"

وہ اطمینان سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے' جو ابھی ابھی بیلا دے کر گئی تھی۔ اس کا ارادہ تو بیٹھنے کا تھا مگر فیضان کی گھوری نے اٹھنے پر مجبور کر دیا مگر دروازے سے کان لگانے پر اسے کون روک سکتا تھا۔ موضوع ہی ایسا تھا۔

"ماں ہمیشہ سے یہیں ہے اور میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں' شروع سے خودغرض واقع ہوئے ہو۔ سچ بتاؤ' ماں سے کون سا کام آن پڑا؟" فیضان نے صاف صاف جتا دیا۔ مزید لقمہ سفیان نے دے دیا۔

"ہاں... شائستہ بھی اسی کی کاپی ہے' بنا مطلب کسی سے ہاتھ ملانے کی روادار نہ ہوتی تھی۔"

"یار! تم لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔"

"تم سچ اگل دو۔"

ذکی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا' پھر اک طویل سانس لے کر مگ رکھ دیا۔ گویا اب فرار ممکن نہ تھا۔

"دوسری شادی کرنے آیا ہوں۔"

دونوں نے تحیر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیلا نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ کر باہر نکلتی آواز کا گلا گھونٹا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ شائستہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔" اس نے انکشاف کیا۔

"مگر میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے' ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔"

"سب کچھ کر چکے ہیں۔" ذکی نے تحمل سے بات قطع کی۔ "مگر کچھ ایسی کمپلیکشنز ہیں کہ کچھ بھی ممکن نہیں۔"

"تو کوئی بے بی اڈاپٹ کر لو۔" کچھ دیر کے بعد سفیان نے مشورہ دیا۔

"وہ میرا خون ہوگا؟" ذکی نے پوچھا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"شائستہ جانتی ہے؟"

"ہوں... اس کی اجازت کے بغیر ممکن ہی کہاں ہے۔"

کچھ لمحے خاموشی سی چھائی رہی' گویا ہر کوئی اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کر رہا تھا' پھر سفیان نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے' پھر یہ ہی مناسب ہے' پھر تم دو بیویاں افورڈ بھی کر سکتے ہو' ڈھونڈ و کوئی اچھی سی لڑکی۔"

بلی تھیلے سے باہر آ چکی تھی اور بیلا کے ہاتھ اک گرما گرم خبر' وہ بگٹٹ بھاگ لی۔

کچن میں تائی کڑھی بنا رہی تھیں۔ اماں حسب معمول اپنے کمرے میں' نماز میں مصروف۔ بیلا کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ماں نے نماز ختم کی تو پہلا سوال کیا۔

"نماز پڑھ لی؟"

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

"پھاپھا کٹنیوں کی طرح کن سوئیاں لینے سے

فرصت ملے تو نماز کا خیال آئے۔"

"اف۔۔۔ پھاپھا کٹنی تو نہ کہیں۔" وہ تڑپ اٹھی۔ "اگر میں نہ ہوں تو آپ لوگوں کو خبر بھی نہ ہو کہ گھر میں ہو کیا رہا ہے؟"

"آج ہماری بیٹی کے پاس کون سی خبر ہے۔" تائی امی دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی آگئیں۔

"اسے اتنی شہ مت دیں، یہ حرکتیں اچھی نہیں، سسرال میں۔۔۔"

"آنے والے ہر خطرے کے لیے تیار رہوں گی۔" بیلا نے فخر و لاپروائی سے جملہ مکمل کیا، پھر تائی کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔

"پتا ہے ذکی بھیا پاکستان کیوں آئے ہیں۔"

"اللہ جانے، یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آبیٹھا ہے گویا واپسی کا ارادہ ہی نہیں۔" تائی کے لہجے میں بے زاری تھی۔

"دوسری شادی کے لیے۔" اس نے دھماکے کے ساتھ پوری تفصیل سنائی۔

دونوں خواتین گم صم ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ پھر امی نے سنبھل کر بیٹی کو دیکھا اور آہستگی سے کہنے لگی۔

"بیلا! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، پڑھ لو۔"

وہ یہ روکھا پھیکا رد عمل دیکھ کر بد مزا ہوتی وضو کے لیے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

کون سی رت تیرے نام لکھوں
جنوری کی صبح روشن کہ فروری کا ابھرتا جوبن
مارچ کھلا کھلا سا کہ اپریل ڈھلا ڈھلا سا
مئی کی اگتی ہوئی دھوپ کہ جون کا چبھتا ہوا سکوت
جولائی کا سر چڑھتا ہوا سورج کہ
اگست میں غلامی کا ڈھلتا ہوا سورج
ستمبر میں جنم لیتی کوئی خواہش کہ
اکتوبر میں پیار کی بارش
نومبر کی ساری رعنائیاں کہ دسمبر کی تنہائیاں
کون سی رت تیرے نام لکھوں

وہ آرام سے بیڈ پر دراز اپنی فرینڈ ارم کے میسج پڑھ رہی تھی، اک انجان نمبر سے ایسا میسج پڑھ کر چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"ارے۔۔۔ دیکھو زیبا۔" اس نے کمپیوٹر پر مصروف زیبا کے آنکھوں کے سامنے موبائل لہرایا۔

زیبا نے اک سرسری نگاہ ڈالی۔

"ایسے میسج آتے ہی رہتے ہیں۔"

"کوئی بنا جانے خوامخواہ بھیج دیتا ہے، خواہ فون کسی دادی اماں کا ہو؟"

زیبا مصروف ہو چکی تھی مگر وہ پہلا پیغام نہ تھا۔ ہر صبح گڈ مارننگ اور ہر رات گڈ نائٹ کہنا نہ بھولتا اور پیغام بھی اتنے خوب صورت، اچھوتے اور رومینٹک، ایک دن تنگ آکر بیلا نے جواب دیا۔

"میں دادی ہوں۔"

"کس کی؟" جواباً دریافت کیا گیا۔

"ظاہر ہے اپنے پوتے پوتیوں کی۔"

"ماشاء اللہ! ویسے خاصی ایجوکیٹڈ دادی ہیں، کھٹ کھٹ جواب لکھ رہی ہیں۔" بیلا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ذرا ٹھہر کر لکھا۔

"ہاں اچھے وقتوں میں میٹرک کیا تھا۔"

"وہ تب ہی، ورنہ ہمارے ابا کو تو سیل پر ایک لفظ لکھنا نہیں آتا۔"

"تو ابا کو پڑھا لیتا تھا۔" اس نے چڑ کر لکھا اور موبائل سرہانے ڈال دیا۔ وہ بہت دیر تک بیل دیتا رہا۔ بیلا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بات شروع ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اس نے چور نظروں سے زیبا کو دیکھا اور موبائل آف کر دیا۔ جس کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا کہ نماز قضا ہوئی۔ بڑے ابا کو چائے نہ ملی۔ ابو کے لیے ناشتا امی کو بنانا پڑا اور ذکی کے سامنے اچھی خاصی جھاڑ الگ پڑی۔

"تم کیوں منہ پھلائے بیٹھی ہو۔" ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے ذکی تیار شیار باہر نکلے، اسے دیکھا تو رک گئے۔

"اس گھر میں میری کوئی قدر نہیں۔"

"ارے بھئی ہم جو ہیں اس شہزادی کے قدردان، چلو آئس کریم کھلا لاؤں۔" وہ وہیں بیٹھی رہی۔

"کم آن بے بی۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا، پھر چونک کر اس کا ہاتھ دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟"

"تمہارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔" انہوں نے دوسرا ہاتھ تھامنا چاہا، مگر بیلا نے جھینپ کر کھینچ لیا۔ بھلا اس گھر میں ایسی بے باکی کی گنجائش کہاں تھی۔

"آپ آئس کریم گھر لے آیئے گا، سب کے ساتھ مل کر کھائیں گے۔" اس نے سادگی سے کہہ کر ان کی توجہ خود سے ہٹائی۔

نہ جانے کیوں وہ غور غور سے دیکھ رہے تھے۔

"گویا میری جیب کا کباڑا کرواؤ گی۔"

"اتنی کنجوسی، تھوڑے ڈالر کمائے ہیں؟"

"اوکے، صرف تمہاری خاطر۔" وہ ہاتھ ہلا کر چلے گئے، بیلا حیران سی سوچتی رہ گئی۔

"میری خاطر کیوں؟ چلو، کسی کو تو ہماری قدر ہے۔" اسے ازسرنو صبح والی ڈانٹ یاد آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کتنے اچھے کپڑے یوں ہی پڑے پرانے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو ہمارے ہاں کوئی فنکشن بھی نہیں آتا۔" ساری الماری کے کپڑے بیڈ پر ڈھیر تھے اور وہ سیاہ کلیوں والی فراک خود سے لگائے افسوس کر رہی تھی۔ ایک ڈیزائن تخلیق کرتی زیبا نے اسکرین سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں ہی شوق تھا گھر بیٹھنے کا۔ میرے ساتھ اکیڈمی جوائن کرتیں تو سارے کپڑے کام آجاتے۔"

"چھوڑو، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، عاشر کہتا ہے۔"

"یہ عاشر تم سے کچھ زیادہ ہی نہیں کہتا۔" زیبا نے شرارت سے پوچھا۔ وہ سٹپٹا گئی۔

"تمہیں پتا ہے، ہم بچپن ہی سے۔۔۔"

"مس بیلا! اب آپ بڑی ہو گئی ہیں۔ تھوڑا اپنا زاویہ نگاہ وسیع کر کے دیکھیں، چیزوں کی ماہیت اور لوگوں کی حیثیت بدل رہی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"ذکی بھائی سے زیادہ فری مت ہو، کل تم ان کے ساتھ کچن میں بریک کر رہی تھیں۔ چھوٹے ابا وہاں گزرے تھے۔ مجھے لگا انہیں اچھا نہیں لگا۔"

"اچھا۔" وہ ایک دم خفیف سی ہو گئی۔

"وہ تو بہت عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں اور ہمارے ہاں اتنی بے تکلفی بھائیوں کے ساتھ بھی نہیں ہوتی۔ ہاں، عاشر کی بات اور ہے۔" وہ پھر سے شوخ ہوئی۔ بیلا نے آخری بات پر غور نہیں کیا۔ وہ پہلی میں ہی الجھی تھی۔ تب ہی ہلکی دستک کے ساتھ ذکی اندر آئے۔ بیلا کو ایک دم جھنجلاہٹ نے گھیر لیا۔

"لگتا ہے آپ کو کوئی اور کام نہیں ہے، سوائے ادھر ادھر گھومنے کے۔" قصور ان کا نہیں تھا۔ وہ تو دستک دے کر آئے تھے۔ وہ ہی کپڑوں کے ڈھیر میں دوپٹہ گم کر بیٹھی تھی اور اب کالی فراک دوپٹے کی طرح لپیٹے کھڑی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟" وہ ٹھٹک سے گئے۔

"کچھ چاہیے؟"

ذکی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ماتھے پر شکن سی ابھری اور وہ "کچھ نہیں" کہتے چلے گئے۔

"اب اتنا روڈ ہونے کو بھی نہیں کہا تھا۔" زیبا کی بڑبڑاہٹ پر اس نے چڑ کر فراک پھینکی اور اپنا دوپٹہ ڈھونڈنے لگی۔ آخری کپڑا تہ کر کے الماری میں رکھنے تک اک ہلکی سی پشیمانی کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ اسے مہمان کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ تب ہی شام کو خاص طور پر ٹرائفل بنا کر اوپر لے گئی۔ ذکی فون پر بات کر رہے تھے اور پھوپھو کچھ تصویریں ہاتھ میں لیے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے فون بند کر کے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی تو وہ جلدی سے بولی۔

"آپ کے لیے ٹرائفل لائی تھی۔"

"فریج میں رکھ دو، ٹھہر کر کھالے گا اور شائستہ کیا کہہ رہی تھی؟" پھوپھو اس سے کہہ کر ذکی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کچھ نہیں۔" ذکی نے ٹالا۔

وہ ٹرائفل فریج میں رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

"بتاؤ بھلا، کیا کمی ہے ان لڑکیوں میں، اس کی نظر میں کوئی سماتی ہی نہیں۔" بیلا نے ایک تصویر اٹھاکر دیکھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی اور نیچے کسی کو خبر ہی نہیں۔

"بتاتے کیوں نہیں۔"

انہوں نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر لبوں میں دبائی اور لائٹر کی تلاش میں ٹیبل پر نگاہ دوڑائی۔ وہ بیلا کے داہنی طرف پڑا تھا۔ اس نے اٹھاکر ان کی طرف بڑھایا، جسے ایک خشک سے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا گیا۔

"امی! میں جس سے بھی شادی کروں گا، ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا، وہ یہیں رہے گی آپ کے پاس سو جو بھی ہو، وہ باہر جانے کا خواب ساتھ لے کر مت آئے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

یہ شائستہ کی شرط ہے؟"

وہ ایک پل کو خاموش ہوکر سگریٹ سلگانے لگے۔

"لیکن اس طرح کیسے چلے گا؟" انہوں نے بیلا کو دیکھا۔

"میں چکر لگاتا رہوں گا۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"جیسے پہلے لگاتے رہے ہو۔" پھوپھو نے طنز کیا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں، ایسی تو ہو کہ واپس آنے کو دل چاہے۔" ان کے لہجے میں شرارت در آئی۔ بیلا نے چاروں تصویریں اٹھاکر غور سے دیکھیں۔ اسے تو اچھی ہی لگیں۔

"ان میں کیا خرابی ہے؟"

انہوں نے کچھ لاپروائی سے تصویریں اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر ڈال دیں۔ بیلا کو بہت برا لگا۔ وہ اسے مسلسل نظرانداز کررہے تھے۔

وہ کھڑی ہوگئی۔ تب ہی فیضان تیزی سے اندر آئے۔

"ذکی! فارغ ہو تو میرا اک کام تو کردو۔ سونیا کو اس کی امی کے ہاں سے پک کرنا ہے، میں ذرا بزی تھا، اگر تم....."

ذکی نے چابی ان کے ہاتھ سے لی۔ دونوں باتیں کرتے باہر نکل گئے۔ پیچھے وہ رہ گئی پھوپھو کے دکھڑے سننے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

ذکی کو دیکھ کر سونیا کے چہرے پر جھنجلاہٹ سی چھا گئی۔ وہ یقیناً فیضان کی منتظر تھی۔ گھر میں کچھ مہمان تھے۔ وہ غالباً ان ہی سے فیضان کو ملوانا چاہتی تھی۔ تب ہی واپسی کے سفر میں خاموش سی تھی۔ ذکی نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ ابھی ابھی اس کے محل نما گھر سے نکلا تھا۔ اس کی انتہائی ماڈرن مگر گریس فل ماں سے ملا تھا۔ سونیا کا اسٹیٹس اس کے سامنے تھا۔

"فیضان نے زندگی میں بس ایک ہی کام ڈھنگ کا کیا ہے؟" سونیا نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

"آپ سے شادی۔" ذکی کے کہنے پر سونیا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"آپ دونوں کے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔" ذکی کا لہجہ محتاط سا تھا۔

"یہ فرق تو آپ کے اور شائستہ کے مابین بھی ہے۔" ذکی نے چونک کر سونیا کو دیکھا، پھر ہلکی مسکراہٹ لبوں پر پھیلی۔

"آپ تو خاصی باخبر ہیں بھابھی!"

"رہنا پڑتا ہے۔"

"لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ فیضان کو کنویں سے نکالنے کے بجائے آپ تو خود کنویں کی مکین بن گئیں؟ یہ تو محل سے جھونپڑے تک کا سفر ہے۔"

"کبھی کبھی محل وہ خوشیاں نہیں دے پاتے ذکی



بھائی جو..."

"جانے دیں۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔ پیچھے پلٹنے کا نہیں اور یہ ہی بات میں فیضان سے بہت بار کہہ چکا ہوں۔"

"وہ اپنی فیملی سے بہت کمیٹڈ ہیں۔"

"ہر کوئی ہوتا ہے، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان آگے بڑھنا ہی بھول جائے تو ویری فرینکلی، یہ رشتے ناتے ہمارے لیے اتنے ہی اہم ہونے چاہئیں جتنا کہ ہم کو فائدہ پہنچا سکیں۔" انہوں نے احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ سونیا الجھ سی گئی۔

"آپ کے خیالات بہت عجیب ہیں۔ بالکل ممی جیسے۔ اب پتا چلا وہ آپ سے مل کر اتنا خوش کیوں ہوئی تھیں۔"

"شی از ویری نائس وومن۔" وہ مسکرائے۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی چل رہا تھا مگر سب باتوں میں مگن تھے۔ وہ جھولنے والی کرسی پر دونوں پاؤں اوپر رکھے موبائل میں گم تھی۔ ساری سہیلیاں رابطے میں تھیں۔ زیبا اس کا کپ قریب ہی ٹیبل پر رکھ گئی۔ ذکی اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

"یار! تم لوگ ترقی کرنا ہی نہیں چاہتے ہو۔ کنویں کا مینڈک بن کر رہ گئے ہو۔ اس ملک کے حالات دیکھ رہے ہو، مہنگائی، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ روٹی، دال کے چکروں میں پڑ کر رہ گئے ہیں۔ کاروبار کا کوئی حال نہیں، نوکری کی کوئی گارنٹی نہیں، آج قناعت کرکے بیٹھے ہو، کل کا کیا ہوگا؟"

"یار! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، پر کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔" سفیان بھائی نے کندھے اچکائے۔

"کچھ کرنے کی ٹھان لو، تب ہی رستے کھلیں گے۔ اچھا تم بتاؤ، کل کو تم لوگوں کی اولادیں بڑی ہوں گی، ایک ایک بیڈ روم والے اس گھر میں گزارا ہوجائے گا؟ اس گھر کے حصے بخرے ہوں تو تم لوگوں کے ہاتھ اتنا بھی نہیں ہوگا کہ اپنے لیے ڈھنگ کا ایک گھر خرید سکو۔"

"اللہ نہ کرے، جو اس گھر کے حصے بخرے ہوں۔" بڑی امی تڑپ اٹھیں۔

"پتا نہیں ذکی بھائی کی سوچ اتنی مادیت پرست کیوں ہے۔" وہ کچھ چڑ کر اور کچھ اکتا کر اپنا کپ اٹھاتی باہر نکل آئی۔ باہر ہلکی چاندنی رات پھیلی تھی اور برآمدے میں گل صنوبر عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔

"یا اللہ! ایسا جذب مجھے بھی نصیب کر۔"

تب ہی میسج ٹون بج اٹھی۔ وہ ہی انجان نمبر جو اب اتنا بھی انجان نہیں رہا تھا۔

اپنے ہونٹوں پہ سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں

تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

"توبہ! یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔" اس نے جلدی سے ڈیلیٹ کردیا، پھر عاشر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بہت دن ہوئے اس سے بات نہیں ہوئی تھی، مگر اس کا نمبر بند تھا۔ تب ہی اس کے عقب میں اک سایہ سا لہرایا۔ وہ ایک دم گھبرا کر سیدھی کھڑی ہوئی۔

"ذکی بھائی! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔ اتنا دبے پاؤں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ خاموشی سے سگریٹ سلگاتے رہے۔

"آپ ابھی تک ناراض ہیں۔" انہوں نے اک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا تو وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"مجھے آپ کا سگریٹ پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"چھوڑ دوں؟" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی....." وہ متحیر سی ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"سگریٹ چھوڑ دوں؟"

"مرضی ہے۔" بیلا نے جھک کر کپ اٹھایا اور اندر کی طرف قدم بڑھادیے۔

"سنو....."

وہ ان کی پشت کی طرف ذرا دیر کو رکی۔
"یہ سچ ہے کہ میں اپنی انسلٹ کبھی نہیں بھولتا لیکن...میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔"
وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔
گل نے سلام پھیرا تو نگاہ ان پر ٹھہر گئی۔ وہ خاموش کھڑے سگریٹ کو سلگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ انہیں احساس ہی نہ تھا کہ ان کے داہنی طرف کوئی اور ذی نفس بھی موجود ہے۔
گل صنوبر نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

☼ ☼ ☼

گھٹا گھنگھور گھور
مور مچاوے شور
مورے سجن آجا

کیبل کے دور میں 'نہ جانے کون تھا' جو پی ٹی وی پر نیرہ نور کو سن رہا تھا۔ اور وہ تھی کہ دونوں پاؤں جھولے پر رکھے سر جھولے کی پشت سے ٹکائے اپنے وجود پر بوندوں کی گدگداہٹ محسوس کرتی سر سے آواز ملا رہی تھی۔ ابھی کل ہی تو گرمی سے گھبرا کر اس نے زیبا سے کہا تھا۔ "فہد بھائی سے کہو نا' تھوڑے بادل ہمیں بھی بھجوا دیں۔"
اس کا پیغام غالباً" براہ راست اللہ میاں تک پہنچا تھا۔ تب ہی تو آنکھ بادلوں بھری صبح میں کھلی' اب وہ تھی اور برستی بوندیں۔ گل صنوبر کو بارش سے الرجی تھی' سوماں کے کمرے میں جا گھسی تھی اور جھولے پر بیلا کا قبضہ تھا۔ اپنے عقب میں کھلی کتنی ہی کلیاں توڑ کر اپنے آنچل میں جمع کر لیں' جن کی خوشبو مٹی کی خوشبو سے ہم آہنگ ہو کر مشام جاں کو مہکانے لگی تھی۔ اس نے اک زرد کلی بالوں میں سجاتے ہوئے فالسے کے پیڑ کو دیکھا۔
فالسہ ابھی کچا تھا۔ بچپن کی ایک میٹھی سی یاد نے اس کا ماتھا چوم لیا۔
اسے خبر ہی نہ تھی' کوئی تھا جو بہت دیر سے اس کے وجود کی رعنائیوں کو اپنی آنکھوں میں سمو رہا تھا۔ وہ بس خود میں گم' خود ہی مزا کر رہی تھی۔ تب ہی اوپر کی کھڑکی کھلی اور زیبا نے جھانکا۔
"اے لڑکی! فہد کا گفٹ ملا؟"
"مجھے نہیں پتا تھا' قدرت بھائی کا اس حد تک ساتھ دیتی ہے۔" وہ پکاری۔
"اچھا سنو' آج ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں فنکشن ہے' تمہاری بلیک فراک پہن رہی ہوں۔" پیغام کے ساتھ ہی کھٹ سے کھڑکی بند۔
"ہائے نہیں۔" وہ ایک دم جھولے سے کھڑی ہوئی۔ ساری کلیاں سبز گھاس پر بکھر گئیں۔
"زیبا! خبردار جو میری فراک کو ہاتھ لگایا۔"
وہ پچھلے دروازے سے اندر کی طرف بھاگی۔ اس کے گیلے پاؤں برآمدے' کچن اور لاؤنج تک نشان بناتے چلے گئے اور سیڑھیوں سے ایک قدم پہلے وہ بری طرح کسی سے ٹکرائی۔ بلکہ اس افراتفری میں بھی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نہیں' سامنے والا اس سے ٹکرایا ہے اور ساتھ ہی اسے گرنے سے بچانے کے لیے تھام بھی لیا۔
ایک ثانیے کو وہ حواس باختہ ہوئی۔
"اوں ہوں' اگر چوٹ لگ جاتی۔"
بیلا کی ساری حسیات ایک دم چوکنا ہوئیں' وہ کسی کے حصار میں تھی' مگر اس حصار میں نہ حفاظت تھی' نہ پناہ۔ ایک ثانیے کو دانستہ طول دے کر لمحوں پر محیط کرتا حصار۔ وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی اور خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"کیا ہوا؟" وہ بلا کا اداکار تھا۔ ایک ہی پل بس اور ذکی کا بت پاش پاش ہو کر قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو سے نکلتی سیڑھیاں پھلانگتی چلی گئی۔
ذکی کے لبوں پر محظوظ سی مسکراہٹ بکھری۔
یہ زرد چنبیلی کی خوشبو تھی یا کنوارے وجود سے پھوٹتی۔
ان کی گہری سانس وہی اٹک گئی۔
لاؤنج کے کھلے دروازے میں شائستہ ساکت سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔



"شائستہ! تم؟" وہ سامان گھسیٹتی عین ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔
"یہ کیا ہو رہا تھا ذکی؟"

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے' تم کچھ الجھی الجھی سی لگتی ہو۔" زیبا نے اس سے کئی بار پوچھا تھا۔ وہ کیا بتاتی' کنی کترا گئی۔ بڑی امی نے بھی بڑی تشویش سے اس کا ماتھا چھوا۔
"طبیعت ٹھیک ہے' مینا چہکنا کیوں بھول گئی۔"
اور امی' وہ سمجھتی تھیں کہ لڑکیاں اس عمر میں کئی قسم کے فیز سے گزرتی ہیں اور اس صورت حال کا واحد علاج مصروفیت ہے۔ سو وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی تو کوئی نہ کوئی لان کا سوٹ دے کر بٹھا دیتیں کہ صنوبر سے کٹنگ اور سلائی سیکھو۔ خود اس کی بھی کوشش تھی کہ ذکی سے سامنا ہی نہ ہو۔ وحشت زدہ ہرنی کی طرح چوکنا رہتی۔ وہ ایک لمحہ اس پر بہت کچھ منکشف کر گیا تھا۔
بھائی کہنے سے کوئی بھائی نہیں بن جاتا۔ رشتہ وہی' جو خون کا ہو۔
"مگر کیوں' یہ غلاظت کہاں سے ان کے ذہن میں آ گھسی۔"
شائستہ بہت دیر سے اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
"شائستہ بھابھی! کچھ چاہیے؟" بیلا اپنے خیالوں سے چونکی تو وہ نظر آئی۔ شائستہ نفی میں سر ہلاتے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ جن میں سرفہرست اس کی ذات سے متعلق سوالات تھے۔
"آگے کیوں نہیں پڑھا؟"
"مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟"
"کہیں منگنی وغیرہ ہوئی؟"
یہ سچ تھا کہ شائستہ بہت خوب صورت اور چھا جانے والی شخصیت تھی۔ وہ کچھ نروس سی ان کے سوالوں کا جواب دیتی رہی۔ سونیا آئی تو اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔ سونیا بھی اپنی مام کے ساتھ فارن ٹرپ پر جاتی رہی تھی۔ سو گفتگو پلٹ گئی۔ اب وہ بس ہونقوں کی طرح ان کی معلومات کے تبادلے سن رہی تھی۔
"شائستہ بھابھی! آپ کو پھوپھو یاد کر رہی ہیں۔"
"آتی ہوں۔" شائستہ نے لاپروائی سے کہا اور پھوپھو کو اچھا خاصا انتظار کروانے کے بعد اٹھی۔ سونیا خاموشی سے بیٹھی ناخن پر لگی پالش کریدنے لگی۔ ہلکی سوچ کی پرچھائیں اس کے چہرے پر چھائی تھی۔
"کیا سوچ رہی ہیں بھابھی۔"
"مجھے لگتا ہے میں کہیں گم ہو گئی ہوں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی' کسی انسان کے لیے خود کو اتنا بدل لینا کہ اپنا چہرہ ہی اجنبی لگنے لگے' کیا ٹھیک ہے؟"
"میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔" بیلا نے ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھا۔ "میری تو خود سمجھ میں نہیں آیا۔ تمہیں کیا سمجھاؤں۔" وہ بے معنی سی ہنسی ہنس دی۔
"بھابھی! بہت دنوں سے آپ نے پزا نہیں بنایا' آج بنائیں نا۔" بیلا نے یوں ہی ان کا دھیان بٹانے کو کہہ دیا۔
"آج موڈ نہیں ہے' پھر کبھی سہی۔" وہ کہہ کر چلی گئی' بیلا کو یاد نہ تھا کہ آج سے قبل انہوں نے کبھی کسی کی فرمائش کو یوں رد کیا ہو۔
"سب کام کاج چھوڑ کر یہاں ایک مہینے سے کیا کر رہے ہو۔" شائستہ نے جس طرح ذکی کے لتے لیے تھے' پھوپھو نے انگلی دانتوں میں دبالی اور شکر کیا کہ بہو مستقل امریکہ میں رہتی ہے۔
"میں تم سے چوری چھپے تو نہیں آیا۔" ذکی نے جھنجلا کر سگریٹ سلگائی۔
"ایک ماہ میں شادی تو کیا' تم لڑکی بھی فائنل نہ کر سکے اور چچی آپ۔"
"ارے' میں نے تو بہت لڑکیاں دکھائیں' مگر یہ ہی۔" وہ گڑبڑا گئیں۔
"ہاں' یہ جن چکروں میں ہے' اس کا مظاہرہ میں

نے آتے ہی دیکھ لیا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"فار گاڈ سیک شائستہ! تم چاہتی کیا ہو۔"

"مت بھولو، میں نے تمہیں دوسری شادی کی اجازت دی ہے، ورنہ وہاں کے قانون کی رو سے تم دوسری شادی نہیں کر سکتے۔"

پھوپھو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نقص تو شائستہ میں ہے، پھر ان کا بیٹا اس طرح دب کر کیوں بات کر رہا تھا۔ تین لفظ کہہ کر جان چھڑائے اس چڑیل سے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اس چڑیل سے جان چھڑانے کی پاداش میں ذکی کو بہت کچھ کھونا پڑتا، جو انہیں گوارا نہ تھا۔

"تو..." ذکی نے سنجیدہ نظروں سے اپنی خوب صورت اور طرح دار بیوی کو دیکھا۔

"تو اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو۔" وہ چیخ اٹھی۔

"تم مجھے دوسری شادی کی اجازت دے چکی ہو۔" ذکی نے جتایا۔

"شادی کی اجازت تمہیں اپنے لیے شریک حیات منتخب کرنے کے لیے نہیں دی، اولاد کے لیے دی ہے، اور یہ کام کوئی بھی کر سکتی ہے۔"

"کسی ماسی کی لڑکی سے شادی کر لوں؟" وہ چڑ کر بولے۔

"کیوں... اس گھر میں تمہاری ایک سابقہ منگیتر بھی تو ہے۔"

ذکی اپنی جگہ ششدر سے رہ گئے۔

پھوپھو کا منہ کھل گیا، وہ بڑبڑائیں۔

"گل صنوبر؟"

"ہاں، گل صنوبر۔ بے چاری، اب تک کنواری بیٹھی ہے۔ اس ڈھلتی عمر میں اسے کون بیاہنے آئے گا۔ اب کچھ کرنے ہی چلے ہو تو تھوڑا ثواب ہی کما لو، اسے سہارا مل جائے گا اور تمہیں بچہ۔" شائستہ نے آرام سے کندھے اچکائے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" ذکی نے غصے سے سگریٹ مسل دیا۔

"میرا نہیں تمہارا۔ اپنی اڑان نیچی کرو، اور چچی! آپ بڑے ابا سے گل صنوبر کے رشتے کی بات کریں، مجھے یقین ہے انکار نہیں ہو گا۔"

وہ ذکی کو کھولتا اور پھوپھو کو ہکا بکا چھوڑ کر کھٹ کھٹ کرتی نیچے چلی گئی۔ ذکی ایک ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ پر مار کر رہ گئے۔ پھوپھو نے غور سے بیٹے کے تیور دیکھے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر کروں بھائی صاحب سے بات؟"

"امی! آپ بھی..."

"کیونکہ گل صنوبر بڑی سیدھی سادی ہے۔ اللہ بخشے تمہارے نانا کہا کرتے تھے، میری گل بڑی اللہ لوک ہے۔ اسے دکھی کرنے والا کبھی سکھی نہیں رہے گا۔ مجھے تو ہمیشہ سے یہ ہی لگتا ہے کہ تمہاری بے اولادی اسی کی بد دعا کا نتیجہ ہے۔ یاد ہے جب بچپن میں سفیان نے ایک بار گل کو تھپڑ مارا تھا تو اس کے ہاتھ پر شہد کی مکھی نے..."

وہ نہ جانے کون سے قصے لے کر بیٹھ گئی تھیں حالانکہ جب شادی کی بات ہوئی تو سب سے پہلے وہ ای بیٹے کی ہمنوا ہوئی تھیں۔ تب شائستہ انہیں چودھویں کا چاند لگتی تھی اور گل...

وہ غصے سے کھولتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

صبح سے گھر کے بڑوں کی سرگرمیاں خاصی پر اسرار تھیں۔ بڑے ابا نے سب کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ ان بڑوں میں فیضان اور سفیان بھی شامل تھے۔ پھر بھابھیاں بھی شریک کر لی گئیں۔ باوجود کوشش کے بیلا کو کوئی سن گن نہ مل سکی۔ غصے سے پلاؤ کو دم پر رکھا اور کھیر میں چمچہ چلانے لگی۔

"بلی تھیلے سے باہر آ ہی جائے گی، تم کیوں فکر مند ہو۔" دوپہر کے کھانے میں ابھی تھوڑی دیر تھی اور زیبا انسٹی ٹیوٹ سے جلدی گھر آ گئی تھی۔ سو اب سینڈوچ بنا کر پیٹ پوجا کر رہی تھی۔

"ہاں، سارے گھر کو جمع کر لیا، ہم کسی کھاتے میں



ہیں۔"

"سب کو چھوڑ کر تم سے مشورہ کرتے۔" زیبا نے ...یں۔

"تمہیں تو کسی بات کی فکر ہی نہیں ہوتی۔"

"میں خوامخواہ کی فکریں نہیں پالتی۔" اس نے اطمینان سے کہا اور اپنا کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

شام تک اسے کسی بات کی سن گن نہ ملی۔ وہ گل کے پاس بیٹھی، جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی، تب ہی گل نے اچانک کہا۔

"آج کی شام بہت عجیب سی ہے۔"

بیلا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہلکے زرد آسمان پر اک چیل منڈلا رہی تھی۔

"شاید آندھی آنے والی ہے۔" بیلا نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ پھر موبائل پر آیا۔ میسج دیکھنے لگی۔

پھیلتی جا رہی ہے خوشبو سی
دل میں کس کا خیال آیا ہے

"توبہ! یہ بندہ تو تھکتا ہی نہیں۔ عاشر آئے تو سم ہی بدلوا دوں گی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی پھر اٹھ کر ماں کے پاس آ گئی۔

"خیریت امی! یہ سارا دن بڑے ابا کے کمرے میں کیا ہوتا رہا ہے۔"

"تمہارے مطلب کی بات ہوئی تو سامنے آ جائے گی۔" انہوں نے بیٹی کو گھور کر دیکھا۔ وہ منہ بنا کر رہ گئی۔ رات کو کھانے پر آخر کار دھماکا ہو ہی گیا۔ کم از کم بیلا کے لیے تو دھماکا ہی تھا۔ جب بڑے ابا نے آرام و سہولت سے اعلان کیا کہ انہوں نے گل کا رشتہ ذکی سے طے کر دیا ہے اور یہ کہ جمعہ کو نکاح ہے۔

بیلا کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ اس نے تحیر و استعجاب سے ایک ایک کا چہرہ دیکھا۔ سب مطمئن تھے، مسکرا رہے تھے۔ اس نے گل کی طرف دیکھا۔ پھوپھو اسے خود سے لپٹائے بلائیں لے رہی تھیں۔ گویا سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ گل کا چہرہ اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ سکی مگر خود اس کے اندر آگ سی لگ گئی تھی۔

گل صنوبر اور ذکی۔

ذکی اور گل آپی۔

اک سلگتا ہوا لمس، اک آگہی دیتا لمحہ۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" پلیٹ کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

امی نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔

☼ ☼ ☼

دھن... دھن... سرخ مرچیں اڑ، اڑ کر اس کی آنکھوں اور ناک کا ناس کر رہی تھیں، پر نہ ہاتھ رکتا تھا، نہ چھینکیں، اور نہ آنکھوں سے بہتا پانی گویا اسے اپنا سارا غصہ ان ہی ثابت سرخ مرچوں کو کوٹ کوٹ کر نکالنا تھا۔

ہر کوئی روک روک کر تھک گیا۔ بڑی اماں الگ پچھتائیں۔ نہ وہ سو کھنے کو ڈالتیں نہ بیلا کا یہ حشر ہوتا، لیکن سوال یہ تھا کہ پھر اس کا غصہ کیسے نکلتا؟

وہ ایک ایک سے لڑی تھی مگر سب کے نزدیک وہ بالکل ناسمجھ بلکہ بے وقوف تھی، سو کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ہر کوئی یوں مطمئن، شاداں و فرحاں جمعہ کو ہونے والے نکاح کی تیاریوں میں مگن تھا۔ ذکی کی دوسری، مگر گل کی تو پہلی شادی تھی۔ اس کا کوئی ارمان ادھورا نہ رہ جائے۔ بنا بنایا خوب صورت فرنیچر اوپر کی منزل میں سیٹ ہو گیا۔ درزی کو بٹھا کر ہنگامی طور پر ملبوسات سلائے جا رہے تھے۔ گھر کی آرائش، مہمانوں کو بلاوے۔ کھانے کا انتظام، پارلر کے چکر... سو کس کو فرصت تھی کہ بیلا کی اس بے تکی بات پر کان دھرے کہ ذکی کسی صورت گل کے قابل نہیں۔

سو اب وہ تھی اور سرخ مرچیں۔

آنکھوں کی جلن۔

ایک تواتر سے آتی چھینکیں۔

وہ حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ مگر ہاتھ نہ روکتی تھی۔

تب ہی کسی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر بلکہ گھسیٹ

کر کھڑا کیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپی، مگر گرفت مضبوط تھی۔ موسل ہاتھ سے چھوٹ کر دور تک لڑھکتا گیا۔ وہ چیختی رہی، مگر اس نے گھسیٹ کر بیسن کے سامنے کھڑا کردیا۔ وہ زیادہ مچلی تو چلو میں پانی لے کر چھپاک سے منہ پر دے مارا۔

"شرافت سے ہاتھ منہ دھولو، ورنہ گردن پکڑ کر نل کے نیچے کردوں گا۔" غصے بھرا تحکمانہ لہجہ، بیلا نے اس سے بھی زیادہ غصے سے گھورنا چاہا۔ مگر آنکھوں کی حالت زیادہ نازک ہوچکی تھی، سو وہ جھک کر اور بے حد غصے سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھونے لگی اور تب تک دھوتی رہی جب تک عاشر کا صبر ساتھ دیتا رہا۔ آخر تنگ آکر عاشر نے نل بند کیا۔ وہ بازو چھڑا کر صحن میں چارپائی پر جا بیٹھی۔ عاشر نے کچن سے آئس کیوبز اور ٹشو پیپر لا کر اس کے قریب رکھ دیے۔

"تو اچھے بچوں کی طرح ٹکور کرو۔"

اس نے واقعی اچھے بچوں کی طرح عمل شروع کردیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ستون سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا۔

"تم کب آئے؟" غصے اور جلن کا گراف نیچے آگیا تھا۔

"ابھی... پوچھ سکتا ہوں یہ کیا ہو رہا تھا۔"

"مجھ سے نہیں گھر والوں سے پوچھو۔" اس کی آنکھیں بے بسی کے احساس کے ساتھ لبالب بھر آئیں۔

"گل آپی کی شادی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"کس کے ساتھ؟" بیلا نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ بھائی کا نام لیتے لیتے رک گیا۔

"بیلا! تمہیں بھائی پر اعتراض کیوں ہے۔"

"وہ کسی بھی طرح گل آپی کے قابل نہیں۔ تم بتاؤ، کیا گل آپی کے نصیب میں یہ ہی ہے کہ کوئی ان سے دوسری شادی کرے اور وہ بھی اولاد کی خاطر۔"

"ہاں... لیکن..." عاشر کچھ کہہ نہ پایا۔ بظاہر اس میں کچھ حرج بھی نہ تھا۔ مگر وہ کچھ ایسا کہنا چاہتا تھا جس سے بیلا کی تشفی ہوسکے۔

"ہاں تم بھی ان ہی کا ساتھ دو گے، آخر وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں کسی لڑکی کے احساسات و جذبات کی کیا قدر۔" وہ اسی پر الٹ پڑی۔

"بیلا..." بڑی اماں پکار رہی تھیں۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر نہ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مرے مرے قدموں سے ان کے پاس آئی۔ انہوں نے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے گئیں اور لے جا کر پچھلے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا کردیا۔ قرآن پاک کی تفسیر پڑھتی امی نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"اسے غور سے دیکھو بیلا! یہ لڑکی میری بیٹی ہے۔ میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس میں کوئی ایسا گن نہیں کہ کوئی اسے اپنے گھر لے جائے اور بسانے کا سوچے۔" بیلا نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ وہ بڑی سفاکی سے کہہ رہی تھیں۔ ایسی سفاکی جس کے عقب سے درد ہی درد چھلک رہا تھا۔

"اس کی ڈھلتی عمر، سر پر بکھرتی سفیدی، بغیر تعلیم، بغیر تیزی طراری، ہوشیاری کے کون ہے جو اسے بیاہنے آئے گا اور اگر کوئی ایسا دل والا ہوتا تو آج والدین کی دہلیز پر بیٹھی گل صنوبر بوڑھی نہ ہو رہی ہوتی۔ پھول مرجھا چکا ہے بیلا! اس سے قبل کہ یہ خزاں کا مارا پھول اس ہنستے بستے گلشن کا بدنما داغ بن جائے، اسے کسی کے نام ہوجانے دو۔ میں ماں ہوں، اس کی سونی مانگ میرا چین چھین لیتی ہے۔ اس کی خالی کلائیاں میرا دل نوچتی ہیں۔ اس کی ویران زندگی میری نیندیں لے گئی ہے۔ ہر ماں کی طرح میرا بھی یہ ہی ارمان ہے، میں اپنی بیٹی کو دلہن بنا دیکھوں۔ اس کی مانگ میں افشاں سجاؤں، اسے سرخ جوڑے میں لپٹا دیکھوں۔ میں نے بہت عرصہ انتظار کیا ہے۔ تھک گئی ہوں، مایوس ہوگئی تھی۔ آج اگر وہ دلہن بن رہی ہے تو بدشگونی کی باتیں مت کرو۔ ارے اس بدنصیب کے سینے میں بھی دل ہے، کیسی بہن ہو کہ بہن کی آنکھوں میں سجے سپنے ہی دکھائی نہیں دے رہے۔ اسے جوڑا پہننے دو، اس کی کلائیوں میں چوڑیاں بجنے دو،



اس کی سونی مانگ میں افشاں چمکنے..." بڑی اماں روتے روتے کہتی گئیں اور کہتے کہتے چلی گئیں۔

بیلا اپنی جگہ دم بخود تھی۔

اس کے سامنے اک لڑکی تھی، جس کی مانگ سفید تھی مگر جس کے ہاتھوں میں اک سرخ دوپٹہ تھا۔ جس کی انگلیاں سنہری کرن ٹانک رہی تھیں "یا خواب" وہ ذرا سا لڑکھڑائی اور سہارے کے لیے کرسی تھام لی۔

امی نے قرآن شریف بند کرکے ریک میں رکھا اور عینک اتار کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"کبھی کبھی حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے، لیکن اس کی تمام تر تلخی کے باوجود قبول کرنا پڑتا ہے اور پھر صنوبر نے تو بچپن سے اپنے نام کے ساتھ ذکی کا نام سنا ہے۔ یہ خواب ادھورا سہی، مگر اس کی آس، اس کا سہارا بن جائے۔ سمجھو کہ گل کی محبت اسے واپس آنے پر مجبور کرگئی۔"

بیلا کے لیے ایک اور انکشاف اور اس کے بعد بیلا کو لگا کہ اب وہ کبھی اس رشتے کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہہ پائے گی۔

☼ ☼ ☼

"لڑکیاں نیچے شفٹ ہوجائیں۔" یہ بڑے ابا کا حکم تھا۔ بیلا کو پہلا قلق اگر گل کی ذکی کے ساتھ شادی کا تھا تو دوسرا یہ کمرا چھوڑنے کا۔ وہ بے دلی سے اپنا چھوٹا موٹا سامان اٹھا رہی تھی۔ زیبا بھی الماری سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔ مریم تو اتنی جلدی آنہ سکتی تھی، البتہ فرح سنتے ہی آگئی۔ باقی مہمان بھی جمع ہو رہے تھے۔ شائستہ اپنے والدین کے گھر جاچکی تھی۔

"تمہارا یہ سوجا ہوا منہ ٹھیک نہیں ہوسکتا، تاکہ شادی پہ تھوڑا مزا آسکے۔" فرح نے جھنجلا کر کہا۔

"میں نے کسی سے کیا کہا ہے، کرو مزے... مجھے اس شادی سے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تو میں کیا کروں؟"

"اف وہ ہی مرغے کی ایک ٹانگ، آخر تو کس مٹی سے بنی ہے۔"

"جس میں خود غرضی شامل نہیں۔"

"اور خود غرضی کون دکھا رہا ہے۔"

"آف کورس ذکی بھائی، وہ جانتے ہیں کہ وہ گل آپی سے کبھی محبت نہیں کرسکیں گے۔ وہ صرف اولاد کے لیے شادی کر رہے ہیں۔"

"پاگل! کبھی کبھی محبت اتنی ضروری نہیں ہوتی، زندگی گزارنے کے لیے کچھ اور سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے... بیلا... ماں، باپ کسی کے ہمیشہ نہیں رہتے۔ کم از کم گل کے ساتھ ذکی کے نام کا سہارا تو ہوگا۔" فرح نے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی سوال کلبلائے... تب ہی ذکی دروازے کھٹکھٹا کر اندر آگئے۔

"پیکنگ ہو رہی ہے؟"

"نہیں شفٹنگ۔ دیکھ لیں، آپ کی شادی نے ہم سے ہمارا کمرا چھین لیا۔"

فرح ہنسی۔ انہوں نے اک اچٹتی سی نگاہ بیلا پر ڈالی، جو انہیں یکسر نظرانداز کیے کتابوں کا بکس کھولے اس میں مزید چیزیں بھرنے لگی تھی۔

"اوہ! تو لوگ اسی لیے مجھ سے خفا ہیں۔"

"نہیں... خفا ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔" فرح شرارت سے گویا ہوئی۔

"کیوں بیلا رانی... سنا ہے، آپ کو ہماری شادی پر سب سے زیادہ اعتراض ہے۔" انہوں نے جھک کر بکس میں سے ایک کتاب اٹھائی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"تو پھر یہ بے اعتنائی کیسی؟" انہوں نے کتاب کی ورق گردانی کرنا چاہی تو وہ عین وہاں سے کھلی جہاں ادھ کھلا گلاب سوکھ کر باسی خوشبو چھوڑ رہا تھا۔

"اوہو تو بیلا کو کتابوں میں پھول رکھنا پسند ہے۔" بیلا نے پلٹ کر دیکھا۔

"کسی کی نشانی یا کوئی چھوٹی سی یاد۔"

بیلا نے جھپٹ کے پھول اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور چبا چبا کر بولی۔

"مجھے خوشبو کو قید کرنا پسند نہیں۔"

فرح نے کچھ محسوس کیا تو تیزی سے آگے بڑھی۔

"آئیں ذکی بھائی! نیچے چلتے ہیں۔ مزدور یہاں سے قالین وغیرہ اٹھوالیں۔"

انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے بیلا کو دیکھا، جو ان کی طرف پشت کیے مصروف ہو گئی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے اور کھڑکی کے نیچے کھڑے عاشر نے بے حد تحیر سے خود پر نچھاور ہوتی سوکھی پتیاں دیکھیں۔ پھر سر اٹھا کر اوپر کھڑکی کو۔ "کیا یہ میری محبت کا جواب ہے؟" وہ ششدر سا کھڑا سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دلہن بنی گل صنوبر کو دیکھ کر بیلا کو احساس ہوا کہ ہر ماں کے دل میں بیٹی کو دلہن بنا دیکھنے کی خواہش اتنی شدّت سے کیوں پیدا ہوتی ہے۔ گل کا رنگ صاف تھا۔ اس کے نقش بھی خوب صورت تھے مگر وہ ہمیشہ بے رنگ اور بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ مگر آج یوں لگتا تھا سارے رنگ اس ایک وجود میں سمٹ آئے ہوں۔ بیلا نے مہمانوں کے ہجوم پر اک نگاہ دوڑائی۔ بڑی اماں کتنا ہنس رہی تھیں۔ گویا آج ساری دنیا کے سوالوں کا جواب دے دیا۔ بڑے ابا کتنے مطمئن اور مسرور سے پھر رہے تھے۔

"کیا بیٹی کی ذمّہ داری واقعی اتنی بھاری ہوتی ہے۔"

عاشر نے دور سے فراک اور پاجامے میں ملبوس سجی سنوری بیلا کو دیکھا۔ اعصاب پر باسی پھولوں کی مہک بوجھل پن بڑھا گئی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں ابھی اسٹیج پر دولہا، دلہن کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں نکاح کا مقدس فریضہ انجام دیا جا رہا تھا۔ کچھ بھی سوچے بنا اس نے موبائل نکال کر میسیج کیا۔ بیلا نے چونک کر اپنے ہاتھ میں پکڑا سیل دیکھا۔

"تم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ۔۔۔

"کلیوں سی نازک لڑکی! خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔"

بیلا نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تب ہی نگاہ عاشر پر پڑی۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی تیز تیز قدموں سے اس تک آئی۔

"عاشر! دیکھو، کوئی مجھے تنگ کرتا ہے۔" عاشر نے حنائی ہاتھ میں دبے سیل کو دیکھا۔

"کب سے چل رہا ہے؟"

"جب سے تم نے مجھے یہ سیل دیا ہے۔"

"تنگ کرتا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ بس اچھے اچھے رومانٹک میسج بھیجتا ہے۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"ہو سکتا ہے۔۔۔ واقعی تم سے محبت کرتا ہو۔"

"چھوڑو۔۔۔ موبائل ہو یا انٹرنیٹ، سب جھوٹ ہوتا ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"اچھا اور اصل زندگی میں؟" عاشر نے اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکا۔

"میں نہیں پڑتی ان خرافات میں۔"

"خرافات کیوں؟"

"امی کہتی ہیں اچھی لڑکیاں صرف اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔" وہ برجستگی سے بولی۔ عاشر کا قہقہہ ابھرا تو وہ ناراض ہو گئی۔

"اچھا سنو۔۔۔ اگر کوئی سچ مچ تم سے محبت کا اظہار کرنا چاہے تو۔"

"سر پھاڑ دوں گی۔۔۔ جسے مجھ سے محبت ہے، سیدھے سیدھے اپنے گھر والوں کو بھیجے۔"

"ارے۔۔۔ تو وہ درمیانی رومانٹک پیریڈ؟"

"مجھے نہیں پسند۔" وہ تنک کر کہتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ عاشر نے ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھا، پھر ہنس دیا۔

"بیلا رانی! گویا آپ سے محبت کروانے کے لیے پہلے آپ کا شوہر بننا پڑے گا۔"

"ہاں۔۔۔ مگر کس کا؟" پاس سے گزرتی سونیا ٹھٹک کر رکی۔

عاشر خجل سا ہو گیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کا نام

لبوں کی جنبش میں رہ گیا تھا' ورنہ بھانڈا چوک میں پھوٹتا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔۔۔ گھر والوں کے خوش و خرم چہرے' گل کی کھلی کھلی رنگت' ہونٹوں پر کھلتی شرمگیں مسکان۔۔۔ ذکی کا رویہ بھی اچھا تھا' پھر وہ اکیلی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیا بناتی۔ سب کچھ بھول کر ذکی کو بہنوئی کی حیثیت دینا ہی پڑی۔ گل زیادہ تر اوپر ہی رہتی۔ شاید یہ بڑی اماں کی ہدایت تھی۔ نت نئے زرق برق ملبوسات میں وہ کتنی بدلی بدلی سی لگتی۔ جھولے پر اب بیلا کا قبضہ تھا۔ وہ فارغ وقت میں اے حمید کا زرد گلاب منہ پر رکھے او نگھتی رہتی۔

تب ہی ایک دن شائستہ چلی آئی۔ گل سب کچھ بھول کر اپنی سوکن کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ اسے تین دن کے بعد واپس جانا تھا۔ وہ اور ذکی تیار شیار ہو کر شاپنگ کے لیے نکل جاتے۔ پیچھے گل ان کے لیے نئے نئے کھانے بناتی رہتی اور بیلا کو جلنے کڑھنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

اس دن دونوں کے جانے کے بعد دو' دو سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آگئی۔ جہاں ساس' بہو راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ گل ان کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی اور پھوپھو انہیں ذکی کو قابو کرنے کے طریقے سمجھا رہی تھیں۔

(وقت وقت کی بات ہے۔) بیلا کندھے اچکاتی' آگے بڑھی۔

"آپ ذکی بھائی کو روکتی کیوں نہیں ہیں' روز اس کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔"

"اے ہے۔۔۔ کیسے' آخر وہ اس کی پہلی بیوی ہے۔" پھوپھو بو کھلائیں۔

"اور گل آپی کیا ہیں؟ کتنے دن ہو گئے ایک بار بھی انہیں شاپنگ کرانے یا کھانا کھلانے نہیں لے کر گئے۔" وہ گویا لڑنے آئی تھی' پھپھو ہنس دیں۔

"گل خود ایسی جگہوں سے گھبراتی ہے' پھر دو' چار دن کی تو بات ہے' وہ تو چلی ہی جائے گی۔" وہ گویا پچکارتے ہوئے بولیں۔

"بس کہہ دیں ذکی بھائی سے' ہمیں یہ ناانصافی اچھی نہیں لگتی۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"توبہ' یہ بڑی اماں کہاں سے آگئی۔ گل! اسے تو تم ہی سنبھالو۔" وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئیں' گل نے مسکرا کر بیلا کو دیکھا۔

"گل آپی! آپ کو برا نہیں لگتا۔"

"پاگل' جو میرے نصیب کا ہے' وہ مجھے ہی ملے گا۔"

"آپ بھی نا بس' اچھا اٹھیں' میں نے آپ کے ہاتھ کے پکوڑے کھانے ہیں۔" وہ انہیں گھسیٹتی کچن میں لے گئی۔

شام کو غالباً" پھوپھو نے ان سے کہا تھا تب ہی گاڑی کی چابی گھماتے چلے آئے۔

"چلو بھئی! آج ڈنر باہر کریں گے۔ سنا ہے لوگ تشویش کا شکار ہیں۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی۔ بیلا نے بہوئیں کھڑی گل کو دیکھا' جو سبز لباس میں تیار کھڑی تھی۔

"جب شائستہ آپ کے ساتھ جاتی ہیں' تب آپ سب کو لے کر جاتے ہیں؟" یہ اچھی خاصی بدتمیزی تھی جو بیلا سے سرزد ہوئی۔ ذکی نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ گل کی خواہش تھی۔"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ سب اسے لعن طعن کرنے لگے۔

"میں گاڑی میں ہوں' جس نے جانا ہو' آجائے۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اپنی شرمندگی مٹانے کو اسے زیبا کے ساتھ جانا پڑا۔

☼ ☼ ☼

زندگی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی۔ سونیا امید سے تھی۔ سو زیادہ وقت اپنی مما کی طرف گزارتی۔ فیضان پہلے وہاں قدم بھی نہ رکھتا تھا۔ اب



اکثر آفس سے واپسی پر وہیں پایا جاتا۔۔۔ بیلا نے گھر کی روٹین سے گھبرا کر کمپیوٹر سینٹر جوائن کر لیا۔ عاشر کا تبادلہ کوہاٹ ہو گیا تھا' سو رابطہ صرف فون پر محدود ہو گیا۔ بڑی اماں اٹھتے بیٹھتے گل کے لیے دعا کرتیں اور شاید ان ہی کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ شادی کے ڈھائی ماہ بعد ساون کے مہینے میں گل نے انہیں خوش خبری سنائی۔

"پتا ہے گل! مجھے اب بھی اعتبار نہیں آرہا۔" وہ دونوں جھولے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ذکی کے ہاتھ میں فالسوں سے بھری پلیٹ تھی۔ گل آگے کو جھک آنے والی شاخ کی پتیاں نوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا وہ بے حد کمزور ہے۔ اسے اپنی غذا کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ ملٹی وٹامنز' سپلیمنٹ' کیلشیم' ذکی اس کا بے حد خیال رکھتے۔ گل کو یقین ہی نہ آتا۔ یہ وہی ذکی ہیں' جنہوں نے کبھی اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔ دودھ' پھل' وہ خود کاٹ کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے اسے کھلاتے۔

"میں نے پورے دس سال اس خوش خبری کا انتظار کیا ہے۔ دس سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ جو مجھے خبر ہوتی کہ مجھے یہ تحفہ تم سے ملنے والا ہے تو کبھی دیر نہ کرتا۔" گل مدھم سا مسکرائی۔

"تم اتنا کم کیوں بولتی ہو' کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" انہوں نے اپنا بازو گل کے کندھے پر پھیلایا۔

"ہے نا۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سرخ ہو گئی۔

"تو یار! کھل کر کہو نا۔۔۔ گل! کیسا ہوگا ہمارا بچہ۔۔۔۔ تمہارے جیسا یا میرے جیسا۔ تمہارے جیسا تو بالکل نہ ہو' گھنٹوں گپ چپ بیٹھی رہتی ہو۔ شائستہ جیسا ہو تو کیا ہی بات ہے۔ کانفیڈنٹ اور جینئس۔۔۔۔ تمہیں پتا ہے' وہاں لوگ شائستہ کو۔۔۔"

گل نے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا' بہت خلوت میں بھی انہیں شائستہ یاد آجاتی۔ حالانکہ شائستہ جیسی گرم جوشی دکھانا گل جیسی لڑکی کے بس کی بات کہاں تھی۔ مگر اب تو وہ اپنے بچے کی بات کر رہے تھے۔ اپنے اور گل کے بچے کی' اس میں شائستہ کہاں سے آگئی' مگر وہ مگن تھے۔

"گل! دعا کرو ہمارے ہاں پہلا بیٹا ہو' تمہاری تو اللہ کے ساتھ ڈائریکٹ ڈیلنگ ہوتی ہے۔ ہمہ وقت نماز و تسبیح میں لگی رہتی ہو۔ تمہاری بات تھوڑی ٹالے گا۔"

"ایسی باتیں مت کریں' جو اللہ کو منظور۔" وہ اپنی جگہ کانپ سی گئی۔

"اچھا۔۔۔ یہ فالسے کھاؤ۔ سنا ہے عورتیں ایسی حالت میں کھٹی میٹھی۔۔۔" ان کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے نمبر دیکھا' پھر پلیٹ گل کے ہاتھ میں تھما دی۔

"اس کا شربت بنا لاؤ۔"

وہ پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کیسی ہو جان من۔۔۔"

"تمہارا کام ہو گیا۔۔۔ اب وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔" شائستہ نے تڑخ کر پوچھا۔

ذکی اک طویل سانس لے کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

"تم اتنا اداس کیوں ہو رہی ہو۔" گل نے ان کی ساری پیکنگ چپ چاپ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ کی تھی۔

"مجھے جانا تو تھا ہی۔" ذکی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"مت جائیں۔۔۔ میرا دل گھبراتا ہے۔" وہ اس کے کندھے سے لگ کر سسک اٹھی۔ ذکی نے کوفت سے اسے دیکھا۔ عورتوں کا یہ جذباتی پن انہیں زہر لگتا تھا۔

"جاؤں گا نہیں تو واپس کیسے آؤں گا۔ اتنے مہینوں کی غیر حاضری میں جو حرج اور نقصان ہوا' وہ اگلے پورے سال تک پورا ہو سکے گا۔" انہوں نے بمشکل اپنے لہجے کو نرم رکھا۔

"تو کیا پورا سال نہیں آؤ گے۔" گل نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

"کیوں نہیں آؤں گا' جب بھی تم بلاؤ۔"

"ذکی! میں اکیلی۔۔۔"

"اکیلی.... سب گھر والے تمہارے پاس ہیں' اکیلی تو وہاں شائستہ ہے' دیکھو' کتنے دنوں سے میرے بغیر تنہا وہاں رہ رہی ہے۔"

گل کے سارے جذبوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ کر آنسو صاف کرنے لگی تو وہ سکون کا سانس لے کر کھڑے ہو گئے۔

"آؤ.... نیچے سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔"

دونوں ساتھ ساتھ نیچے اتر آئے۔ جہاں سب گھر والے جمع تھے۔ پھوپھو' بیٹے کو گلے لگا کر رو دیں۔

"اتنے سالوں کے بعد شکل دکھائی' اب ایسا نہ کرنا۔"

بڑے ابا نے آگے بڑھ کر بہن کو پیچھے ہٹایا اور آہستگی سے بولے۔

"اب تم پر دہری ذمہ داری ہے بیٹا! ان میں توازن رکھنا۔"

"ماموں! آپ بالکل فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

کچھ دن قبل ہی وہ گل کو لے کر بینک گئے تھے۔ اس کے نام اکاؤنٹ کھلوایا تھا کہ گل کے خرچے کے لیے وہ الگ سے رقم بھجوائیں گے۔ سب سے مل کر بیلا کے سامنے رکے' جو گل کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔

"اچھا بیلا رانی! تمہیں ہم سے بہت شکایتیں سہی.... پر اپنی امانت چھوڑے جا رہا ہوں۔ میری مسز کا خیال رکھنا۔"

اور بیلا سب کچھ بھول کر ان کے بازو سے آ لگی' وہ ہنس دیے۔

"شکر ہے' تمہارا اعتبار تو جیتا۔"

اک جذباتی سے سین کے بعد وہ گھر سے روانہ ہوئے۔ گل پلٹ کر ماں کے کمرے میں جا گھسی۔ فیضان انہیں چھوڑنے جا رہے تھے۔ باقی سب کو انہوں نے خود ہی ایئرپورٹ آنے سے منع کر دیا تھا۔ یوں وہ جس طرح اچانک آئے تھے' اسی طرح لوٹ گئے۔ گل کے پاس پہلے ان کا انتظار تھا اور اب بھی....

بس یہ تھا کہ اب اس انتظار میں وہ تنہا نہ تھی۔ اپنے اندر سانس لیتے وجود کا احساس اسے دسراہٹ دیتا۔

گل کے لیے نہ سہی' ذکی کو اپنے بچے کے لیے تو لوٹ کر آنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تیمور احمد کہتے ہیں۔"

وہ دونوں ابھی انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکلی ہی تھیں' جب سر تیمور عین سامنے آ کھڑے ہوئے۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر زیبا بولی۔

"جی ہم جانتے ہیں۔" سر تیمور کو یہ انسٹی ٹیوٹ جوائن کیے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ وہ ینگ تھے اور اسمارٹ بھی' سو لڑکیوں میں خاصے مقبول بھی تھے۔

"دراصل یہ بات ایسی نہیں کہ یوں سر راہ کی جائے۔ مگر مجبوری ہے' میں بلاوجہ آپ کو اپنے آفس میں بلانا نہیں چاہتا۔ دراصل میں مس رابیل کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہتا ہوں' اگر یہ کہیں انگیجڈ نہ ہوں تو۔" سنجیدہ چہرہ' پر متانت لہجہ' دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔ خصوصاً بیلا کا تو اچھا خاصا منہ کھل گیا تھا۔

"آئی ایم سوری' شاید آپ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔" وہ ان کے رد عمل پر شرمندہ ہو گئے۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" بالآخر زیبا سنبھلی۔ "دراصل ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں ہوتے۔" وہ بیلا کا ہاتھ پکڑ کر آگے نکل گئی۔ جبکہ وہ حسرت زدہ چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔ بیلا کچھ دیر خاموشی سے چلتی رہی' پھر ایک دم ہنس پڑی۔

"خیریت...." زیبا ٹھٹک کر رکی' جبکہ وہ ہنستی چلی گئی' پھر بمشکل بولی۔

"اسی لیے میں گھر سے باہر نہیں نکلتی' لوگ دیدہ و دل فرش راہ کیے رہتے ہیں۔

لوگ کیا کریں' حسن جہاں سوز کی تاب لانا ممکن کہاں؟"

"اتنا مت پھیلو...." زیبا نے برا سا منہ بنایا۔ "سر تیمور کی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔"

"تب ہی تو نظر نزدیک نہیں دور پڑی ہے۔" وہ مزید اٹھلائی کہ زیبا ان کی اسٹوڈنٹ رہ چکی تھی۔

"لیکن سنو! تم نے منہ پھاڑ کر انکار کیسے کر دیا۔" بیلا کے قدم ایک دم رکے۔

"کیونکہ بڑی بہن ہونے کے ناتے مجھے پتا ہے' تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔"

"اچھا تو کیا یہ پرپوزل میرے لیے اچھا نہیں تھا۔" بیلا نے مایوسی سے پوچھا۔

"سر تیمور کی طرح تمہاری بھی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔" زیبا کہہ کر رکی نہیں۔ پوائنٹ کی طرف بڑھ گئی' جبکہ اس کا جملہ بیلا کے سر پر سے گزر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں گھر میں نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھول بھال گئی۔ فیضان نے اچانک ہی باہر جانے کا اعلان کر دیا۔ سب ششدر رہ گئے۔ بالا ہی بالا سارے انتظامات کر کے انہیں صرف بتایا جا رہا تھا۔ مارے صدمے کے بڑے ابا کچھ بول ہی نہ سکے۔ فیضان سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"میں بہت مجبور ہو گیا ہوں ابو.... سونیا...." انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا' اب ساری وضاحتیں بے کار تھیں۔

بڑی امی پھپک پھپک کر رونے لگیں۔

"آخر تمہاری سسرال کا رنگ تم پر چڑھ ہی گیا۔ مجھے تو اسی دن سمجھ جانا چاہیے تھا' جب اس بڑے گھر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ جب پرندے اڑان بھرنا سیکھ لیں تو انہیں گھونسلوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں نئی پرواز بھرنے دیں بھائی صاحب!" ابو نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھائی۔ فیضان سرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھ گئے۔ یہ تو وہ ہی جانتے تھے کہ وہ یہ فیصلہ کس مجبوری میں کر رہے تھے۔ یہ ان کی اولاد کے مستقبل کا سوال تھا۔ ورنہ سونیا نے علیحدگی کی دھمکی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

عجیب سی بے چینی تھی' جو اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اے سی کی خنکی کے باوجود پسینے میں نہائے جا رہی تھی۔ اچانک لگا' دم گھٹ رہا ہے۔ کمرے میں آکسیجن کم ہے۔ اس نے گردن موڑ کر پاس سوئی پھوپھو کو دیکھا۔ وہ منہ کھولے ہولے ہولے خراٹے لے رہی تھیں' وہ اٹھ بیٹھی۔ دو گھونٹ پانی پیا' پھر چپل پہن کر باہر نکل آئی پھر کمر پر ہاتھ رکھے ہولے ہولے چکر لگانے لگی۔

اوائل جون کی رات تھی' مگر خوش گوار.... اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آدھے چاند کو دیکھا' جو تھا تو ادھورا مگر بے حد روشن تھا۔

کتنے موسم بیتے۔

ساون' پت جھڑ' سرما اپنی گلابی ٹھنڈک بانٹ کر چلا گیا۔

اب پھر سے وہ ہی موسم ہے' جب تم لوٹ کر آئے تھے۔

جب تم نے مجھے اپنا بنایا۔

میرے ادھورے وجود کو اپنی روشنی سے بھر دیا۔

"اب آ جاؤ پھر سے آ جاؤ' درد کے اس صحرا کو میں اکیلے کیسے پار کر پاؤں گی۔"

اس کے وجود میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس پورے عرصے میں ذکی کے فون متواتر آتے رہے تھے مگر انہوں نے کبھی گل کا حال نہ پوچھا تھا۔ ان کی ساری فکریں اپنے بچے کے گرد گھومتیں اور آخر میں کہتے۔

"میری امانت کا خیال رکھنا۔"

گل کا جی چاہتا! وہ کبھی تو پوچھے۔ "میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ تمہاری زندگی میں میری حیثیت کیا ہے؟"

مگر سارے سوال اندر ہی سر پٹختے رہ جاتے' اسے سوال جواب کی عادت ہی کہاں تھی۔ کبھی لگتا یہ گزرا

وقت اک حسین خواب کے سوا کچھ بھی نہیں' ابھی آنکھ کھلے گی اور.... وہ سہم جاتی' مگر اس کے وجود میں ہوتی آہٹیں بتاتیں یہ سپنا نہیں حقیقت ہے۔
درد کی اک لہر اٹھی' اس نے لب بھینچ کر دیوار سے سر ٹکا دیا۔ ایک پل کو لگا اک بھاری گرم ہاتھ اس کی پیشانی پر آرکا ہو۔
وہ ہلکا سا مسکرائی' لیکن....
درد کی انتہا پر اس نے خدا کے بعد اسی کو پکارا تھا۔
پھوپھو ہڑبڑا کر جاگیں۔

☼ ☼ ☼

ابرار کے لیے وہ ننھا سا وجود عجیب کشش رکھتا تھا۔ وہ بار بار اپنی انگلی سے اس کی آنکھ کی پتلی چھو کر دیکھنا چاہتا۔ وہ خود اس کے گلابی روئی سے پیروں کو گدگدا کر خوش ہو رہی تھی۔ فیضان کے بیٹے کی تو صرف تصویریں دیکھنے کو ملی تھیں' مگر یہ جیتا جاگتا کھلونا تو سب کے ہاتھوں میں سفر کر رہا تھا۔ ہر کوئی اسے گود میں لے کر بیٹھنا چاہتا' بڑی امی شکرانے کے نفل پڑھتے نہ تھکتیں' انہیں لگتا ان کی بیٹی' ماں بن کر معتبر ہو گئی ہے۔ پھوپھو پورے خاندان میں مٹھائی بانٹ رہی تھیں۔ آخر ان کا پہلا پوتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پورے دس سال کے بعد نوازا تھا۔ ذکی بھائی کو اسی وقت فون کیا گیا۔ نیٹ پر بچے کی تصویریں بھیجی گئیں۔ عاشر کو سب سے پہلے بیلا کا پیغام ملا کہ وہ چچا بن گیا ہے۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائے۔ ذکی کی بھی یہ ہی کیفیت تھی۔ انہوں نے گل سے بھی بات کی اور پہلی دستیاب فلائٹ سے آنے کا وعدہ بھی۔

☼ ☼ ☼

فہد نے واپس آکر پاکستان میں ہی جاب شروع کی تو سب نے سکون کا سانس لیا۔ زیبا نے کورس ادھورے چھوڑ کر شادی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اپنے ملبوسات خود ڈیزائن کر رہی تھی' سو مصروف تھی۔
کہاں ذکی کہتا تھا کہ بس بھاگا آ رہا ہوں اور کہاں تین ماہ گزر گئے' آنے کا نام ہی نہیں۔ بیلا ابھی واپس آئی تھی' بیگ جرنل ایک طرف رکھ کر جوتے اتارنے لگی۔
"باہر کے سو بکھیڑے' اب ہم ان چکروں کو کیا جانیں۔" بڑی امی بس اسی بات پر راضی تھیں کہ بیٹی شادی شدہ بھی تھی اور اولاد والی بھی۔ اس سے آگے وہ سارے سمجھوتے بخوشی کرنے کو تیار تھیں۔ بیلا ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتی گل کے کمرے میں چلی آئی۔ واپس آکر جب تک صائم کو نہ دیکھ لیتی بچین نہ پڑتا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
"ارے تم کب آئے؟"
وہی بے ساختہ خوشی جو عاشر کی ساری تھکن مٹا دیتی۔ وہ جو منے کو سینے پر لٹائے اسے گدگدا رہا تھا' سیدھا ہو بیٹھا۔ بیڈ پر وہ تمام کھلونے بکھرے تھے' جو وہ صائم کے لیے لایا تھا۔
"اس بار کتنے مہینوں کے بعد آئے ہو۔"
"بہت ٹف ڈیوٹی ہے محترمہ! چھٹی بالکل نہیں ملتی۔"
"تم تو کال بھی ریسیو نہیں کرتے۔"
"بتایا نا.... تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟" وہ صائم کے ننھے منے ہاتھوں کو تھام کر تالی بجوا رہا تھا اور صائم کھلکھلا رہا۔ بیلا پاس بیٹھ کر دلچسپی سے دیکھنے لگی۔
"وہ ہی کچھ' تمہیں اپنا بھتیجا کیسا لگا؟"
"یہ میرا تمہارا کیا ہوتا ہے۔" عاشر نے جس لہجے میں پوچھا' بیلا شرمندہ سی ہو گئی۔
"باری! میرے پاس آؤ' کہو آنی گندی ہے' چاچو چاکلیٹ دے گا۔" ابرار نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ آنی کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا اور چاچو کبھی کبھار نظر آنے والا چاند' سو وہ آنی سے لپٹ گیا۔
"دیکھا جو ہم سے پیار کرتے ہیں' وہ پارٹی نہیں بدلتے۔" وہ اترائی۔
"بدل کر جائیں گے کہاں؟" عاشر بڑبڑایا۔ تب ہی صنوبر واش روم سے باہر نکل آئی۔
بیلا آ گئی ہو' کھانا کھالیا؟ جیسے سوال کرنے لگی' عاشر نے محسوس کیا' گل اب پہلے کی طرح گم صم نہیں رہتی



تھی۔ اس کی شخصیت میں اعتماد کی جھلک دکھائی دیتی۔ ضرورت کے مطابق اچھے طریقے سے بات چیت کرتی۔
"میں صائم سے ملنے آئی تھی' یہ تو چاچو کی گود سے ہی نہیں نکل رہا۔"
"میں کھانا گرم کرتی ہوں' تم دونوں آجاؤ۔ عاشر نے بھی نہیں کھایا۔" وہ باہر نکل گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے بیلا نے عاشر کو گزرے تمام دنوں کی روداد سنائی۔ اس نے کھانا کم کھایا اور بیلا کو سنا اور دیکھا زیادہ تھا۔ لیکن اس کے دیکھنے میں اتنی سادگی تھی کہ بیلا کو کبھی کچھ خاص محسوس ہی نہ ہوا۔
یہ ہی چہرہ ہے' میری محبت کا خوب صورت چہرہ' جو پُر خطر گھڑی میں مجھے زندگی کی طرف کھینچ لیتا ہے۔
یہ ہی آواز ہے' میری محبت کی آواز' جو ہر تاریکی میں روشنی بن کے چمکتی ہے۔
اے خدا! میری محبت کا چہرہ یوں ہی جگمگاتا رہے۔
اس کی آواز کی خوشبوئیں یوں ہی میرے وجود کے گرد اپنا حصار باندھے رکھے۔ جدائیوں کی خلیج کبھی ہمارے درمیان حائل نہ ہونے پائے۔
"میں پوچھ رہی ہوں' تمہارا ذکی بھائی سے کوئی رابطہ ہے یا نہیں۔ چار ماہ ہو گئے ہیں۔ وہ آ کیوں نہیں رہے۔"
"میرا خیال ہے تم تصور میں زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔" وہ بھنا کر بولا۔
"اس بات کا مطلب؟" بیلا نے بھینچ کر گھورا۔
"کچھ نہیں۔ آج فون کرتے ہیں بھائی کو۔" عاشر نے بدمزا سا ہو کر پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

نومبر کی رعنائیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ وہ ایک خوب روشن اور چمک دار سا دن تھا۔ بڑی امی نے صائم کو نہلا دھلا کر سفید کڑھائی والا کرتا پاجامہ پہنا کر پرام میں بٹھایا تھا۔ اب وہ خوب آوازیں نکالتا' ہنستا' مانوس چہرے دیکھ کر کلکاریاں مارتا۔ سیفٹی بیلٹ لگا کر وہ فیڈر لینے کچن میں چلی گئیں۔ وہ اپنے سامنے اک اجنبی چہرہ دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر جھک کر ہولے سے اس کے گلابی پھولے پھولے گالوں کو چھوا۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ ان کا اپنا بیٹا ہے اور وہ اتنے ماہ اس سے دور کیسے رہ لیے۔ صائم کھلکھلا اٹھا۔ انہوں نے بے اختیار اٹھا کر اسے سینے میں بھینچ لیا۔ اندر باہر لگی آگ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسی۔
"ذکی....." اپنی دھن میں باہر آتی بڑی امی ٹھٹک کر رکیں۔ آن واحد میں سب گھر والے جمع ہو گئے۔ وہ اکیلے نہیں تھے۔ ساتھ شائستہ بھی آئی تھی۔ پھوپھو نے وہیں ان کے لتے لینے شروع کر دیے۔ صنوبر نہا کر نکلی تھی۔ جب بیلا نے اطلاع دی۔ گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے وہ تھم سی گئی۔ پھر تولیہ ایک طرف رکھ کر سر پر دوپٹہ لیتی باہر آ گئی۔ پہلی نظر شائستہ پر پڑی اور شائستہ کی اس پر' شائستہ ٹھٹک سی گئی۔
یہ کیسی روشنی اور ملاحت تھی جو گل کے چہرے کو تابناکی بخش رہی تھی۔ کیا ماں بننے کا فخر و غرور ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو سر تا پا بدل دے۔
گل ذکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"کیسے ہیں؟"
"ہوں..... ٹھیک ہوں۔" نہ جانے کیوں جواب دیتے ہوئے وہ نظریں چرا گئے۔
بیلا نے کچھ حیرت سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا پہن رہی ہیں؟" بیلا نے اس کے ہاتھ سے براؤن سوٹ لے کر ایک طرف رکھ دیا اور خود وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سرخ کڑھائی والا سوٹ نکال لیا' جس کے دوپٹے پر بہت خوب صورت بیلیں کڑھی ہوئی تھیں۔
"آپ یہ پہنیں گی' ہر وقت رب کو راضی کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ آخر وہ بھی آپ کے مجازی خدا

ہیں۔"

"پگلی۔۔۔ اگر رب راضی ہو جائے تو۔۔۔"

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ اتنے عرصے کے بعد ذکی بھائی آئے ہیں، آپ بن سنور کر رہا کریں اور ہاں یہ پیغام میرا نہیں، آپ کی ساس کا ہے۔" اس نے صائم کو گود میں بھر لیا۔

"اسے لے جا رہی ہوں، آپ اچھی طرح تیار ہو کر آئے گا۔" وہ تیز تیز کہتی باہر نکل گئی۔ گل نے کپڑے اٹھا کر دیکھے، پھر ڈریسنگ روم میں چلی گئی، ذکی بھائی، صائم کے لیے بہت سامان لائے تھے۔ شائستہ دو دن یہاں رکی، پھر اپنے میکے چلی گئی۔

"تم گل کے لیے کیا لائے ہو۔" نہ جانے کیوں ماں نے ایسا سوال کیا تھا۔ ذکی گڑبڑا سے گئے۔ کتنی عجیب بات تھی، صائم کے لیے بہت کچھ خریدتے ہوئے ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ انہیں گل کے لیے بھی کچھ خریدنا چاہیے۔ وہ ان کی بیوی ہی نہیں بچے کی ماں بھی تھی۔

ماں کچھ لمحے بیٹے کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اک طویل سانس لے کر اٹھیں۔ الماری کھول کر ایک سرخ کیس نکالا، پھر ذکی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"یہ صنوبر کو دے دینا، مت بتانا کہ میں نے دیا ہے۔" ذکی نے کھول کر دیکھا، وہ اک خوب صورت لاکٹ سیٹ تھا۔

"ذکی! دو بیویاں، بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ ان میں انصاف اور توازن رکھو، پھر گل تو تمہارے بچے کی ماں بھی ہے۔ اس کا پلڑا یوں بھی بھاری ہے۔ بیوی کی حیثیت سے نہیں تو صائم کی ماں کی حیثیت سے اسے توجہ اور مان دو۔ ٹھیک ہے اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے، مگر مجھے میرے بھائی کے سامنے تو شرمندہ مت کرو۔"

وہ سرخ کیس پر نظریں جمائے خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔

"جاؤ اسے دے دو، صائم کو میرے پاس بھجوا دو۔" وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتے اپنے بیڈ روم میں آئے۔ صائم وہاں نہیں تھا اور گل آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے بال سلجھا رہی تھی، دوپٹہ بیڈ پر پڑا تھا۔ ماں بننے کے بعد بھی اس کا جسم بے ڈول نہیں ہوا تھا۔ سرخ رنگ میں گوری رنگت دمک رہی تھی۔ گل نے آئینے میں ذکی کا عکس دیکھا۔ کچھ جھینپ کر اپنا دوپٹہ اٹھانے کو مڑی، مگر بغیر دوپٹہ اٹھائے سیدھی ہو کر ذکی کو دیکھنے لگی۔

وہ اس کے شوہر تھے، مگر یوں نظریں پھیرے کھڑے تھے۔ گویا وہ ان کی بیوی نہیں کوئی نامحرم ہو، حالانکہ وہ بہت مہینوں کے بعد مل رہے تھے اور ایسا پہلی بار نہ تھا۔ وہ جب سے لوٹے تھے، اس سے یوں ہی کترا رہے تھے۔ بیڈ روم میں ہوتے تو صائم میں کھوئے رہتے۔ کوئی صائم کو لے جاتا تو خود بھی بدک کر بھاگ گئے۔

گل کی چھٹی حس جاگنے لگی۔

اس نے ذکی کو بہت انتظار کے بعد پایا تھا۔ اب کھونے کی ہمت نہ تھی۔

وہ قدم قدم چلتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔" یہ اس کی سرشت نہ تھی۔ مگر سامنے کھڑا شخص کوئی غیر نہیں اس کا شوہر تھا۔

"ہوں۔" ذکی نے نظریں اٹھا کر اسے بس ایک ہی پل کو دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا کیس اس کی سمت بڑھا دیا۔

"یہ تمہارے لیے لایا تھا۔"

گل نے نظریں جھکا کر دیکھا۔ اس کے اور ذکی کے بیچ صرف اک کیس کا فاصلہ تھا۔ اگر وہ یہ فاصلہ خود سے پاٹ دے، گل کے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ اس نے ڈبہ پکڑ لیا مگر۔۔۔ ذکی تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئے تھے۔

وہ ششدر سی کھڑی ڈبے کو گھورتی رہی۔

پھر اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

نہ جانے کیوں؟

☼ ☼ ☼

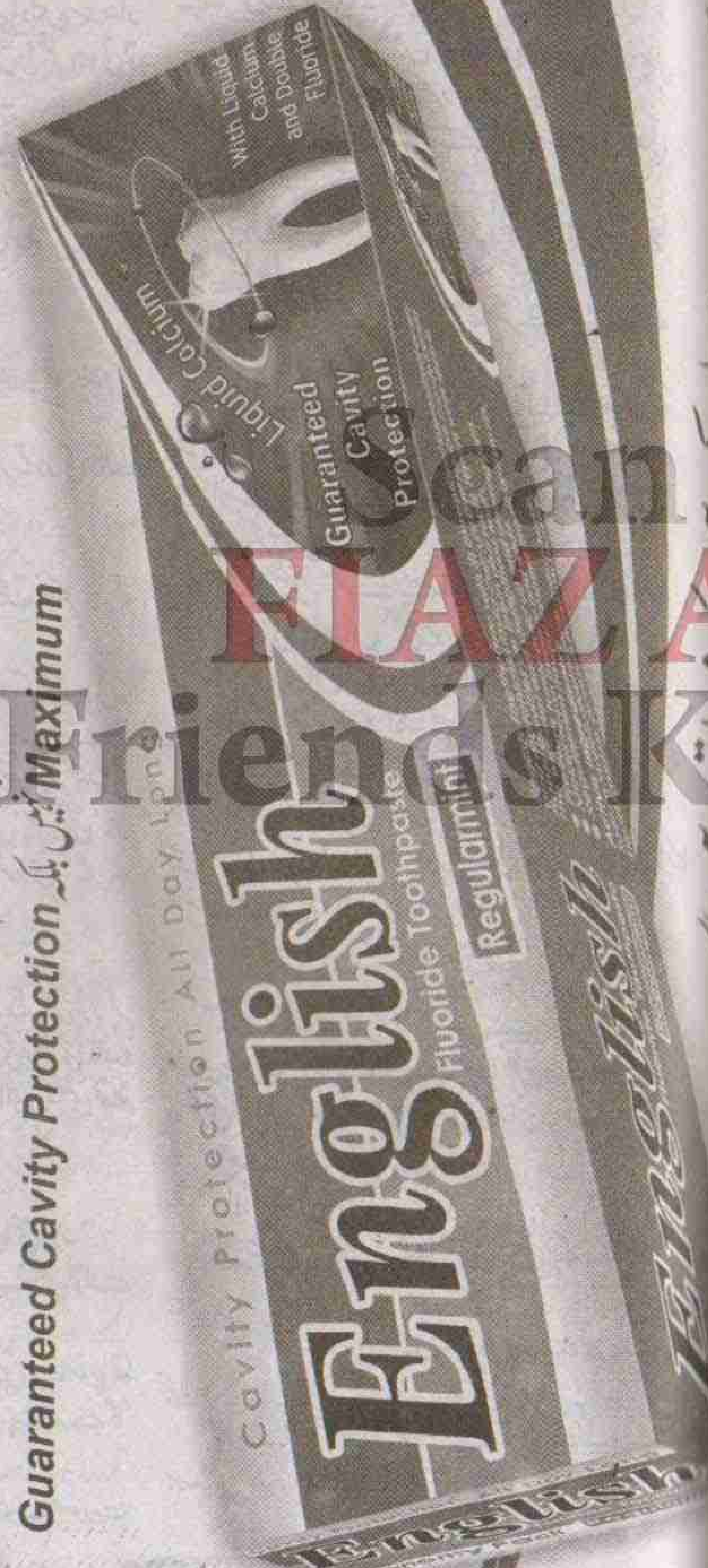

”مجھے تو لگتا ہے، مجھ سے پہلے تم پیا دیس سدھار جاؤ گی۔“ جھنجلائی ہوئی زیبا کمرے میں داخل ہوئی تو بیلا نے رسالہ رکھ کر اس کی سمت دیکھا۔

”اب فہد صاحب نے شادی چند ماہ لیٹ کر دی تو اس میں میرا کیا قصور۔“

”اٹھو، ٹھیک ٹھاک ہی ہو، اٹھ کر مل لو۔“

”کس سے؟“

”اپنی ہونے والی ساس سے۔“

”ہائیں۔“ وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ ”میں ہاتھ منہ دھو لوں۔“

”بکواس مت کرو، وہ بیٹھی ہیں، سر تیمور کی والدہ محترمہ۔“

”ارے... انہیں تو تم نے...“

”بھگا دیا مگر انہیں پتا چلا کہ تم اب تک سنگل ہو تو قسمت آزمانے کو اماں بھیج دی۔“

”تو تم کیوں جل بھن رہی ہو۔“ وہ کھلکھلائی۔ آئینے کے سامنے بال ٹھیک ٹھاک کیے۔ کپڑے تو تھوڑی دیر قبل ہی نہا کر تبدیل کیے تھے، پھر گنگناتی ہوئی کچن میں سنبعہ بھابھی کے پاس چلی گئی، جو مہمانوں کے لیے چائے کا بندوبست کر رہی تھیں۔ جبکہ زیبا سر پکڑ کر رہ گئی۔

”یا اللہ! کیسی بے خبر لڑکی ہے۔“

مہمانوں کے جانے کے بعد گھر والے سر جوڑ کر غور و خوض کرنے لگے۔ کیونکہ سر تیمور کی والدہ باقاعدہ، رشتہ ڈال گئی تھیں۔ ظاہر ہے جب بیٹا ہی راضی تھا تو انہیں کیا اعتراض ہوتا۔

عاشر کو زیبا نے فون کیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم اچھی طرح جانتی ہو۔“

”میں جانتی ہوں، مگر وہ احمق... تم نے بھی تو اسے کچھ نہیں بتایا۔“

”اس کی کچھ سمجھ میں بھی تو آئے، میں نے سوچا تھا اس احمق اور اول جلول سی لڑکی کو کون پسند کرے گا، سوائے میرے۔“

”وہ اول جلول لڑکی اچھی خاصی خوب صورت ہے۔“ زیبا نے جتایا۔

”اچھا... مجھے تو کبھی نہیں لگی۔“ وہ ہنسا۔

”پھر خوامخواہ دل ہارے پھر رہے ہو۔“

”وہ تو بچپن سے اسے دیکھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔“

”خیال رہے، عادتیں بدلی بھی جا سکتی ہیں۔“ زیبا نے دھمکی دی۔

”ہاں... مگر محبتیں نہیں۔“ عاشر نے دھیرے سے کہہ کر لائن کاٹ دی۔

”سنو! گھر والوں نے سر تیمور کو کیا کہا۔“ شام کو بیلا بڑی رازداری سے زیبا سے پوچھ رہی تھی۔

”بہت جلدی ہے تو کل ہی نکاح پڑھوا دوں؟“ زیبا جل بھن کر رہ گئی۔

”ہائے نہیں، تم سے پہلے اچھی لگوں گی؟“ وہ شرما گئی۔ زیبا بس مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔ گھر میں کچھ دن پراسرار سرگرمیاں چلتی رہیں۔ باوجود کن سوئیاں لینے کے بیلا کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ پھر پتا چلا سر تیمور کو انکار کر دیا گیا ہے اور ایک شام پھوپھو نے اسے دبوچ کر خوب بلائیں لیں۔ پانچ ہزار ہاتھ پر رکھے۔ مٹھائی منہ میں ٹھونسی... وہ نوٹ ہاتھ اور مٹھائی منہ میں لیے ہکا بکا سب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

”مجھے لگتا ہے میں دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہوں۔“ بیلا نے کان سے موبائل ہٹا کر گھورا... عاشر کی اس ٹون کو ہضم کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

”اچھا...“ بیلا کو گویا شک تھا۔

”بیلا! تم خوش ہو؟“

”ہاں بہت۔“ اس نے عاشر کی تسلی کے لیے کہہ دیا۔

”لیکن مجھ سے زیادہ نہیں۔“ وہ پورے وثوق سے بولا۔

”ہاں... تم تو تھوڑا تھوڑا کھسکے ہوئے لگ رہے ہو۔“



”بیلا! تم نیند میں ہو؟“ کچھ چپ رہنے کے بعد عاشر کو پوچھنا پڑا۔

”نہیں... نہیں... میں تو پوری طرح جاگ رہی ہوں۔“ اس نے بدقت جمائی روکی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اچھا خاصا خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی، جب عاشر کی کال آئی۔

”بیلا! چاند کیا کہہ رہا ہے۔“

”چاند...“ بیلا نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ چودھویں کا چاند عین دیوار پر کسی چوڑے تھال کی طرح پڑا تھا۔ ”کانسی کا ایسا تھال جسے اچھی طرح مانجھا نہ گیا ہو۔ اف بیلا کی بچی! بری پھنسی، زیبا کے موبائل سے چند رومانٹک اشعار ہی چرا لیتی۔ ساری زندگی تو عاشر کو عاشر سمجھ کر بات کی، اب منگیتر سمجھ کر بات کیسے کروں۔“

”کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرہ تیرا“

”ہائے اللہ! ایسا داغ دھبوں سے بھرا چہرہ... عاشر! لگتا ہے تم نے مجھے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔“ وہ بدک کر بولی۔

”میں نے تو ساری عمر تمہارے سوا اور کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ پتا ہے جب تم پالنے میں تھیں...“

”پالنے میں؟“ وہ چلائی۔

”مطلب... جب تم پاؤں پاؤں...“

”گویا تمہاری نیت بچپن سے ہی خراب تھی۔“

”تم چپ کر کے اظہار محبت نہیں سن سکتیں؟“

”تم نے ہی پالنے اور پاؤں پاؤں چلنے کا ذکر شروع کر دیا۔ گویا کسی بے بی ہو کا اشتہار ہو۔“

”تم انتہائی بے ہودہ لڑکی ہو اور جب میں نے کتاب میں پھول رکھا تو...“

”اچھا تو وہ فضول حرکت تمہاری تھی؟“

وہ ایک پل کو بالکل خاموش ہو گیا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بیلا! میرا دل چاہتا ہے، سامنے والی دیوار سے سر ٹکرا دوں۔“

”تمہارے پاس بینڈیج کا سامان تو ہے نا۔“ اس نے ازراہ احتیاط دریافت کیا۔

”بیلا! میں جا رہا ہوں۔“

”ٹکر مارنے؟“

”اوہ یو شٹ اپ۔“

”اچھا عاشر! غصہ مت کرو۔ وہ ایسا ہے کہ میں بچپن سے تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے دیکھتی آئی ہوں۔ اب ایک دم منگیتر کی حیثیت سے تمہاری رومانٹک گفتگو مجھے ہضم نہیں ہو رہی، اب تھوڑا ٹائم تو...“

”گڈ نائٹ بیلا! اور ہو سکے تو اس رشتے کی خوب صورتی اور لطافت کو محسوس کرنے کی کوشش کرنا۔“

لائن کٹ گئی تھی۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے بیٹھی رہی، پھر عقب میں جھولے پر سر ٹکا کر پورے چاند کو دیکھنے لگی۔ خنک ہوا میں موتیا و چنبیلی کی باس گھلی ملی تھی۔ خوشبوؤں سے بوجھل رات ہولے ہولے سرگوشیاں کرنے لگی، وہ ہولے سے مسکرائی۔

”میں اتنی بھی بے وقوف نہیں عاشر صاحب کہ اس رشتے کی لطافت و خوب صورتی کو محسوس نہ کر سکوں۔“

اس نے نظروں کا زاویہ بدلا تو نگاہوں میں کھلی کھڑکی میں ایستادہ وجود آ گیا۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

”ذکی بھائی! نیند نہیں آ رہی؟“ اس نے ننگے پاؤں نیچے گھاس پر رکھے۔ وہ کچھ نہیں بولے، البتہ کھڑکی سے ہٹ گئے تھے۔ بیلا الجھ سی گئی۔

☼ ☼ ☼

”امی! آپ کو نہیں لگتا، ذکی بھائی کچھ پریشان اور الجھے ہوئے ہیں۔“ بیلا کو عادت تھی، جو دل میں ہوتا فوراً ”اگل دیتی۔ امی نے گھور کر اسے دیکھا۔

”سوچتی ہوں، زیبا کے ساتھ اس کی بھی شادی کر دوں۔“ سب نے اس غیر متوقع بات پر انہیں حیرت سے دیکھا۔

"کم از کم میرے سر سے یہ بلا تو ٹلے۔"

"ہا... ہا... شادی کے بعد بھی یہ بلا آپ کے سر رہے گی۔ آخر مجھے جانا ہی کہاں ہے؟" وہ کھلکھلائی، بڑی امی ہنس دیں۔

"بھئی، یہ تو اس گھر کی رونق ہے اور کہتی بھی ٹھیک ہے۔ نہ کوئی ہنسی، نہ مذاق، جب سے آیا ہے یوں ہی سنجیدہ سا اندر باہر پھرتا ہے، حالانکہ بیٹے کی خوشی میں تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگنے چاہییں تھے۔"

"میں پھوپھو سے پوچھوں گی۔"

"خبردار... تمہیں کوئی ضرورت نہیں دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔" امی نے گھرکا۔ "اور یہ بھی یاد رکھو، تمہارا ان کے ساتھ اب دُہرا رشتہ ہے، سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔"

"اسی لیے تو ان کے تمام مسائل کو میں اپنے مسائل سمجھتی ہوں۔" بیلا اترائی، تو وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"کیا کروں اس لڑکی کا، زیبا بھی تو ہے، موقع محل، حساب کتاب دیکھ کر بات کرتی ہے، اسے تو پتا ہی نہیں چلتا کون سی بات کہاں کرنا ہے۔"

"اچھا... وہ کون سا غیروں میں جا رہی ہے، یہیں آنکھوں کے سامنے رہے گی۔"

"اٹھ کر کچن دیکھو، منیحہ اکیلی لگی ہوئی ہے۔" امی نے حسب دستور اسے مصروف کرنا چاہا۔

"لیکن میری بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔" بیلا کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ماں کے تیور دیکھ کر کچن میں بھاگی اور بڑی اماں کو اور کچھ ہو نہ ہو، بیلا کی باتوں پر یقین ضرور تھا، تب ہی صنوبر کو بلا کر پوچھنے لگیں۔

"ذکی ٹھیک تو ہے، کچھ پریشان ہے، تمہیں کچھ بتایا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں امی! سب ٹھیک ہے۔" گل نے آہستگی سے کہہ کر بات پلٹی۔

"اللہ کرے، سب ٹھیک ٹھاک ہی رہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ جھولے پر بیٹھے بالکل خاموش اور کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ ماتھے پر گہری ہوتی شکنیں ان کی پریشان خیالی کی غماز تھیں... تب ہی ان کا سیل فون گنگنا اٹھا... انہوں نے چونک کر اسکرین پر چمکتے نام کو دیکھا۔ پھر اک طویل سانس لے کر آن پر انگلی رکھ دی۔

"تم نے گل سے بات کی...؟" شائستہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"نہیں، لیکن میں جلد ہی..."

"کیا جلد ہی... ذکی ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کتنے دنوں سے تم اس کے گھٹنے سے لگے بیٹھے ہو، ابھی تک بات نہیں کر سکے۔"

"شائستہ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں... تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، خاص طور پر وہ بات جس میں تمہارا فائدہ ہو۔" اس کے استہزائیہ لہجے پر ذکی لب بھینچ کر رہ گئے۔

"بہرحال تم آج ہی اس سے بات کرو... حتمی اور نتیجہ خیز بات..."

اسکرین بجھ گئی... مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ شام گرد آلود ہو رہی تھی...

"آندھی آئے گی۔ لڑکیوں! سمیٹا سمیٹی کر لو۔" بڑی امی کی آواز آئی۔ ذکی نے سر اٹھا کر گہرے ہوتے آسمان کو دیکھا۔

"سفیان! ذکی تمہیں بتا کر گیا ہے۔" ماں کی آواز اوپری صحن سے ابھری۔ وہ اٹھے اور چوروں کی طرح کچن کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔

"فہد کی امی کا فون آیا ہے، کہہ رہی تھیں شادی کی تاریخ طے کر لیں۔" وہ سب کی نظروں سے بچ کر اوپر جانا چاہتے تھے۔

"امی! پہلے دروازے کھڑکیاں بند کر لیں۔" بیلا کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔ گل بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ انہیں دیکھا تو دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

"طوفان آنے والا ہے۔" بلا ارادہ ذکی کے منہ سے نکلا۔

"ہاں... آندھی کے آثار ہیں۔ کھڑکی تو بند کر دیں۔"

ذکی نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی... کچھ لمحے متذبذب سے بند کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے۔

"آپ کچھ پریشان ہیں۔" گل کو پوچھنا ہی پڑا۔

"ہوں، نہیں۔" ان کے اندر سگریٹ کی طلب اٹھی۔ جسے دباتے ہوئے وہ اس کے قریب آ بیٹھے... گل سمٹ سی گئی۔ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ انہوں نے احتیاط سے اس کا سر ہٹاتے ہوئے قمیص برابر کی... ذکی آہستہ آہستہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ گل کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ آج بہت دنوں کے بعد وہ یوں اس کے قریب بیٹھے تھے۔ تب ہی انہوں نے اچانک پوچھا۔

"گل! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟"

گل کی سمجھ میں نہ آیا وہ کون سا پیمانہ ہو جس سے وہ اپنی محبت ناپ کر بتا سکے۔ ذکی نے آہستگی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"بہت۔" گل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"محبت قربانی مانگتی ہے۔" انہوں نے ایک بازو پھیلا کر اسے خود سے اور قریب کر لیا۔

"کیسی قربانی؟" گل کا دل دہل سا گیا۔

"دے سکو گی؟" ذکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیسی قربانی؟" گل نے دہرایا... اس کا لہجہ اور آنکھیں دونوں خوف زدہ تھیں۔

"صائم مجھے دے دو..."

بہت زور کی آندھی اٹھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ اک آواز سے کھل کر دیواروں سے ٹکرائے۔

"مجھے اور شائستہ کو... یہ وہاں امریکہ میں پلے گا... وہاں کی نیشنلٹی ملے گی... کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ اس کا بہتر مستقبل..."

"اور میں..." گرد کا طوفان بیڈ روم میں گھس کر ہر شے کو آلودہ کرنے لگا۔

"تم دوبارہ ماں بن سکتی ہو... صائم کے بعد اور بچے بھی ہوں گے... میں آتا جاتا رہوں گا۔"

گل نے بے یقینی سے ذکی کو... پھر سر جھکا کر گود میں سوئے بچے کو دیکھا اور اسے ایک دم سے سینے میں بھینچ لیا... اور تیزی سے دور ہٹ گئی۔

کوئی... اپنا کلیجہ نوچ کر کسی دوسرے کو دے سکتا ہے...؟ پھر ایک ماں سے اس کی اولاد... یہ کیسا سنگ دل انسان تھا... وہ لب بستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"خدا کے لیے گل... تمہیں تو اللہ سے بہت محبت ہے، اسی کی خاطر۔ ہماری طرف دیکھو۔ ہم نے اک طویل عرصہ اولاد کے لیے ترستے ہوئے گزارا ہے... تم عورت ہو، اس عورت کی محرومی محسوس کرو، جو کبھی ماں نہیں بن سکتی... تمہیں اللہ اور اولاد دے گا۔ یہ بچہ ہمیں دے دو... میں اس کے بدلے تمہیں کچھ بھی دینے کو تیار ہوں... تم کہو تو یہ گھر تمہارے نام کر دوں... اس گھر میں جو حصہ ہمارا ہے، وہ میں تمہیں دے دوں گا اس کے علاوہ بھی..." وہ فریاد کر رہے تھے... رو رہے تھے اور گل کا دل چاہ رہا تھا۔ اپنے بچے کو کلیجے سے لگا کر یہاں سے دور بھاگ جائے... اسے ذکی سے گھن سی آئی۔ وہ اس کا بچہ خریدنا چاہتے تھے۔

"گل!" انہوں نے گل کا پلّو پکڑ لیا... "تم مجھ سے محبت کرتی ہو... تمہیں اسی محبت کا واسطہ... اپنے ذکی کو مایوس مت کرنا۔"

"ذکی! چلے جاؤ۔" وہ بچے سمیت بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ ذکی کے ہاتھ سے اس کا پلّو چھوٹ گیا، وہ کچھ لمحے چہرہ جھکائے یوں ہی بیٹھے رہے پھر آہستگی سے سر اٹھایا تو چہرے کے تاثرات جامد تھے اور بولے تو آواز میں بلا کا ٹھہراؤ...

"ٹھیک ہے... جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے... گل سہم کر پیچھے ہٹی۔

"شائستہ نے مجھے تم سے شادی کی اجازت صرف اسی شرط پر دی تھی کہ میں تمہارا پہلا بچہ اس کی گود میں ڈالوں گا۔ اب یہ نہیں ہوا... تو میں پاکستان میں نہیں

رہتا ہوں کہ جہاں ایک وقت میں دو دو بیویاں رکھ سکوں۔ وہ میرے خلاف کورٹ میں بھی جا سکتی ہے..... بلکہ جائے گی..... سو میرے پاس اس کے سوا اور کوئی آپشن نہیں کہ تمہیں طلاق دے دوں.....“

انہوں نے اتنے آرام اور سکون سے کہا گویا طلاق نہیں کوئی نیا سوٹ دلانے کی بات کر رہے ہیں۔ گل دم بخود ٹکر ٹکر ذکی کا چہرہ دیکھتی رہی..... ہواؤں کی شوریدہ سری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گل کو لگا تیز ہوا اسے اڑائے لے جا رہی ہے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہواؤں میں بکھر رہا تھا اور وہ دم بخود کھڑی تھی۔

”اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بچے کی لیگل کسٹڈی کا کیس کر دوں گا..... کب تک اسے اپنے پاس رکھو گی..... آخر کو اسے میرے پاس ہی آنا ہے۔ فیصلہ تمہارا ہے..... اب دو گی یا طلاق کے بعد.....“

گرد سے گل کی آنکھیں اٹ گئیں۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں.....

بچہ اس کی گود میں زور سے کسمسایا۔

☼ ☼ ☼

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”کیا کھا کر اس سانپ کو جنم دیا تھا..... جو اپنے ہی گھر میں نقب لگانے سے باز نہ آیا۔ اپنے ہی خونی رشتوں کو ڈستے ہوئے اسے ذرا حیا نہ آئی۔“

”کیسا بے غیرت و بے حس انسان ہے۔ اک ماں کی گود سے بچہ چھین کر لے گیا۔“

ہر کوئی بپھرا ہوا تھا..... ذکی سامنے ہوتے تو نجانے کیا کر ڈالتے..... پھپھو گل سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگ رہی تھیں..... حالانکہ اس پورے قصے میں ان کا ذرا بھی ہاتھ نہ تھا۔ انہیں تو رتی بھر خبر نہ تھی کہ بیٹا کیا کچھ سوچے بیٹھا ہے۔ بھنک بھی پڑ جاتی تو کیا ایسا ہونے دیتیں؟

شائستہ اور وہ دونوں ہی غائب تھے اور ان کے موبائل بھی بند تھے۔

”کیوں کیا..... گل! تو نے کیوں اپنا بچہ اسے دے دیا..... ارے کچھ ہمیں بتایا ہوتا۔ آواز تو دی ہوتی..... کیسے اپنا کلیجہ نکال کر اپنی سوکن کو سونپ دیا..... گل! تو انسان ہے یا پتھر.....“ بڑی امی اسی کو دو ہتڑ مارنے لگیں..... جو یوں چپ اور گم صم تھی..... گویا نہ کچھ دیکھتی ہو نہ سنتی اور اس کی چپ سے سب کو خوف آ رہا تھا۔ صبح معمول کے مطابق ہی ہوئی تھی۔ گھر کی خواتین نے رات کی آندھی کی وجہ سے اٹھتے ہی دھلائیاں شروع کر دی تھیں۔ پھپھو نے تشویش سے گل کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ گل نے فجر کے وقت اٹھ کر کمرے کا دروازہ نہ کھولا ہو۔

”ابھی تک سو رہے ہیں۔“ وہ فکر مند تو تھیں مگر کچھ سوچ کر مسکرا دیں۔ تھوڑی دیر میں بیلا اوپر آئی اور آتے ہی دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ صائم کو دیکھے بنا اس کی صبح ہی کہاں ہوتی تھی۔ دروازہ لاک نہ تھا کھلتا چلا گیا وہاں نہ صائم تھا نہ ذکی بس گل کسی بے جان مجسمے کی طرح بیٹھی تھی..... بیلا کے بار بار جھنجھوڑنے پر اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

”وہ صائم کو لے گیا۔“

”کیوں اس بد نصیب کو ستاتی ہو۔ میرا بیٹا ہی ذلیل اور کمینہ نکلا کاش! وہ واپس ہی نہ آیا ہوتا۔“ پھپھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بڑے ابا بے جان سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”لیکن ہم یوں خاموش ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتے..... ہم اس کے خلاف کیس کریں گے ابو..... وہ اتنے چھوٹے بچے کو ماں سے الگ نہیں کر سکتا.....“ سفیان بہت غصے میں تھے۔

”گل بیٹا! اس نے تم سے کچھ کاغذ وغیرہ تو سائن نہیں کروائے.....“ چھوٹے ابو بار بار پوچھ رہے تھے۔ گل نے باری باری اپنے پیاروں کے پریشان چہروں کو دیکھا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے باہر نکلی۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا اور سائیڈ سے جائے نماز اٹھا کر بچھانے لگی..... وہ سب جو کون سے وکیل سے مشورہ کریں، ڈسکس کر رہے تھے۔ ایک دم چپ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔



پھپھو اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔

گل نے اپنا مقدمہ رب کے حضور پیش کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حبس زدہ دنوں کا سلسلہ تھا۔ اداسی گھر کی دیواروں پر مکار بلی کی طرح پھسکڑا مارے بیٹھی رہتی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتا..... کبھی کبھی بڑی امی ضبط نہ کر پاتیں تو سسکیوں سے رونے لگتیں اور بیلا بے حسی سے سوچتی۔

”انہیں تو اور رونا چاہیے۔“

وہ سب کو گل کا مجرم سمجھتی تھی..... ان سب نے مل کر گل کو برباد کیا تھا..... نجانے اسے کس کس پر غصہ تھا کہ سب کام چھوڑے بیٹھی تھی اور پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی..... سنا تھا ذکی کا فون پھپھو کے پاس آیا تھا..... بہت معافی تلافی کر رہے تھے..... پتا نہیں پھپھو نے کیا کہا۔ بیلا کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا..... جو ظلم ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کیسی معافی اور تلافی تو ممکن ہی نہ تھی۔

گل کئی دن بے حس و حرکت جھولے پر پڑی رہی..... بہت دن بخار ہی نہ اترتا تھا..... اس کے اندر رزق کا دریا خشک ہو کر صحرا ہو گیا تھا۔

”اب وہ ڈبے کا دودھ پیتا ہو گا۔“ وہ اپنے خشک سینے پر ہاتھ رکھ کر ہو کتی۔

”کیا وہ شائستہ کو دیکھ کر اسی طرح ہمکتا ہو گا..... جیسے مجھ دیکھ کر۔“

”پتا نہیں وہ اسے شہد بھی چٹاتی ہو گی یا نہیں۔“

قریب ہی آہٹ ہوئی پھر بیلا کی آواز آئی۔

”آپی! کھانا کھا لیں۔“

”یہ سب لوگ مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔“

گل نے بے حد چڑ کر سوچا مگر خاموشی سے اٹھ بیٹھی۔ بیلا نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ شملہ مرچ اور قیمے کا سالن تھا۔ کھیر کی پلیٹ، سلاد رائتہ..... اس نے بے دلی سے نوالہ بنایا۔

”آپی! آپ نے صائم ان کو کیوں دیا؟“ اس سوال کا جواب مل کے ہی نہ دیتا تھا۔

”جاؤ..... بیلا! میرے لیے کھانا مت لایا کرو۔ بھوک ہو گی تو کچن سے لے لوں گی۔“ بیلا کے لاکھ اصرار پر بھی اس نے دوسرا نوالہ نہ توڑا۔ وہ پچھتاتی ہوئی ٹرے کچن میں پٹخ کر کمرے میں آ گئی۔

”بے وقت تذکرہ چھیڑ دیا۔“

”ہر وقت جھنجھلاتی رہتی ہو۔ اس طرح صائم واپس آ جائے گا؟“ زیبا نے ٹوکا۔ اس کے جواب دینے سے قبل ہی بیڈ پر پڑا اس کا موبائل بجنے لگا۔

”عاشر! بار بار کال کر رہا ہے۔“ زیبا غالباً پہلے ہی اس کا نام پڑھ چکی تھی۔ بیلا نے موبائل اٹھا کر آف کیا اور الماری میں ڈال دیا۔ زیبا نے تعجب سے بیلا کے اس طرز عمل کو دیکھا۔

”تم عاشر کو کیوں اگنور کر رہی ہو۔“ بیلا نے جواب نہیں دیا۔ مڑ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

”اس کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔“ زیبا زیر لب بڑبڑائی، پھر اپنے موبائل سے عاشر کا نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

کوئی کب تک بیٹھ کر ایک ہی دکھ کو روئے..... انسانی فطرت ہے۔ سو سب ہی دھیرے دھیرے اپنی اپنی زندگیوں کی طرف پلٹنے لگے۔ اب یہ تو ماں کا دل جانتا ہو گا، جس نے اپنی نیندیں اپنے لخت جگر کی کاٹ میں رکھ دی تھیں اور اب دن رات مصلیٰ پر بیٹھی اپنے رب سے مناجات کرتی تھی۔

سنا تھا کہ ذکی نے گل سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا مگر اس نے انکار کر دیا..... اب کوئی بھی پھاہا اس کے لگائے زخم کو سکون نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے الفاظ گل کے سینے میں انی کی طرح گڑے تھے۔ اس نے ذکی سے محبت کی تھی اور ذکی نے اسے صرف استعمال کیا تھا۔

”کیا رشتوں کو بھی چیزوں کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟“ عاشر کو چھٹی نہیں ملی تھی۔ مگر گل کے

لیے بے حد دکھی تھا' اوپر سے بیلا کی بے رخی' جو موبائل بند کر کے اسے یکسر نظر انداز کر رہی تھی۔
"آخر وہ چاہتی کیا ہے....." اس نے جھنجلا کر زیبا سے پوچھا۔
"ذکی بھائی کا غصہ تم پر نکال رہی ہے۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔" زیبا نے تسلی دی۔
"فہد کے والدین تاریخ طے کرنا چاہتے ہیں۔"
بڑی امی نے بڑے ابو سے کہا۔ رات کے کھانے پر سب ہی موجود تھے..... بڑے ابو کی نظریں بے اختیار گل کی طرف اٹھیں..... گل نے بغیر نظریں اٹھائے آہستگی سے کہا۔
"بلالیں ابو..... کب تک ٹالیں گے۔"
"ہوں۔" انہوں نے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔
"اتوار کو بلالیں....." انہوں نے گویا سہارا دیا۔ پھپھو نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا' پانی کا گلاس بھرا..... ذرا سا کھنکاریں۔
"وہ عاشر چاہ رہا تھا۔ زیبا کی شادی میں اس کا اور بیلا کا نکاح بھی ہو جائے تو۔"
ذکی نے انہیں بھائیوں کے سامنے نکو بنا دیا تھا۔ باقی سب نے صلاح کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیلا نے چیچ اک آواز کے ساتھ پلیٹ میں پٹخا زیبا نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا' جسے بیلا نے تیزی سے جھٹک دیا۔
"ابو۔" اس نے سب کو چھوڑ کر براہ راست باپ کو، مخاطب کیا۔ "زیبا کی شادی طے کریں' میری نہیں۔"
"کیا حرج ہے اگر....." پھپھو نے کچھ کہنا چاہا۔ اس نے تیزی سے بات کاٹ دی۔
"حرج ہے پھپھو! کیونکہ مجھے عاشر سے شادی نہیں کرنا ہے۔"
اس نے صاف لہجہ و آواز میں کہا اور دسترخوان سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سب اپنی جگہ متحیر سے رہ گئے تھے۔

ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا مگر اس کی نہ، ہاں میں نہ بدلی۔ وہ ضدی تو کبھی بھی نہ تھی مگر اب ضد کر رہی تھی۔
"تم عاشر کو کھو کر پچھتاؤ گی۔" زیبا نے لتاڑا۔
"میں پا کر پچھتانا نہیں چاہتی۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔
"سب کو ایک ہی لاٹھی سے کیوں ہانک رہی ہو..... عاشر ایسا نہیں ہے۔"
"اچھا..... کیا گارنٹی ہے...؟" اس نے طنزاً پوچھا۔
"تمہارا دماغ خراب ہے؟" زیبا چڑ گئی۔
"تم خاموشی سے اپنی شادی کی تیاری کرو..... میری فکر چھوڑ دو۔" وہ آرام سے اٹھ کر نہانے چل دی۔
"لیکن عاشر میں برائی کیا ہے۔" زیبا نے چلا کر پوچھا۔
"یہی کہ وہ ذکی کا بھائی ہے۔" اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ عاشر نے فون پر سنا تو خوب ہنسا۔
"یہ ہنسنے کی بات ہے؟" زیبا نے الجھ کر دریافت کیا۔
"اس کی عقل پر ہنسی آ رہی ہے۔"
"تم یہ سوچو کہ اس کے عقل ٹھکانے کیسے لائی جائے۔"
"فکر نہ کرو..... ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی غصے نے ہر جذبے پر پردہ ڈال دیا ہے..... تھوڑا وقت گزرے گا تو سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگے گا۔ میں بھی اور میری محبت بھی۔"
"گویا تم نکاح کے فیصلے سے دستبردار ہو رہے ہو؟"
"ہونا پڑے گا۔ میں زبردستی اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا خود غرض کہلاؤں گا۔"
"اور اگر وہ....." زیبا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"وہ جذباتی ہے' بے وقوف نہیں..... مجھے اپنے رب اور اپنی محبت پر پورا یقین ہے۔"
"اچھا بھئی' جیسے تم لوگوں کی مرضی' شادی میں تو آؤ گے نا....."
"کوشش کروں گا' چھٹی ملنا بہت مشکل ہے۔ گل



آپی کیسی ہیں؟"
"بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔" زیبا نے اک طویل سانس لے کر کہا۔

گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ تیاریاں تو دونوں گھروں میں بہت عرصے سے ہو رہی تھیں' پھر بھی چھوٹے چھوٹے کام نکلتے چلے آ رہے تھے..... گل نے کئی سوٹ اپنے ہاتھوں سے کاڑھے تھے..... بس ایک ہی دل دکھاتی بات تھی کہ ہر آنے والا مہمان گل سے بچے کی بابت ضرور دریافت کرتا' پھر تبصرے' حیرانی' وہ کس حوصلے سے یہ سب سہار رہی تھی۔
وہ مہندی کی رات تھی۔
خوشبو بھرا ہنگامہ عروج پر تھا۔ بیلا کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھنے کمرے میں آئی تھی' جہاں خواتین جمع تھیں۔
"بھئی! اب بیلا کے بارے میں سوچو..... لڑکیوں کا مناسب عمر میں رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔"
بیلا نے پلٹ کر اس خاتون کو دیکھا' جو اس کی ماں کو گھیرے بیٹھی تھی۔
"جو اللہ کو منظور....." وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھیں..... بیلا کو عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔ اس نے پہلی بار اپنے معاملے کو ماں کے حوالے سے دیکھا تو ندامت سی محسوس ہوئی۔ اس کے انکار نے انہیں کس مشکل سے دوچار کیا ہے' اس کا احساس بھی اسی لمحے ہوا..... وہ ٹال رہی تھیں اور خاتون کو بیلا کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہ مل رہا تھا۔ بیلا جھنجلا کر باہر نکلی' تو دروازے میں کسی سے ٹکرا گئی۔
"سنبھل کر یار....."
"تم۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ عاشر کو افسوس سا ہوا۔ اس کا وہ بے ساختہ اظہار آج مفقود تھا۔
"تو بیلا بی بی! میری رسائی ابھی تک آپ کے دل تک نہیں ہوئی۔" عاشر نے سوچا' بیلا کترا کر نکل گئی۔
عاشر خواتین کے گھیرے میں تھا..... مریم اور فرح کے آنے سے شادی کی رونق دوبالا ہو گئی۔ فیضان اور سونیا آتو نہ سکے مگر زیبا کے لیے بہت سے گفٹس بھجوائے تھے۔ خصوصاً فیضان کو شادی میں شریک نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا' جس کا اظہار اس نے بار بار فون کر کے کیا۔
فون کی بیل پھر سے بج رہی تھی۔
بیلا نے چونگا اٹھایا..... مگر دوسری طرف ذکی تھے..... بیلا کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ وہ چونگا رکھنا چاہتی تھی..... مگر ذکی بول اٹھے۔
"پلیز بیلا! فون بند مت کرنا۔"
"میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "میں تو شروع سے جان چکی تھی' آپ انتہائی خود غرض اور بے حس انسان ہیں۔ نجانے گھر والے کس خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔"
ذکی اس کے لہجے کے تنفر پر ایک پل کو خاموش ہو گئے۔ پھر قدرے ناگواری سے بولے۔
"وہ میرا بچہ ہے..... میرے ساتھ رہ رہا ہے۔"
"اچھا اور گل آپی.....؟ اس پورے ڈرامے میں ان کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین تھیں۔" وہ پھٹ پڑی۔ "ایک ماں کا کلیجہ نوچتے ہوئے آپ کو ذرا بھی خوف خدا نہ آیا..... ذکی صاحب! آپ کو بددعاؤں سے خوف نہیں آتا۔"
عقب سے کسی نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ریسیور تھام لیا۔ وہ پلٹی پھر گل کو دیکھ کر ساکت ہو گئی۔
"گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے بیلا..... جاؤ باہر مہندی کی رسم شروع ہو رہی ہے۔" بیلا متذبذب سی اسے دیکھتی باہر نکل گئی۔
"گل! کیسی ہو.....؟" ذکی غالباً اس کی آواز سن چکے تھے۔ وہ خاموش ہی رہی۔
"اپنے بیٹے کے بارے میں نہیں پوچھو گی۔"
گویا زخم دے کر تو ختم کر دینے کی عادت بھی تھی۔
"وہ تمہارا بیٹا ہے۔" گل کا لہجہ سپاٹ تھا۔ باہر

ڈیک فل آواز میں چلنے لگا۔

"تم نے شادی کے لیے کپڑے بنوا لیے ..... میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں ....."

گل کو لگا اس کے کان بند ہو رہے ہیں اور وہ کہہ رہے تھے۔

"تم میری بیوی ہو ..... تمہاری ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے ..... اور جو احسان تم نے ہم پر کیا ہے ..... یقین جانو ..... ہمارا اپارٹمنٹ خوشیوں سے بھر گیا ہے۔"

وہ اب یہ سب کیوں کہہ رہے تھے اور کس لیے؟

کیا یہ ان کے اندر کا احساس ندامت تھا۔

گل نے ریسیور پٹخا اور تیز تیز چلتی اندر چلی گئی۔ باہر ہنگامہ تھا' شور اور خوشیاں۔ اندر وہ تھی ..... اپنی آہوں کو دباتی نجانے آج ہو اکیا تھا کہ وہ قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی ..... اس کا اندر کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔

اب یہی تھا اس کے اور ذکی کے مابین رشتہ ..... وہ دنیا کی نظر میں ان کی بیوی تھی اور وہ اس کے رشتے کو روپے پیسے سے تول رہے تھے۔

وہ مطمئن تھے کہ ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا ..... اور یہ بھول گئے کہ ان خوشیوں کے لیے انہوں نے کسی کی گود ویران کی تھی۔

آج صائم اس کی گود میں ہوتا تو کیا وہ یوں دنیا کی ترحم بھری نگاہوں کا سامنا کر رہی ہوتی ..... اس کا خیال تھا۔ اسے صبر آگیا ہے۔ وہ خود کو سنبھال چکی ہے۔ مگر آج اس خوشیوں بھرے ماحول میں اس نے خود کو کس قدر تنہا' اداس اور ویران محسوس کیا تھا ..... اس کا صائم ..... اس کا لخت جگر۔

اس کی کلکاریاں' کھلکھلاہٹیں۔

اک ہوک تھی' جو دل سے اٹھ کر پورے وجود میں پھیل رہی تھی۔

اک درد تھا' جو ہمت ڈھا رہا تھا۔

اک آہ تھی' جو عرش تک جا رہی تھی۔

ایسی آہ' جو ظلم کرنے والے کے ظلم کا حساب لیتی ہے۔

ایسی آہ جو نہ چاہتے ہوئے بھی' بد دعا بن کر لبوں سے لپٹ جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

دو بجے کا عالم تھا ..... تھکن کی ماری خواتین' لڑکیاں اور بچے یہاں وہاں لڑھک گئے۔ بیلا نے بھی جلدی جلدی مٹھائیوں کے ڈبے وغیرہ سنبھالے ..... چائے کا کپ امی کو دینا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً سو جانا چاہتی تھی ..... اس نے چائے کپ میں نکالی' کچن کی لائٹ اور دروازہ بند کیا ..... اور چائے لے کر ان کے کمرے میں آگئی' جہاں دیگر خواتین محو خواب تھیں۔

"جیتی رہو بیٹی ..... اب تم بھی سو جاؤ ..... ورنہ صبح آنکھ نہیں کھلے گی۔" انہوں نے نرمی و شفقت سے کہا تو وہ جاتے جاتے پلٹی اور جھجکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"امی! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں۔"

"کس لیے؟" وہ چونکیں۔

"وہ میں نے عاشر کے ....." اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا ..... انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا ..... پھر پوچھا۔

"تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے؟"

"غلطی!" اس نے تحیر سے ماں کو دیکھا۔ "مجھے نہیں لگتا' میں غلطی پر ہوں۔"

"والدین اپنی اولاد کا برا چاہ سکتے ہیں؟" انہوں نے رسانیت سے دریافت کیا۔

"لیکن ان کے فیصلے غلط تو ہو سکتے ہیں۔" اس نے واضح انداز میں ان سب کے ایک غلط فیصلے کو جتایا تھا۔

وہ خاموش سی ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے ..... میں آپ سب کی رضا میں راضی ہوں لیکن ....." اک رشتے دار خاتون نے کروٹ بدلی تو وہ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اوپر آگئی' جہاں بیڈ پر زیبا' مریم' ان کے بچے گتھم گتھا سو رہے تھے' نیچے فرح اور اس کی نند گدے بچھائے پڑی تھیں' اسے بھی انہیں کے درمیان جگہ بنانا تھی۔ مگر نیند چینی سی تھی ..... تب ہی لیٹنے کے بجائے وہ موبائل کھول کر بیٹھ گئی۔ شادی کی وجہ سے اسے اپنا موبائل دوبارہ آن کرنا پڑا تھا' ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ وہ یہ سیل عاشر کو واپس کر دے گی۔

وہاں اسی نمبر سے SMS منتظر تھا۔

بیلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھول لیا۔

"کیا تم بھی پھر
شام کی دہلیز پہ آس کی آہٹ پر
دروازے کی جانب بھاگے جاتے ہو
کیا تم بھی درد چھپانے کی کوشش کرتے
اکثر تھک جاتے ہو اور بن کارن مسکاتے ہو
کیا تم بھی
نیند سے پہلے پلکوں پر ڈھیروں خواب سجاتے ہو
یا پھر بے خواب چیزوں میں
روتے روتے سو جاتے ہو
کیا تم بھی؟

"میں اس وقت کا انتظار کروں گا' جب میری محبت تمہارے دل پر یقین بن کر اترے۔"

"گل آپی پر بھی یہ محبت یقین بن کر اتری تھی۔" اس نے بیزاری سے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔

"محبت ذکی نے نہیں گل نے کی تھی۔" کوئی اس کے اندر بولا۔

"تب بھی کیا گل صنوبر اس رویے کی حقدار تھی ..... جو ذکی نے اس کے ساتھ روا رکھا۔"

"ذکی اور عاشر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" دل ہی ہو رہا تھا۔

"سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔"

"ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں؟"

"میں انگلیوں کی بات نہیں کر رہی۔"

"ایک ماں کی پانچ اولادیں اپنی عادات' خیالات و جذبات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تم عاشر اور ذکی کو ایک پلڑے میں کیسے رکھ سکتی ہو؟"

"تم بکواس بند کرو۔"

"اچھا آخری بات' محبت کو ٹھکرانے والے بدنصیب ہوتے ہیں ..... بالکل ذکی کی طرح ....."

وہ دم بخود رہ گئی۔ کیا وہ بھی ناشکری کی مرتکب ہو رہی ہے' جس طرح ذکی ہوئے۔ کمرے میں گھٹن بڑھ گئی یا اس کے اندر اضطراب۔

اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی' پھر ٹھٹک گئی۔

سامنے اندھیرے میں دو نفوس تھے۔

ایک آنسو بہاتا' دوسرا آنسو پونچھتا ہوا۔

وہ دونوں اس کے دل کے بے حد قریب تھے۔

"اب بولو! کیا اس حساس دل کو ٹھیس پہنچا کر خوش رہ پاؤ گی؟"

اس نے بے جان ہاتھوں سے کھڑکی بند کر دی۔

☼ ☼ ☼

اسٹیج پر بیٹھی زیبا کے چہرے پر الوہی خوشیوں کا عکس جھلکتا تھا۔

وہ ولیمہ کی دلہن تھی' سو شرماہٹ کی جگہ مسکراہٹ اور گھبراہٹ کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی تھی۔ پہلو میں بیٹھا فہد شاداں و فرحاں دکھائی دیتا تھا۔ ہلکی پھلکی آپس میں گفتگو بھی جاری و ساری تھی۔

"ابھی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں ..... کچھ عرصے کے بعد آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔" ساڑھی سنبھالتی فرح نے چڑ کر کہا۔ اس کی ساس کی فرمائش تھی کہ وہ شادی میں سارا زیور پہنے ..... سو وہ لدی پھندی بیزار بیٹھی تھی۔ بیلا کو ہنسی آگئی۔

"سچ کہتی ہوں بیلا! شادی کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید روشنی ڈالتی ..... امی نے بیلا کو آواز دے دی۔

"گل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ..... ہم ابھی گھر چلتے ہیں۔ کھانا تو کھا ہی چکے ہیں۔ میرے بھی سر میں درد ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ زیبا سے ملنے اسٹیج کی طرف چلی گئی۔ باہر آئی تو عاشر گاڑی لیے منتظر تھا۔ اسے بھی ابھی واپس جانا تھا ..... سارا راستہ وہ اور امی باتیں کرتے

آئے، جبکہ بیلا گاڑی سے باہر جھانکتی رہی۔ عاشر کا دل چاہا وہ اس کی تعریف کرے۔ وہ آف وائٹ فراک اور پاجامے میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی مگر ایک تو ممانی کا لحاظ مانع تھا۔۔۔۔ دوسرا اس کے خیال میں وہ پہلے ہی خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ گھر آکر امی نے گل کو دیکھا۔۔۔۔ وہ نڈھال سی لیٹی تھی۔ حالانکہ بخار بھی نہ تھا۔ بس کل سے یونہی پڑی تھی۔

"میں کپڑے بدل لوں۔۔۔۔ گل کو کھانا کھلا دو۔"

"میں کھالوں گی، آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔" گل اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔۔ امی گئیں تو اس نے بیلا کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"ابھی رہنے دو۔۔۔۔ بعد میں کھالوں گی۔۔۔۔ تم بتاؤ زیبا کیسی لگ رہی تھی؟"

"بہت پیاری۔۔۔۔" وہ اسے چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگی۔ تب ہی عاشر آگیا۔

"اچھا گل آپی! اب مجھے اجازت دیں۔"

"اتنی جلدی؟"

"جی، اتنی ہی چھٹی ملی تھی۔" وہ ان کی دوسری طرف پر بیٹھ گیا۔ بیلا اٹھنے کے لیے پر تولنے لگی۔ گل نے بیلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے پوچھنے لگی۔

"ابھی تک عاشر سے خفا ہو۔۔۔۔"

"میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔۔۔۔" وہ جز بز ہو گئی۔ عاشر کے سامنے جواب طلبی کی توقع ہی کہاں تھی۔ عاشر مبہم سا مسکرا لیا۔

"محبت کو ناراض نہیں کرتے۔"

"مجھے کسی سے محبت نہیں۔" بیلا نظریں چرا گئی۔ عاشر بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"اسے تو ہے۔۔۔۔"

"آپی! مجھے جانے دیں۔" وہ بے بس ہو کر بولی۔

"جاؤ۔۔۔۔ لیکن میری بات سنو۔۔۔۔"

"آپ بتائیں۔۔۔۔ کیا آپ کو صبر آگیا ہے؟" بیلا نے تیزی سے بات قطع کی۔

"بار بار ایک ہی بات کیوں کرتی ہو۔ محبت نے قربانی مانگی تھی میں نے دے دی۔"

"اولاد کی قربانی؟" بیلا سے قبل عاشر بول اٹھا۔ گل صنوبر چپ سی ہو گئی پھر دھیمے سے بولی۔

"بیلا۔۔۔۔ عاشر! مجھے صرف ایک بات کا یقین ہے میرا خدا ناانصافی نہیں کرتا۔۔۔۔ جو میرا ہے اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے۔"

گل صنوبر کا لہجہ پر سکون تھا۔ فون کی گھنٹی اک تواتر سے بجنے لگی تھی۔۔۔۔ پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ یقیناً امی نے فون ریسیور کر لیا تھا۔

"آپی! یہ لاجک میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کل صائم بڑا ہو گا۔ کب اسے پتا چلے گا کہ اس کی ماں شائستہ نہیں گل صنوبر ہے۔"

"گل صنوبر۔۔۔۔" امی افتاں و خیزاں کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کچھ سنا ذکی کا فون تھا۔ وہ شائستہ۔۔۔۔ شائستہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں۔۔۔۔" ان کا گلا رندھ گیا۔

"ذکی۔۔۔۔ ڈیڈ باڈی کے ساتھ کل پاکستان آرہا ہے۔"

وہ سب دم بخود تھے۔ گل صنوبر ساکت و صامت تھی۔

اس نے تو ایک بار بھی شائستہ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔ اس کا اس قصے میں کیا کردار ہے۔۔۔۔ اس نے تو کسی کو بد دعا نہیں دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ شائستہ کی جواں مرگی پر افسوس کرے یا بیٹے اور شوہر کی واپسی کی خوشی منائے۔

وہ آہستگی سے اٹھی اور وضو کرنے چلی گئی۔

امی رو رہی تھیں۔

عاشر اپنے موبائل پر کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔ بیلا نے پلٹ کر دیکھا۔

گل صنوبر جائے نماز بچھا رہی تھی۔ اس نے ابھی کہا تھا۔

"مجھے خدا کے انصاف پر پورا یقین ہے۔۔۔۔ جو میرا ہے اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے۔"

☼

سگونی علی بٹ

# دِل گرفتہ سے عشق او بہت ستم

مکمل ناول

کہانی کا آغاز اس شخص سے ہوتا ہے جو شدید دکھ، پریشانی اور ذہنی اذیت کی کیفیت میں ہے۔ وہ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے کسی کو فون کرنے کے لیے نمبر ڈائل کرتا ہے۔

ایک ماں اپنے بچے کی خاطر دوسرے شادی کرتی ہے لیکن اس کا شوہر بچے کو رکھنے سے انکار کردیتا ہے مجبوراً" وہ بچے کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

کہانی کا تیسرا ٹریک وہ ادھیڑ عمر عورت ہے، جو ایک قبرستان میں رہتی ہے اور ایک قبر پر پھول چڑھانے کے لیے خریدتی ہے۔

ماہم اور شاہم کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماہم کی شادی اس کے چچا زاد بھائی منصور سے ہوئی ہے اور اس نے اپنی چھوٹی بہن شاہم کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ منصور شاہم کو پوری شدتوں سے چاہتا ہے لیکن شاہم کا رویہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے، وہ ماضی میں کسی کو چاہتی رہی ہے۔ وہ شخص کاشا ہے۔ ایک دن اچانک کاشا اسے نظر آتا ہے تو پرانی چاہت بے دار ہو

جاتی ہے۔ کاشا ایک انتہائی اکھڑ مزاج نوجوان ہے۔ جو ہر طرح کا نشہ کرتا ہے اور اس کے کئی لڑکیوں سے تعلقات بھی ہیں۔
اس کی چھوٹی بہن شاہم ایک نوجوان ارسل کو چاہتی ہے۔ ارسل کی ماں اس رشتے پر رضامند نہیں اپنے باپ کے مشورے پر ارسل اپنا گھر چھوڑ کر ایک فلیٹ لے کر اس میں رہنے لگتا ہے تاکہ اس کی جدائی ماں کو یہ رشتہ قبول کرنے پر مجبور کردے۔

ماہم منصور کی محبت، اپنے بچوں، شوہر، عزت سب کو بھلا کر کاشا کو فون کر کے ملنے کے لیے کہتی ہے۔

کاشا کو ماہم سے صرف اس لیے دلچسپی ہے کہ منصور نے اس کے نام ڈیفنس میں گھر کر رکھا ہے لیکن ماہم کے لیے کاشا سب کچھ ہے۔ وہ بہانے بنا کر کاشا سے ملتی ہے۔ منصور جانتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے لیکن ایک دن ماہم کھل کر سامنے آجاتی ہے اور طلاق کا مطالبہ کردیتی ہے۔

منصور ایک دم سکتہ میں آجاتا ہے ماہم روتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، اس لیے اس کا مطالبہ پورا کردیتا ہے، اور خود شہر سے باہر چلا جاتا ہے۔ شاہم کو گھر کے ملازمین سے پتا چلتا ہے کہ ماہم طلاق لے کر جاچکی ہے۔

## چوتھی قسط

اسے یاد آیا کہ وہ تین دن سے بھوکا ہے، کتنی بار کھانا سامنے لا کر رکھا اور اصرار کیا گیا خود کا ہر زاویے سے بے تاثر سا جائزہ لینے کے بعد وہ میکانکی انداز میں وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا شعور متحرک سا ہو گیا تھا۔ ہینگر میں لٹکتے کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے الٹتے پلٹتے اس نے سیاہ شلوار قمیص منتخب کرلی۔ شاور پوری رفتار سے کھولے وہ ٹھنڈے یخ پانی کے نیچے پندرہ منٹ کھڑا رہا تھا۔ برفیلا پانی اس کے تازہ گرم زخموں کو اذیت نہیں دے رہا تھا۔ ایک طویل غسل لے کر وہ بالوں سے پانی انگلیوں سے جھٹکتا باہر آیا، ہاتھ لینے سے اس کا شعور حواس قائم کرچکا تھا۔ کیونکہ اسے بھوکے پیٹ کا احساس شدت سے جاگا تھا۔ کچن فریج میں رات کا بنایا گیا کھانا پڑا تھا، کھانے کے ڈونگے دیکھتے ہی اس کا جی پھر سے اچاٹ ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈونگا واپس رکھ کے اس نے دودھ کا ڈبہ نکال لیا اور چائے بنانے لگا۔ اسی دوران اس کے ذہن میں کتنی ہی یادیں ابھرنے لگی تھیں۔ کسی کا وجود، باتیں، قہقہے، چھیڑ چھاڑ اسے خود سے بے گانہ کرنے لگے، ان تکلیف دہ سوچوں سے فرار پانے کے لیے برنر کی آنچ تیز کردی۔ دھیان بٹانے کے لیے وہ بلاوجہ ہی کیبنٹ کھول کھول کر بند کرنے لگا۔ اسے کسی چیز کی بھی تلاش نہیں تھی۔ ایک کیبنٹ میں بسکٹ کا پیکٹ نظر آنے پر اس نے اٹھالیا، کھولتی چائے کو مگ میں چھان کے ہاتھ میں پکڑے وہ واپس کمرے میں آگیا۔ کشن درست کر کے وہ اس پہ بیٹھ گیا۔ خالی بھوکے پیٹ چائے تیزاب کی مانند لگ رہی تھی۔ اس اذیت کو برداشت کرنے کے لیے وہ کئی لمحے آنکھیں سختی سے میچ گیا۔ چائے کے سپ بھرتے اس کا سامنے دھری بسکٹ کی پلیٹ پر یا تو دھیان نہیں گیا تھا یا پھر وہ کھانا نہیں چاہ رہا تھا۔

خالی دل
خالی دماغ
خالی جسم
اور خالی روح

چائے کے آخری گھونٹ تک ان الفاظ کی گردان اس کے ذہن میں چلتی رہی۔ اچانک کسی کی یاد اس کے اندر ابھری تھی، وہ جلدی سے مگ رکھ کر بکھری چیزوں کو مزید بکھیرتا اپنا موبائل ڈھونڈنے لگا، تھوڑی سی کوشش کے بعد موبائل اسے مل گیا۔ اس شخصیت سے بات کرنے کے لیے شاید بڑا حوصلہ درکار تھا اس نے اپنے اندر کی گھٹن کو باہر پھینکنے کے لیے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ارسل..." دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

مطیع الرحمان کی بے تابانہ آواز نے اس کی اندر کی گھٹن کو خاصا کم کیا تھا۔ رات کے گزرتے اس آخری پہر میں بھی انہوں نے دوسری بیل پر فون اٹھایا تھا۔ وہ بابا "پریشانی میں گھرے رات بھر سو نہیں سکے تھے۔ جہاں اس کے اندر یہ سکون اترا تھا کہ ابھی بھی کوئی تو ایسا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے انتظار میں رات بھر سے جاگ رہا ہے، وہیں ان کی پریشانی کے خیال نے اسے پشیمانی میں گھیر لیا۔

"بابا... جانی۔" وہ بہت ٹوٹ گیا تھا۔

"ارسل میری جان، میرے بیٹے، کہاں ہو تم؟ تین دن سے تمہاری شکل نہیں دیکھی۔" ان کی آواز میں بے چینیاں ہمک رہی تھیں۔

"میں آؤٹ آف سٹی تھا بابا جانی!" اس نے وہی سابقہ جھوٹ دہرایا جو ملازم ناصر ہر بار مطیع الرحمن کی کال آنے پر ان سے بولتا رہا تھا۔ اسے ایسا کہنے کو ارسل نے ہی کہا تھا۔

"اتنا بڑا ہوگیا ہے، مگر تجھے اپنے بابا سے جھوٹ بھی نہیں بولنا آیا، بے وقوف۔" ان کی ڈانٹ میں بھی محبت کی شیرینی تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟" کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ سے تھکے ہوئے انداز میں پشت جوڑ کر اس نے بات ہی بدل دی تھی۔

"جس باپ کا جوان بیٹا تین روز سے بغیر بتائے غائب ہو، اس باپ کی حالت نہ پوچھو۔"

"ماما کیسی ہیں؟ میرا پوچھا تھا؟" اسے یک دم ماں کی یاد بھی آگئی تھی۔

مطیع الرحمن نے بیڈ پہ خواب خرگوش کے مزے لیتی بیوی کو تاسف سے دیکھا۔ مطیع الرحمن بیٹے کے لیے اتنے پریشان تھے، انہوں نے سائرہ سے بھی تذکرہ کیا تھا کہ ارسل بغیر بتائے کہیں غائب ہوگیا ہے مگر انہوں نے ارسل کے ہونے یا نہ ہونے کو قطعاً اہمیت نہیں دی۔

"ہاں... وہ... تمہاری ماں بھی بہت پریشان ہے تمہارے لیے، ابھی تو سو رہی ہے۔" انہوں نے بہت ٹھہر ٹھہر کے اسے جواب دیا۔ وہ ارسل کا ماں کے حوالے سے دل برا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ارسل کافی دیر پھیکی سی ہنسی ہنستا رہا۔

"آپ بھی اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں بابا جانی، مگر آپ کو بھی اب تک جھوٹ بولنا نہیں آیا۔" لہجے میں ہلکی سی شگفتگی لاتا وہ ان کا جواب ان ہی کو لوٹا گیا۔ وہ ہمیشہ سے بابا کو، ماما کو ایسی چھوٹی بڑی فیور دیتے دیکھتا آیا تھا۔

"فیکٹ از دس میری جان کہ ہم دونوں باپ، بیٹا ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔" انہوں نے اپنی غلط بیانی کا اعتراف کرتے اسے جتایا۔

"ہاں... شاید۔" اس کی کھوئی کھوئی سی آواز ابھری۔

"ارسل! تم ٹھیک تو ہو نا، کیا پرابلم ہے؟" مطیع الرحمن نے پوچھا تھا جبکہ ابھی کچھ دیر قبل وہ باپ، بیٹا یہ تسلیم کرچکے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے کچھ چھپا نہیں سکتے، غلط بیانی یا جھوٹ کو جان بوجھ کر نظر انداز کرجائیں، وہ الگ بات ہے۔

وہ باپ کے اس سوال سے بچنا چاہتا تھا۔

"بابا! میں صبح آؤں گا گھر، آپ سے اور ماما سے ملنے۔" اس نے بہت ہوشیاری سے موضوع ان کے من کی مراد کی طرف موڑ دیا۔

"جم جم آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے میری جان۔" اس کے آنے کا سن کر وہ کھل اٹھے تھے۔

"بابا آپ میرا ایک کام کریں گے۔" پتا نہیں کیا سوچ کر وہ پوچھنے لگا۔

"تمہیں بھلا پوچھنے کی ضرورت ہے، بولو تو سہی۔" انہوں نے بڑے دلار سے کہا۔

"آپ... آپ نے مجھے ماما سے معافی دلوانی ہے، میں بہت برا ہوں بابا، میں نے ماما کا بہت دل توڑا ہے"

انہیں ناراض کیا' انکار کیا' اپنی ضد پہ اڑ کر ان سے دور رہ کر بڑی تکلیف پہنچائی ہے میں نے انہیں' ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے اور میں کتنا بدبخت بیٹا ہوں' میں ان کے پیروں میں ہی بیٹھ کر معافی مانگوں گا' وہ معاف نہیں کریں گی' ڈانٹیں گی' آپ ان سے میری سفارش کریں گے تو ضرور مان جائیں گی' وہ صرف..... ایک بار میرے تمام قصور معاف کردیں' میں آئندہ کبھی بھی ان کا کہا نہیں ٹالوں گا' ان کی کسی بات پر انکار بھی نہیں کروں گا' وہ مجھے معاف کردیں گی نا' بتائیں بابا۔"

مطیع الرحمان بہت خاموشی اور بے یقینی سے ارسل کی بات بغور سن رہے تھے۔ اس کے چپ ہونے پر انہوں نے سوئی ہوئی بیوی کو دیکھا جو جتنی دنیا ومافیہا سے بے خبر تھی' اتنی ہی بیٹے سے بھی۔

انہیں یہ سب سنتے اس کے لہجے کی نمی کا بھی بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں ارسل کو کن الفاظ میں تسلی دینی ہے' کیا جواب میں کہیں' وہ کچھ نہیں جانتے تھے' بالکل خاموش تھے۔

"پلیز بابا! بتائیں نا' چپ کیوں کر گئے؟" وہ تھوڑی دیر ان کے بولنے کا انتظار کر کے بے قرار ہوا تھا۔

ارسل کی ساری بے قراریاں ان کے اندر سرایت کر گئیں۔

"بس تم آنا ضرور' میں تمہیں معافی دلوا دوں گا۔" بمشکل وہ کہنے کے قابل ہوئے تھے۔ وہ ارسل سے اس کے نم لہجے کا استفسار کرنا چاہتے تھے۔ مگر اسے اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ٹال جائے گا' انہوں نے کل اس کی آمد پر پوچھنے کے خیال سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔

"میں ضرور آؤں گا۔" اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑتے کہا۔ "اچھا بابا جانی فون رکھتا ہوں' اب سو جائیے' ڈونٹ وری اینڈ آئی لو یو سو مچ۔"

"سنو ارسل!" وہ اللہ حافظ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑے۔

"مرد..... مرد رویا نہیں کرتے' نہیں رویا کرتے میری جان۔"

یہ کہتے وہ خود رو پڑے تھے۔

فون بند کر کے وہ یوں ہی کھڑکی کے پار اندھیرے میں کسی غیر مرئی نقطے کو تلاشتا رہا۔ ہولے ہولے دوش پہ سرسراتی آواز اس کے قریب آکر رک گئی۔

"اے لڑکی! ایک تو میں تمہیں اس مشکل گھڑی میں رہنے کو اپنی چھت مہیا کر رہا ہوں' اوپر سے تم مجھے گالیاں دے رہی ہو' اب ایک لفظ بھی بولیں تو کھڑکی سے اٹھا کر ڈائریکٹ نیچے پھینک دوں گا۔"

یہ وہ ہی کھڑکی تھی' اس نے لمبا سا سانس خارج کر کے اس کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ بیڈ کراؤن کی دراز میں سے اس نے سیاہ رنگ کی خالی ڈائری پین نکال لیا۔ وہ اپنے دل میں واویلا کرتے شور اور جسم میں ماتم کناں بین کا کتھارسس لکھ رہا تھا۔ بنا سوچے سمجھے' وہ قلم چلاتا جا رہا تھا۔

اس طرح لکھنے سے اس کے اندر ہلکی سی طمانیت بھری لہر دوڑ رہی تھی۔ اس نے کبھی ڈائری نہیں لکھی تھی۔ یہ بھی یوں ہی لا کر رکھی تھی۔

تم کیا جانو' سزائیں کیا ہوتی ہیں؟

تم کیا جانو سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
تمہارے لیے تو یہ اک فقط لفظ ہے
تم کیا جانو سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
دل کو چٹکیوں سے کوئی مسلتا ہو جیسے
روح کو تمہاری اپنے قدموں تلے روندتا ہو جیسے
خوابوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہو جیسے
تم کیا جانو سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
کوئی شرارتی بچہ تمہارا کھلونا توڑ دے جیسے
کوئی اجنبی تمہارا ریت کا گھروندا توڑ دے جیسے
کوئی مہربان یک دم نامہربان ہو جائے جیسے
کوئی چھت بھی تمہارے سر پر نہ رہے جیسے
کوئی خواب بھی تمہاری نیند میں نہ ابھرے جیسے
کوئی جذبہ بھی دل میں نہ جگہ پا سکے
تم کیا جانو سزائیں کیا ہوتی ہیں؟



قید میں کوئی پرندہ سر ٹکراتا ہو جیسے
بلبل کوئی اندھیرے سے گھبراتا ہو جیسے
بچہ کوئی اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہو جیسے
دودھ کا بھرا فیڈر گر کر ٹوٹ جاتا ہو جیسے
تم کیا جانو سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
روح کو خشک پتوں کی مانند اڑا دیں
وہ سرد ہوائیں کیا ہوتی ہیں؟
تم کیا جانو سزائیں کیا ہوتی ہیں؟

وہ نیچے کارپٹ پر بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ڈائری لکھنا بھی کتنا عجیب مشغلہ تھا۔ وہ آخری سطریں بار بار لکھ رہا تھا۔

روح کو خشک پتوں کی مانند اڑا دیں
وہ سرد ہوائیں کیا ہوتی ہیں؟

ڈائری نیچے رکھ کے اس پہ پین بھی رکھ دیا۔ دونوں گھٹنے کھڑے کر کے کہنیاں ان پہ جما کے اپنی ہتھیلیاں آنکھوں پہ رکھ لیں۔ وہ رو رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا۔

"مرد بھی رویا کرتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

وہ کافی کے مگ کو پورے ہاتھ کی ہتھیلی میں جکڑے صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کی قسمت بری تھی کہ آفس سے واپسی پر اس نے کاشا کو کال کی' نمبر بزی جا رہا تھا۔ فراغت سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ریس کورس چلا گیا۔ چھ کا ہندسہ ہمیشہ سے اس کا لکی نمبر تھا۔ اس کو لے کر وہ زی ٹی وی پہ بیٹھا رہا۔ جب یہاں بات نہ بنی تو غصے اور مایوسی سے کنگ کارڈ پہ طبع آزمائی کرنے لگا۔ بارہ بجے تک وہ پچھتر ہزار کا کباڑہ کر چکا تھا۔ گھر آکر واش روم میں فل شاور کے نیچے آدھا گھنٹہ کھڑا ہو کر اس نے اپنا کھولتا دماغ ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ سلیپنگ گاؤن لپیٹ کر اسے پینے کا خیال اچانک آگیا تھا۔ اسکاچ کے دو جام چڑھا کر کافی پیتے ہی وہ سونا چاہتا تھا۔ کافی کے آخری گھونٹ تھے کہ سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پہ کاشا کے نام نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔

"کیا تکلیف ہے تجھے' نیند نہیں آتی؟" وہ غصے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ ابھی صرف ڈیڑھ بجا ہے اور کاشا مرغ کی پہلی بانگ سن کر بستر پہ لیٹتا ہے۔

"اچھا' بات سن' ماہم کے پاس چلا جا' وہیں رات ٹھہر' سیکورٹی گارڈ چھٹی پہ ہے' اسے ڈر لگ رہا ہے' بار بار مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے۔" کاشا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"تم کہاں ہو؟" غنی کے لیے یہ نئی مصیبت تھی۔

"میں کسی اور کے ساتھ بزی ہوں' صبح آکر ڈیٹیل (تفصیل) بتاؤں گا' ابھی نہیں۔" کاشا نے کہا۔

"تجھے معلوم ہے کاشا! مجھے اپنے بیڈ کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی۔"

"اسی لیے کہتا ہوں عادت ڈال' کبھی کبھی کہیں اور سو جانے میں حرج نہیں' بٹ اینی وے' صبح ہونے میں ٹائم ہی کتنا رہ گیا ہے' آئی پرامس سیون او کلاک' آجاؤں گا۔"

کاشا نے اپنی کہہ کر جلدی سے فون بند کر دیا۔ غنی موبائل کو گھور کے رہ گیا۔

"تو نہیں سدھرے گا خبیث۔"

موبائل' گاڑی کی چابی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ غنی کی آمد پہ ماہم نے اس کے لیے کمرہ کھول دیا اور خود جا کے آرام سے سو گئی۔ اسے نیند کہاں آنی تھی۔ وہ ساری رات ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا چینل بدلتا رہا۔ پونے سات بجے وہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ کاشا اس کے ساتھ وعدے کا پکا تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ غنی نے سلائیڈ ہٹا کر اسے باہر دیکھا۔

"اٹھ اور ایک جپھی ڈال دے۔" کاشا نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں ایستادہ بازو پھیلائے کہا۔

"نہ..... نہ مجھے تیری نیت خراب لگ رہی ہے۔" غنی نے قہقہہ لگاتے اسے چھیڑا۔

"بک نہ۔" کاشا نے اسے گلے سے لگا لیا۔

غنی نے چند لمحوں میں ایکٹنگ کرتے اسے پھرتی سے خود سے الگ کردیا۔

"تو صاف پاک ہے نا۔" اس نے قریب ہو کر کاشا کو سونگھا۔

"ہٹ ذلیل، خود تو دودھ سے نہاتا ہے۔" اس نے اسے زور کی دھپ ماری۔

"میری نیند غارت کرنے والے تیرا آوارہ پن ختم کیوں نہیں ہوتا۔"

"اس گزری رات کی آوارہ گردی نے میرے خوابوں کی تعبیر مجھے دے دی۔"

اتنے میں ملازم ٹرالی گھسیٹے اندر آگیا۔ جس میں بوتلیں تھیں۔

"کتنی بار منع کیا ہے یار! نہار پیٹ اس منحوس کو منہ مت لگایا کر۔" غنی کو اس کے صبح سویرے پینے سے بہت چڑ تھی۔

"رات لیلیٰ کے ساتھ تھا، سرپرائزنگ نیوز از دس کہ اس نے مجھے پرپوز کیا ہے ——" اس نے غنی کو بتایا۔ لیلیٰ کی واپسی کا ذکر اس نے غنی سے بھی لیا تھا۔

"پھر...؟" غنی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"پھر... پھر یہ کہ امریکہ جانا میرا خواب ہے اور لیلیٰ کے پاس... گرین کارڈ ہے، نیشنلٹی ہولڈر... پروپوزل جانے دینے والا تو نہیں۔" کاشا گھونٹ پہ گھونٹ بھر رہا تھا۔

"اوئے مت بھول، تو شادی شدہ ہے اور تیری بیوی زندہ ہے۔" غنی بے ساختہ بولا۔

"لیلیٰ سے شادی کر کے امریکہ جانے کا چانس پکا ہے۔"

"لیلیٰ کی مدد کے بغیر بھی امریکہ جایا جاسکتا ہے۔" غنی خاصا سنجیدہ ہوگیا۔

"صرف جایا جاسکتا ہے، مگر سیٹل نہیں ہوا جاسکتا۔ میں اپنے لائف اسٹائل اور اسٹیٹس کو کیسے ریجیکٹ کردوں؟ نیشنلٹی کے لیے دھکے کھاؤں، محنت مزدوری کروں، پر کیوں؟ جب میری لک مجھے گولڈن چانس دے رہی ہے تو میں اسے Avail (حاصل) کیوں نہ کروں؟ لیلیٰ لاکھوں ڈالرز کی اونر ہے، وہ سب اپنی مرضی سے میری جھولی میں ڈال رہی ہے، میں ناشکری کیوں کروں، اسے لات کیوں ماروں؟"

اس نے کون سا غنی کی ماننی تھی۔ اس کی اپنی وضاحتیں تھیں۔

"پر کاشا! پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"یار نہیں ہوتا ہوگا سب کچھ، کبھی جائزہ لینا غنی! کتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں لوگ اپنے گھروں میں اپنی حفاظت کے لیے پالتے ہیں۔ وہ مالک کے ٹکڑے کھا کے اس کی رکھوالی میں لڑتے ہیں — دوسری قسم گلی کے کتوں کی ہوتی ہے، ان کے گلے میں کوئی پٹہ نہیں ہوتا نہ ان کا کوئی مالک نہ یہ کسی کے رکھوالے، یہ کتے صرف اور صرف اپنی ہڈی کے لیے لڑتے ہیں۔ میرا شمار ان دوسری قسم کے کتوں میں ہوتا ہے، مجھے اپنی ہڈی کے لیے لڑنا اور جدوجہد کرنا ہے۔"

وہ بہت تلخ ہوگیا تھا۔ اس کا کہا لفظ لفظ سچ تھا۔

"تو ناشکرا ہی ہے کاشا! کس چیز کی کمی ہے تیرے پاس، کیا...؟"

"کیا ہے میرے پاس؟ وہ ڈالرز کی بھیک، جو میری ماں اپنے شوہر کے چرا کے، اس سے چھپا کے میرے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اپنا گھر نہیں ہے میرے پاس، وہ گھر جس میں اب تو رہ رہا ہے وہ بھی اس شخص کا ہے، ابھی... یہ جو ہائی سوسائٹی کی لڑکیاں میرے آگے پیچھے منڈلاتی ہیں، سب کچھ مجھ سے چھن گیا تو ایک بھی دور دور تک نظر نہیں آئے گی، اس سے پہلے کہ میں اپنی اصلی اوقات میں آجاؤں، پائی پائی کا محتاج ہو جاؤں، میں اپنا کوئی بندوبست کرنا چاہتا ہوں، ساری زندگی ڈالرز تو نازل نہیں ہوں گے، آخر اس سلسلے کو کبھی تو بند ہونا ہی ہے، میں جو کر رہا ہوں کرنے دو مجھے۔"

اس کا اپنا موقف بہت مضبوط تھا۔ ایسے معاملات میں وہ کبھی کچھ نہیں سنتا تھا۔ ابھی بھی غنی کو کچھ کہنا بیکار لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر واپسی کے لیے وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ بہت سی یادیں، الجھنیں، باتیں، قصے اس کے ذہن کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ چوتھا دن تھا، وہ ابھی بھی بے یقین ہو رہا تھا کہ واپسی کا سفر وہ تنہا کاٹ رہا ہے۔ سب کچھ کتنا اچانک ہو گزرا تھا، اسے شک بھی نہ ہوا تھا کہ اس کی قسمت منزل کے اتنا قریب لا کر اسے دھوکا دے گی۔ زندگی اتنی محبت سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لے گی۔ اسے کس سے گلہ کرنا تھا شاہم سے؟ جسے ابھی بھی وہ درست اور اپنی ارادے پر صحیح گردانتا تھا۔ قسمت سے یا اس کے لکھاری سے؟ اس کی محبت یا نیت میں کبھی بھی کھوٹ نہیں رہی تھی۔ اس نے کبھی اپنے رشتے میں جھوٹ کا سہارا نہیں لیا تھا۔ اسے اپنی ذات سے ذرہ برابر بھی زک نہیں پہنچائی تھی۔ پھر ایسا کیوں؟ ان دونوں کے کس عمل کی سزا تھی یہ سب؟ جاتے ہوئے وہ بھی رو رہی تھی۔ یہ بھی رو رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ سکھی ہو کر نہیں کیا تھا۔ اس کی اذیت کا اندازہ بھی ارسل کو تھا۔ اس جیسی حساس لڑکی کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی یہ ہی کرتا۔ ان دونوں لاپروا اور کھلنڈرے نظر آنے والوں کی سوچ اتنی سطحی نہیں تھی۔

شاہم کے کردار پر شک تو اس نے ماہم کی حرکت پر بھی نہیں کیا تھا۔ اب کیونکر کرتا؟ اگر اس نے کہا تھا کہ وہ یہ سب بچوں کی خاطر کر رہی ہے تو سچ کہہ رہی ہوگی۔ ان کی دوری کا سبب یہ بچے ہی ہوں گے۔ خواب جب ٹوٹیں تو نیند کیوں نہیں آتی؟ اس نے بہت سوچا تھا۔ زندگی کو کہاں سے شروع کرنا ہے، کیسے جینا ہے اسے کیسے بھولنا ہے؟ کتنے لاتعداد سوالات تھے اور جواب ندارد۔

اسے شاہم سے کی گئی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔

وہ یونیورسٹی کسی کام سے آیا تھا۔ کھانے کا وقفہ تھا۔ آفس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے درختوں کے جھنڈ میں بنچ پر آ بیٹھا تھا۔ تب نظر اس لڑکی پر پڑی تھی جو پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر گھوم کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ کبھی بیگ کھول کر دیکھتی۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ اس سے رہا نہ گیا۔

"ہیلو.... ہیلو، ایکسکیوزمی میم، اینی پرابلم ودیو؟" اس کے بار بار پکارنے پہ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ چند ساعتوں کے لیے وہ مبہوت رہ گیا تھا۔ سفید مرمریں رنگت، آنکھوں میں ہلکی سی نمی، کھلے بالوں نے آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

"کیا ہے؟" وہ جتنی خوب صورت تھی بولی اتنا ہی برا تھا۔

"آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے؟" وہ ذرا سہم سا گیا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے؟" وہ کافی درشتی سے بولی۔

"مجھے تو تکلیف نہیں ہے۔ میں تو آپ کی تکلیف رفع کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جانے کیوں اتنی تسلی سے تھا۔ وہ اس یونیورسٹی کا اولڈ اسٹوڈنٹ تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ یونیورسٹی کسی کام سے آیا تھا۔

"دیکھیں، آپ اپنے کام سے کام رکھیں، میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔"

"کیوں ڈسٹرب ہیں، یہ ہی تو جاننا چاہتا ہوں۔"

اس نے آنکھوں میں آتی نمی کو ہاتھ سے رگڑا۔

"یہ ٹشو پیپر لے لیں۔" اس نے جیب سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خفیف سا ہوتے بڑھا ہوا ٹشو پیپر پکڑ لیا۔

"اب بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟" اس نے دوبارہ اتنی نرمی اور توجہ سے پوچھا کہ اس نے بتانا شروع کر دیا۔

"صبح منصور بھائی نے ایک ہزار دیے تھے کورس کی دو بکس کے لیے، پیسے کہیں گم گئے ہیں یا پھر کسی نے نکال لیے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ بھائی دیتا دوبارہ۔" اتنی سی بات پہ اس پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"نہیں، وہ کیا سوچیں گے کہ میں اتنی غیر ذمہ دار اور لاپروا ہوں۔" اس نے اپنا وہم بتایا۔

آپ کو پتا ہے، میں صبح ناشتہ نہیں کرتی، یونیورسٹی سے کچھ کھا لیتی ہوں، میں صبح سے بھوکی ہوں۔" اچانک اپنی بھوک کا بھی احساس ہوا تھا۔

"وہی بھائی، بھابھی کا مسئلہ، ظالم بھابھی، بھائی بیوی کا غلام، زن مرید۔ مظلوم بیچاری بہن۔"

"یہ.... یہ، آپ کیا کہتے جا رہے ہیں۔" اس کی غلطی فہمی کو رد کر دیا۔

"آپ کی امی بے چاری تو پھنس کے رہ گئی ہوں گی بہو اور بیٹی کے بیچ، آپ کے ابو زندہ ہیں؟" وہ بلا تکان ہانکتا جا رہا تھا۔

"پلیز چپ کریں۔" اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے چپ کروایا۔

"میرا کوئی بھائی نہیں ہے، ہم صرف دو بہنیں ہیں، منصور بھائی میری سسٹر کے ہزبینڈ اور میرے چچا زاد ہیں، میرے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" اس کے بولنے کے پیش نظر اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کی۔

"اوہ.... ایم سو سوری۔" اسے حقیقتاً افسوس ہوا۔

وہ یوں پہلی بار کسی لڑکی کے اتنا قریب بیٹھا تھا۔ شاید اس کے اندر اچانک کچھ بدلا تھا۔

"منصور بھائی بہت اچھے ہیں، پھر بھی مجھے دوبارہ مانگتے شرم آئے گی، وہ واپسی پر بکس کا ضرور پوچھیں گے۔" اسے پھر سے کتابوں کی پریشانی ستانے لگی۔

"ماہم باجی تو مجھے پہلے ہی لاپروا کہتی ہیں۔"

"آپ ایسا کریں، مجھ سے لے لیں، جب پاکٹ منی ملے گی لوٹا دیجیے گا۔" اس نے سارے مسئلے کا آسان سا حل بتایا۔

"اچھا....؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

شکل سے وہ کافی معقول اور شریف سا ہی لگ رہا تھا۔

"میں آپ کو ادھار دے رہا ہوں، واپس کر دیجیے گا۔"

"مجھے پانچ دن بعد پاکٹ منی ملنا ہے، میں لوٹا دوں گی۔" "بالکل ٹھیک ہے؟"

اس نے کہتے والٹ نکال کے کھول کر اس کی طرف بڑھا دیا اور نظریں اس کے صبیح چہرے پہ ٹکی رہنے دیں۔

"کافی ہیں۔" شاہم نے جھجکتے ہوئے ہزار کا نوٹ پکڑ لیا۔

"کافی نہیں، بہت کافی ہیں۔" وہ پھر سے بڑبڑایا۔

"میں.... جاؤں۔" وہ بالوں کو چہرے سے ہٹاتی، کتابیں سمیٹ کر نجانے اس سے پوچھ رہی تھی یا جتا رہی تھی۔

"اتنی جلدی تو فرار مت ہو.... مم، میرا مطلب ہے جاؤ۔" پھسلتی زبان پر قابو پا کر اس نے بے دلی سے کہا۔

"پانچ دن بعد۔" چلتے چلتے اس نے یاد دہانی کروائی۔

"ٹھیک اسی جگہ.... پانچ دن بعد، بھولنا نہیں۔" اسے اپنی گہری نظروں میں قید کرتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔

اس کی حالت کبھی ایسی نہیں ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ بہت محتاط تھا۔

اگلے دو دن میں اس نے پوری سچائی سے خود سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ بے نام لڑکی اس کے لیے بہت خاص ہے۔ تیسرے دن اس نے اسے لائبریری کے کوریڈور میں جا لیا۔

"رکو ایک سیکنڈ، میری بات سنو۔" وہ بھاگتا ہوا اس کے سامنے رستہ روکے آکھڑا ہوا۔

"ج.... جی۔" شاہم گھبرا گئی۔

"دو دن نظر نہیں آئیں، ڈھونڈ ڈھونڈ کے پاگل ہو گیا، اب صبح سے تعاقب کر رہا ہوں، رکتی نہیں ہو، ٹانگیں ہیں یا سپرنگ، چلتی جاتی ہو چلتی جاتی ہو۔" اپنے پھولے سانس کو بحال کرنے کے ساتھ وہ بولتا بھی جا رہا تھا۔

جب کہ وہ اور اس کی دوستیں بے حد حیرانی سے اس کے انداز تخاطب کو ملاحظہ کر رہی تھیں۔

"یہ کون ہے شاہم؟" اس کی ساتھی دوست نے کندھا مار کر پوچھا۔

"یہ.... یہ۔" شاہم کی سوئی اٹک گئی۔

اس کے ہوائیاں اڑے چہرے کو دیکھ کر وہ پھر سے اسٹارٹ ہو گیا۔

"میں ان کا کزن ہوں، بتاؤ نا شاہی۔" اس نے اپنے جھوٹ میں شاہم کو بھی گھسیٹا۔

شاہم اس کے اس رویے پہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ وہ کس طرح بات سے بات نکالتا جا رہا تھا اور کتنے مزے سے اسے شاہم سے شاہی بنا ڈالا تھا۔

"تم نے اپنے اس کزن کا ذکر کبھی نہیں کیا۔"

ایک دوسری لڑکی نے دلچسپی سے ارسل کو دیکھا۔

"کیوں؟ میں کیا امریکی صدر کا مشیر ہوں، جس کا ہر کسی سے تعارف کروانا ضروری ہے۔"

"ہاں بولو، کیا بات ہے؟" شاہم نے اسے اپنی دوست سے الجھتا پا کر بات سنبھالنا چاہی۔ شاہم اس پہلی ملاقات اور اب اس موجودہ صورت حال سے جان گئی تھی کہ اسے بے جا، لمبی بات بڑھانے کی عادت ہے۔

"بات تو بہت ضروری ہے، سب کے بیچ نہیں الگ آؤ ناں۔" اس نے ہاتھ اور آنکھوں سے پرے جانے کا اشارہ دیا۔

شاہم خود پر ضبط کرتی، فرینڈز سے معذرت کر کے اس کے ساتھ آ گئی۔

"میں نے پانچ روز کا پرامس کیا تھا، تم تین دن بعد ہی کیوں ٹپک پڑے ہو۔" تنہائی ملتے ہی وہ اس پر برس پڑی۔

"میں نے تم سے پیسے مانگے ہیں؟" وہ الٹا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تو پھر کیا پرابلم ہے۔"

"پرابلم۔" اس نے سر کھجاتے لفظ دہرایا۔

ہاں۔" یاد آنے پر اس نے الٹی ہتھیلی کی سیدھے ہاتھ پر تالی بجائی۔

"جب سے تم سے ملا ہوں، ٹھیک سے نیند نہیں آتی، دل کی دھک دھک، دھک معمول سے ہٹ کر تیز ہو گئی ہے اور...... اور جسم بے جان رہنے لگا ہے۔"

اس نے اپنی کیفیت اتنے بھونڈے انداز میں بیان کی تھی کہ شاہم کا جی چاہا کہ اس کے سر کے سارے بال نوچ ڈالے۔

"جسم بے جان ہونا بی پی شوٹ کر جانے کی علامت ہے۔ تم بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے ہو۔"

"اور...... اور میرا دل دھک، دھک...... دھک، دھک۔" اس نے اپنے دل پر ہاتھ اس انداز میں رکھا جیسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔

"کسی ہارٹ اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کرو، دل کا والو بند ہو گیا ہو گا۔" اس نے مزید مفید مشورہ دیا۔

"پیسے تمہیں دو دن بعد ملیں گے، کچھ خاص کہنا ہے تو کہو ورنہ میں جا رہی ہوں۔" وہ پیچ مڑ گئی۔

"ہاں خاص ہی کہنا ہے، بلکہ بہت خاص...... وہ کیا ہے ناں، مجھے، مجھے تم سے، آئی لو یو یار، بس...... اتنی سی تو بات تھی، تھوڑی سی جرات چاہیے تھی۔ یوں ہی میں باؤلا ہو رہا تھا، کچھ بھی نہیں ہوا۔"

اپنی بات کہہ کر وہ فرضی کالر جھاڑتا، خود ہی اپنا کندھا تھپتھپا کر خود کو داد دے رہا تھا۔ شاہم حیرت سے ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس سر پھرے کو تکتی رہ گئی۔

"کیا کہا تم نے؟" اس نے غصے سے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"کیا پھر سے کہوں؟ دوبارہ سننا چاہتی ہو؟" وہ بڑی تسلی سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ، میں تمہیں مار دوں گی، فضول انسان......" وہ غصے میں اس کے بال نوچنے کو لپکی۔

سامنے سے آتی گاڑی سے اس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ وہ اپنے خیالات سے واپس لوٹ آیا۔

"مار ہی تو دیا ہے تم نے مجھے۔" نم آنکھوں سے وہ بڑبڑایا۔

اسے دکھ تھا کہ شاہم نے اسے سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے۔ وہ اتنا آگے کا سوچنے سے پہلے اس سے ایک بار کہتی تو سہی، اسے کب بچوں سے انکار تھا۔ وہ اپنی کمٹمنٹ کا پکا تھا۔ اس نے اپنی ماں، گھر کو چھوڑا تھا، شاہم سے کیے گئے وعدے نہیں توڑے تھے۔ اب شاہم کو کوئی عہد دے کر کیونکر وہ نہ نبھاتا۔

شاہم کی بے بسی، مجبوری اور دکھ اس نے تب بھی اپنا ہی دکھ جانا تھا، جب وہ اس کے سامنے آنے سے کتراتی تھی۔ جب اسے زمانے کی رسوائیوں کا اندیشہ تھا، وہ گھر کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، وہ لوگوں سے ملنے سے کتراتی تھی۔ تب وہ ہی واحد شخص تھا جس نے اسے دلاسا دیا۔ اس سے کسی بھی قسم کی وضاحت نہ مانگی، ایک لفظ تک سننے کا روادار نہیں تھا۔ اس روتے نڈھال وجود کو سمیٹا اگر تب یہی شخص اس کے بارے میں مشکوک ہو جاتا تو وہ کیا کرتی، شاید مر ہی جاتی۔ اس ایک کا شک اور نفرت ساری دنیا پر بھاری تھی۔

جیسے اب ارسل سے اس کے شک کا بھار برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ ارسل نے ایسا کیا کیا تھا کہ اسے لگا کہ وہ مستقبل میں اسے اپنا ہم سفر منتخب کر کے بہت سی رکاوٹوں کا باعث بنائے گا۔ وہ کیوں اسے بچوں اور اپنے بیچ دیوار لگنے لگا تھا۔

وہ اس سے ہفتوں ملنے نہیں آتی تھی، اس نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا۔ وہ اکثر اوقات مصروف ہوتی، اس کی کال ریسیو نہ کر پاتی، وہ لاتعداد بار ٹرائی کرتا، شکوہ تب بھی اس کی نوک زبان پہ نہ آتا، اس گفتگو کا زیادہ حصہ صرف بچوں کے نام ہو جاتا، وہ دلچسپی اور مسکراہٹ سے سب سنتا۔

"شاہم کتنی بدل گئی ہے۔" اس نے بہت بار یہ سوچا تھا۔ اسے پہلے والی شاہم ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، کبھی کبھی اسے شاہم کی یہ تبدیلی اچھی لگتی، بہت ذمہ دار، مستقل مزاج، گرہستن سی شاہم۔ اس حادثے نے اسے کیا سے کیا کر دیا تھا۔ ورنہ ارسل تو سوچتا تھا کہ

شادی کے بعد مجھے اسے انگلی پکڑ کر سب سکھانا پڑے گا۔ مگر اس لاپروا' ننٹ کھٹ' رونے دھونے والی لڑکی نے اپنی سوچ اور مرضی سے کیا کیا کچھ سیکھ لیا تھا' نہ منصور جان پایا نہ ہی ارسل۔ اس نے زندگی کی تلخیوں کو اس رخ سے کب محسوس کرنا شروع کیا۔ ارسل کو خبر کیوں نہ ہو سکی۔ وہ تو اپنی ہر بات' ہر سوچ' ہر خواہش تک اس سے شیئر کیا کرتی تھی۔ ان تینوں میں سے بے خبر کون تھا؟

شاہم غیر محسوس انداز میں بچوں کے قریب ہوتی چلی گئی۔ ان پہ محبتیں نچھاور کرتے اسے بہت سے قرض اور قرض دار یاد آ گئے۔ منصور نے شاہم کی اس قدر توجہ پر اپنا دھیان بٹا لیا۔ وہ غفلت برتنے لگا تھا اور ارسل... شاہم کے منتظر ارسل کا کہاں' کیا قصور نکلتا تھا؟

شاہم کی محبت کا وہ بھی حق دار تھا۔ اس نے اپنے قرض داروں کی فہرست میں سے اس کا نام کیوں خارج کر دیا؟ یا وہ سمجھتی تھی کہ میں نے بھی ارسل سے محبت کر کے حق ادا کر دیا۔ اس سارے قصے میں گھاٹا کس کے کھاتے میں آیا؟ گھاٹے میں کوئی بھی رہا ہو' خالی ہاتھ' خالی دل تو ارسل رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی سے آنکھ کی نمی رگڑی تھی اور یہ ہی وہ پل تھا جب سامنے سے آتے ٹرالر نے اس بے خبر مدہوش کو کچل ڈالا تھا۔

مطیع الرحمٰن اور سائرہ رحمان ارسل کا انتظار کر رہے تھے۔ مطیع الرحمان نے سائرہ کو رات ارسل سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کا بتایا تھا۔ وہ تب سے اندر ہی اندر بہت نہال تھیں۔

ارسل کتنے عرصہ سے گھر سے نکلا' ان سے ناراض تھا۔ انہوں نے بھی اسے منانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب مطیع الرحمان کے منہ سے معافی کا ذکر سن کر انہیں یقین تھا کہ کچھ انہونا ہو گیا ہے ورنہ وہ ارسل کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ باپ کا لاڈلا' ماں کا دلارا اسے بھلا ماں کی یاد کیسے آ گئی۔ سائرہ رحمان نے اپنی آج کی تمام مصروفیات کینسل کر دی تھیں۔ وہ پہلی بار اتنی بے تابی سے ارسل کے انتظار میں مطیع الرحمان کی برابر کی شریک تھیں۔

"سائرہ! میں پھر بتائے دیتا ہوں' ارسل کی طبیعت مجھے کچھ بہتر محسوس نہیں ہو رہی تھی' تم کچھ بھی اس کے مزاج کے خلاف نہیں کہو گی' اور... اور اگر وہ معافی مانگے تو معاف کر دینا' آخر وہ بھی بیٹا ہے ہمارا۔"

مطیع الرحمان نے کوئی ساتویں بار سائرہ رحمان سے یہ سب کہا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں مطیع! اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے' میں بھلا اسے کیوں معاف نہیں کروں گی' غلطیاں بچوں سے ہو جاتی ہیں۔ والدین کو اپنا دل اور ظرف وسیع کرنا پڑتا ہے' وہ میری اولاد ہے۔" انہوں نے نہایت سنجیدگی سے انہیں رام کیا۔

ارسل سے مطیع الرحمٰن جتنا تو نہیں مگر پیار تو وہ بھی کرتی تھیں۔

"ابھی تک پہنچا نہیں' آ جانا چاہیے۔" مطیع الرحمٰن کو یک دم بے چینی نے گھیر لیا۔ وہ موبائل پہ اس کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

"کیا ہوا' پک نہیں کر رہا؟" سائرہ نے اٹھ کر ان کے قریب آ کر پوچھا۔

"موبائل آف کیوں ہے؟ عجیب لڑکا ہے یہ بھی' کہیں پھر سے غائب نہ ہو جائے۔" انہوں نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

"مطیع آپ معاذ کو کال کریں' وہ آ جائے پتا نہیں کیوں؟ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" وہ بھی ہاتھ مسلنے لگی تھیں۔

انہیں اپنی اس عجیب ہوتی حالت میں بڑے بیٹے کا خیال آیا تھا۔

"ڈونٹ وری' آتا ہی ہو..."

ان کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ باہر کسی انجان گاڑی کا ہارن بجا' چوکیدار نے باہر جا کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد گیٹ وا کر دیا۔

سائرہ اور مطیع الرحمان اتنے میں باہر آ گئے تھے۔ گیٹ سے ایمبولینس داخل ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے حواس اڑے چہروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چوکیدار' دو سیکیورٹی گارڈ اور مالی سب ایمبولینس سے سفید چادر کے نیچے وجود کو تھامے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان سب کے سر کسی بوجھ تلے جھک گئے تھے۔ سفید چادر سے ڈھکا وجود اب مطیع الرحمان کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔

"گگ... گگ' کیا ہے یہ؟" انہوں نے انگلی سے ایمبولینس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ... یہ کیا ہے' کک... کون ہے یہ؟" ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

وہاں موجود کوئی بھی کچھ بھی نہیں بولا۔

"مم... مطیع آپ معاذ کو کال کیوں نہیں کرتے وہ..." سائرہ ابھی بول ہی رہی تھیں کہ کھلے گیٹ سے معاذ کی گاڑی انٹر ہوئی۔ وہ بہت تیزی سے گاڑی سے نکلا۔ اس کے حواسوں سے بھی لگ رہا تھا کہ اسے یہ خبر مل چکی ہے۔

"معاذ... میرے بیٹے۔" سائرہ اس کی بانہوں میں سما کر رونے لگیں۔

"مم... معاذ! یہ..." مطیع الرحمان کی آنکھوں اور آواز میں نمی تھی۔

"پلیز ماما جان۔" معاذ ماں کو نرمی سے خود سے الگ کر باپ کی طرف بڑھا۔

"بابا..." اس نے باپ کو ساتھ لگاتے تھوڑا سا جھک کر سفید چادر کو چہرے سے ہٹا دیا۔

"نہیں۔" انہوں نے بڑے بیٹے کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"مطیع آپ... آپ نے کہا تھا کہ ارسل آ رہا ہے مجھ سے ملنے' معافی مانگنے... آپ... آپ نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا' پھر اب کیوں؟ میرا ارسل کہاں ہے' وہ کیوں نہیں آیا۔ ارسل! اٹھ میرے لعل تیری ماں تڑپ رہی ہے تجھے سینے سے لگانے کے لیے' اتنی بھی ناراضگی کیا بیٹا! ماں سے بولے بغیر ہی چلا جائے گا۔"

سائرہ نیچے گر کر بہت بے دردی سے رو رہی تھیں۔ وہ اسے جھنجھوڑنے لگی تھیں۔

"ماما جان! سنبھالیں خود کو پلیز' ایسا مت کریں۔"

معاذ باپ کو چھوڑ کر اب پھر ماں کو سنبھالنے لگا تھا۔ اس نے سائرہ کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ لیے۔ مطیع الرحمٰن دو تین قدم لڑکھڑائے اور زمین پہ ڈھے کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

آج صبح سے ہی اس کے پورے جسم میں یک گونہ خاموشی کا بسیرا تھا۔ ایسے جیسے دور تک صحرا میں ڈیرے ڈال لیے ہوں' تا حد نگاہ دھندلا سا غبار ہی غبار ہو۔ عمیر اور حمزہ کو اسکول بھیجا۔ انہوں نے اس سے کیا باتیں کیں۔ کس چیز پہ بے جا ضد کی' ان کے لنچ میں کیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ دعا کو نرم غذا کھلا کے ماجدہ کے حوالے کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں چکر لگاتے اس کی سوچ اور ہاتھ ہلکے ہلکے کپکپا رہے تھے۔ اس کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے پین کلر لینے اور چائے کا کپ پینے کا ارادہ کیا تاکہ اس سردرد سے جان چھڑائی جا سکے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے موبائل کی بیپ کبھی اتنی منحوس نہیں لگی تھی جتنی ابھی لگ رہی تھی۔

گومگو کی کیفیت میں گھرے اس نے دھیرے دھیرے قدم واپس بڑھائے۔

"ہیلو۔" کافی توقف کر کے اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اور جو کچھ اس کی سماعت سے گزرا' وہ اس کی ہمت سے بہت زیادہ تھا۔ زندگی کی اس ناہموار مسافت پہ وہ بہت بری طرح لٹ گئی تھی۔ قربانی کی نیت اس نے

باندھی تھی‘ وہ کیوں خود کو قربان کر گیا تھا۔ زندگی سے اس نے نظریں چرائی تھیں اور وہ منہ ہی پھیر گیا تھا۔

وہ فون پھینک کر تیزی سے بھاگی۔

ارسل کے گھر کا پتا اسے معلوم تھا مگر اندر جانے کا حوصلہ وہ کہاں سے لاتی؟

مطیع الرحمان نے اسے خود کال کی تھی۔ انہوں نے اسے ارسل کے آخری دیدار کے لیے بلوایا تھا۔ وہ ارسل کی میت کو شاہم کی روتی نگاہوں سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ شاہم کی محبت کا اتنا حق تو بنتا تھا۔

گھر سے تھوڑی دور اس نے گاڑی روک دی۔ باہر لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ابھی بھی بہت سے رشتے دار آرہے تھے۔ مرد زیادہ تر باہر ہی حزن و ملال میں گھرے کھڑے تھے۔ بہت رش تھا۔ اس کے موبائل کی بپ پھر سے ہونے لگی۔ مطیع الرحمٰن کا نمبر تھا‘ وہ اسے اندر بلانا چاہتے تھے۔ اس نے فون کاٹ دیا۔ وہ اندر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ بہت دفعہ ٹوٹی تھی اور سمٹ گئی تھی۔ اس بار بکھری تو اسے سنبھالنے والا‘ دلاسا دے کر چپ کروانے والا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کندھے کو جس پر وہ سر رکھ کر پر سکون ہو جایا کرتی تھی‘ اسے آج خود چار کندھوں کی ضرورت تھی۔

اس کی گاڑی کے قریب سے دو عورتیں باتیں کرتی گزر رہی تھیں۔ وہ شاید جنازے والے گھر سے ہی آ رہی تھی۔

"اس کے باپ کی حالت نیم دیوانوں جیسی ہو گئی ہے۔ خدا کسی کو جوان اولاد کا دکھ نہ دے‘ بڑے ہی بدنصیب ہوتے ہیں وہ ماں باپ جو اس عمر میں اپنی اولاد کو دفن کرتے ہیں۔" بولنے والی کے لہجے میں بہت درد پھوٹ رہا تھا۔

"بس جی۔ ہم انسانوں کی کیا اوقات‘ مغرب کے بعد جنازہ ہے‘ تمہارے بھائی جان کو کہوں گی شرکت کریں۔"

آوازیں دور ہوتی چلی گئیں‘ وہ وہیں رہ گئی۔

"میں نے تمہیں خود کو چھوڑنے کو کہا تھا ارسل! تم نے دنیا ہی چھوڑ دی۔" اسٹیرنگ پر سر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"تم نے ہمیشہ میرا ہر کہا مانا‘ اس بار ٹال دیتے..... کوئی اس طرح سے جاتا ہے بھلا..... مجھے ایک بار ہاتھ پکڑ کر روکا تو ہوتا ارسل! میں کب اتنی دور جا رہی تھی‘ جتنی دور تم چلے گئے ہو۔ میری بے وفائی کی اتنی بڑی سزا‘ پلیز ارسل..... لوٹ آؤ..... میں کبھی بھی کہیں نہیں جاؤں گی.....۔"

اس کے سارے حوصلے ڈھے چکے تھے‘ وہ آنسوؤں کے ریلے میں بہتی جا رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں محبت اور لہجے میں نرمی سموئے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرنے والا اب کہیں نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا‘ وہاں‘ جہاں جا کر کوئی بھی نہیں لوٹتا۔

مگر اسے تو لوٹنا ہی تھا۔ وہ بھی خالی خالی گھر لوٹ آئی تھی۔ یہی اس کا ٹھکانہ تھا۔ اس گھر کی بہتری کے لیے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا‘ سب کچھ۔

☼ ☼ ☼

"ماجدہ! اوپر آؤ۔" اس نے انٹرکام پہ ماجدہ کو بلوایا۔

تھوڑی دیر میں وہ حاضر تھی۔ "جی شاہم بی بی۔"

"منصور کو آفس کال کرو‘ کہو‘ جلدی گھر آئیں‘ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" بے تاثر بیٹھے غیر مرئی نقطے کو گھورتے اس نے ماجدہ کو حکم دیا۔

ماجدہ نے عجیب سی نظروں سے اس کے تحکم بھرے انداز کو دیکھا اور سر ہلاتی چلی گئی۔

منصور پہلے ہی شاہم کی اس نئی حرکت سے نالاں تھا۔ اب اس نئی افتاد پہ اسے کوفت ہونے لگی۔ وہ اس سے بہت کٹنے لگا تھا۔ شاہم کا نقطہ نظر اپنی جگہ سو فیصد درست سہی‘ مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا‘ جو اس بے وفا کو بھولتا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی نئی وفا کی راہیں کیسے ہموار کرتا‘ پھر بھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گیا تھا۔



"کدھر ہے شاہم؟" اس نے نیچے صفائی کرتی ماجدہ سے پوچھا۔

"اوپر اپنے کمرے میں۔" اس نے رک کر جواب دیا اور پھر کام کرنے لگی۔

وہ کارپٹ پہ اجڑی‘ بکھری بیٹھی تھی۔ منصور بھی اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔

"آر یو اوکے؟" جانے کیوں اسے اپنا یہ سوال بہت احمقانہ سا لگا۔

شاہم کے چہرے کے تاثرات اور پتھریلی آنکھوں نے اسے اندر سے سہما دیا تھا۔

"مجھ سے شادی کب کریں گے؟"

وہ امپیور سی شاہم کہاں کھو گئی ہے؟ یہ اجنبی سی‘ اتنی دور اندیش کون ہے؟" منصور نے اس پر نظریں گاڑے سوچا۔

"اور ارسل.....؟" منصور نے ٹریک بدلا۔

"Sacrifice (ایثار) کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے‘ مجھ میں ابھی سکت ہے۔" وہ بہت شکست خوردہ سہی‘ مگر ہارنے کو قطعاً تیار نہیں تھی۔

"ہمت ٹوٹ جائے تو سب سے پہلا احساس غلطی کا ہوتا ہے‘ پھر واپس پلٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا‘ اپنی طاقت سے زیادہ خود کو مت آزماؤ۔"

منصور کی سوچ بہت دور کی تھی۔

"واپس تب مڑا جاتا ہے‘ جب پیچھے رہ جانے والے منتظر ہوں‘ میں نے اپنے ماضی کی راہوں میں کسی کو منتظر نہیں چھوڑا۔ جو تھا‘ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔" دھیما لہجہ کھو سا گیا تھا۔

"کیا مطلب.....؟" منصور جان نہ پایا۔

"ارسل..... ارسل مر گیا ہے۔"

اس کے اس جملے نے منصور کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسے شاہم کی ذہنی حالت پہ شبہ ہوا۔ اس نے غور سے اسے پرکھا۔ وہ صبح اسے بھلی چنگی چھوڑ کر گیا تھا۔ اب اس کی آنکھیں روئی روئی‘ سرخ سی اور چہرہ صدیوں کا تھکن زدہ تھا۔ اس کی بربادی کے آثار بہت واضح تھے۔

"قسم کھا کر کہتی ہوں‘ میرے پاس بھی جینے کا کوئی جواز نہیں‘ سوائے آپ کے‘ مغرب کے بعد نکاح پڑھوائیں مجھ سے ورنہ میرے..... میرے کفن دفن کا انتظام کر لیں۔ آپ کو نہیں‘ مگر جانے والے کو وہاں بھی میری ہی ضرورت ہے۔"

اس کے کہنے میں‘ اس کے رویے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ منصور ڈگمگا گیا۔ ارسل کی موت نے اسے اس قدر دہلایا تھا کہ وہ کسی نئی مصیبت کا متحمل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ شاہم کے کہے پر شک و شبے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بچوں کی خاطر منصور سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا اور اب اگر وہ بھی.....

شام کے ملگجے سے اندھیرے میں وہ کمرے میں دونوں ہاتھ گود میں دھرے بے حس‘ ساکت و صامت سی بیٹھی تھی۔ مغرب کی اذان ابھی ہوئی تھی۔ نماز کی ادائیگی کا فریضہ مساجد میں بڑے خشوع و خضوع سے ادا کیا جا رہا ہے۔

نماز کے بعد دو مولویوں نے دو مختلف جگہوں پر دو مختلف کام سرانجام دینے تھے۔ ایک نے دو اجنبیوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر شاید نئی زندگی کی نوید دینا تھی اور دوسرے نے کسی کی لحد سے سپردگی سے پہلے نماز جنازہ پڑھانا تھی۔

وہ نکاح کے لیے مولوی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے جذبات اتنے سرد ہو چکے تھے‘ جیسے مردہ۔ اس کے کپڑے ملگجے تھے‘ بالوں کو یونہی سمیٹا گیا تھا‘ لٹیں نکلی ہوئی تھیں‘ ہونٹ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست‘ چہرے پہ درد اور خوف کی وحشت تھی۔

اس کے اندر کی گھٹن آنسوؤں کے رستے نکاس کا رستہ پا سکتی تھی مگر اپنی زندگی کا اتنا مکمل حصہ کھو کر وہ رو بھی نہیں پا رہی تھی۔

منصور شیف‘ ڈرائیور‘ سیکیورٹی گارڈ اور مولوی کے ساتھ اندر داخل ہوا‘ وہ کمال ضبط سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

نمازِ جنازہ کے لیے امام آگے کھڑا ہو گیا۔ پیچھے لوگ صفیں درست کر رہے تھے۔

"منصور رضا ولد خطیب رضا بہ عوض....."

امام نے نیت باندھ کر پہلی تکبیر بلند کی۔

"منصور رضا ولد خطیب رضا بہ عوض....."

امام نے بڑی رقت سے ثناء پڑھ کر دوسری تکبیر لگائی۔

تیسرے اقرار اور تیسری تکبیر کے ساتھ ہی کتنا کچھ الگ ہو گیا تھا۔

وہاں اُدھر ایک نئے بندھن کے اٹوٹ ہونے کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گئے۔ اِدھر کسی کی دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے گئے۔

اِدھر ارسل کو اپنی منزل تک رسائی مل گئی تھی اور اُدھر شاہم نے ناہموار کٹھن رستوں کے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات کو دس بجے ضروری میٹنگ نبٹا کر لوٹا تھا کہ پورچ میں کاشا کی لگژری مرسڈیز کھڑی دیکھی۔ اس کی گاڑی ہمیشہ کی طرح پورچ کے وسط میں کافی سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے تھی۔ کاشا کے آنے کی خوشی میں وہ اپنی گاڑی پچھلی سائیڈ پہ لگا کے بغیر جھنجلائے بڑے خوشگوار موڈ میں اندر آیا۔ اس نے رات کاشا کو یہیں ٹھہرانے کا ارادہ کیا۔

چار سو خاموشی کا راج تھا۔ کاشا کی موجودگی میں در و دیوار خاموشی کو ترستے تھے۔ صوفے پہ بریف کیس رکھ کر وہ ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ دھرے جگ میں سے پانی کا گلاس پیا۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے وہ کاشا کے کمرے کی طرف آ گیا کہ شاید وہ شاور لے رہا ہو۔ کاشا کا کمرہ استعمال کی سب چیزیں حتیٰ کہ کپڑے بھی یہاں موجود تھے۔ اس کی ضرورت کا سارا سامان ویسے ہی دھرا تھا، جیسے اس کی رہائش سے قبل تھا۔

ہینڈل گھمانے پہ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کاشا نے پیچھے مڑ کر دیکھا صرف لمحہ بھر کے لیے اس کی اور غنی کی نظریں ملی تھیں۔ اگلے پل غنی نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔ اس سے ٹیک لگا کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا، جو منظر وہ دیکھ چکا تھا، اسے پاگل کرنے کو کافی تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری سی ہونے لگی۔

کوٹ کا بٹن کھول کے اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ تنفس کے بحال ہوتے ہی غصہ اس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ اس نے خود ہی باہر آ جانا تھا۔ دس منٹ اس نے کھولتے ہوئے وال کلاک کی گھڑیاں گنتے گزارے۔

"تو ہمیشہ ہی غلط وقت پہ انٹری مارتا ہے۔" وہ بدن پہ بنیان چڑھاتے ہوئے نکلا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ کاشا، ہاؤ ڈیئر یو؟ اس گناہ کی پوٹلی کو گھر کی حدود میں لے آیا؟" دھیمی آواز میں وہ چیخ پڑا۔ اس کی ہر بری حرکت باہر تک ہی محدود رہی تھی۔

"تیرا میٹر کیوں گھوم رہا ہے۔" وہ رتی بھر بھی خفیف نہیں ہوا تھا۔

دروازے کو اچھی طرح بند کر کے وہ سابقہ مطمئن انداز میں الٹا اسی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"کون ہے یہ عورت؟" اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "کیوں لایا ہے اسے یہاں اور کیا کر رہا تھا؟" غنی نے اپنے دماغ کو کھولاتے سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

"فرسٹ۔" اس نے ایک انگلی اٹھائی۔ "شی از مائی سیکنڈ وائف لیلیٰ اینڈ سیکنڈ....." اس نے دوسری انگلی اٹھائی۔ "اس کا کہیں اور ٹھکانہ نہیں تھا، اینڈ لاسٹ از ناٹ فیر، اب تم اتنے بچے چوچے نہیں ہو۔"

کاشا نے آخری جواب دیتے خباثت سے مسکرا کر اس کے گال کو چھیڑا۔

وہ جو اس کی اس بم بلاسٹ سچائی کو اپنی سماعتوں میں اتار رہا تھا زور سے ہاتھ جھٹک دیا۔



"ڈونٹ ٹچ می، ڈونٹ ٹچ می اگین کاشا! تم نے دوسری شادی....." نفی میں سر ہلاتے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں نے بس شادی کی ہے، پہلی اور دوسری کی گھمن گھیری میں نہیں پڑتا، تو اتنا ہائپر نہ ہوا کر۔" کاشا کو اس کا یوں ہاتھ جھٹکنا سخت برا لگا تھا۔

"تو اس قدر کول ڈاؤن کیسے ہے؟ ایک عورت تیری بیوی، تیری واپسی کا انتظار کر رہی ہو گی اور تو دوسری کو پھنسا کر اس کے ساتھ جڑا ہے۔ وہ..... وہ جو تیری خاطر اپنی اولاد، شوہر، بسا بسایا گھر چھوڑ کر آئی ہے، اس کی..... قربانی کا یہ صلہ دے رہا ہے تو....."

غنی تیز تیز بولتے شاہم کی حمایت کرتا اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اپنا والیوم کم کر۔ وہ سن لے گی۔" اس نے بپھرے ہوئے غنی کا بازو کھینچ کر دانت کچکچا کر کہا۔

"آئی ڈونٹ کیئر، بھلے سن لے، تو نے اپنے اس اقدام کا مجھ سے تذکرہ تک نہیں کیا۔"

"ایمرجنسی میں نکاح کرنا پڑ گیا یار! موبائل آف مل رہا تھا، آفس کال کی تو میٹنگ کے لیے نکل چکا تھا، پھر میں نے تجھے بتایا نہیں۔"

اس نے اپنی جلد بازی کی وضاحت دی تاکہ وہ نرم پڑ جائے۔

"اینی وے، جو بھی ہوا، اب اس عورت کو فوراً یہاں سے نو دو گیارہ کر۔" اس نے نہایت غصہ میں کہا۔

"صرف..... ایک رات برداشت کر لے۔" اس نے بڑے رسان سے کہا۔

"ٹھیک ہے تو اسے رکھ اور خود بھی رہ، میں جا رہا ہوں۔ جب یہ دفع ہو جائے گی تب واپس لوٹ آؤں گا۔"

قطعیت سے کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

"غنی..... غنی، سن غنی..... اپلیز رک تو سہی۔" وہ ٹی وی لاؤنج تک سست روی سے چلتا اسے آوازیں دیتا آیا

تھا۔

اس کے گاڑی اسٹارٹ کر لینے پہ وہ کافی دیر تک یونہی ٹکا کھڑا رہا۔ پھر تجانے اسے کیا ہوا کہ لیلیٰ کو جلد سے جلد یہاں سے جانے کو کہہ دیا۔ وہ کاشا کے اتنی جلدی بدلتے روپ پہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کا احتجاج کاشا کے مضطرب چہرے میں دب سا گیا۔ لیلیٰ کو ڈراپ کر کے اس نے ماہم کو بھی اطلاع کر دی کہ وہ غنی کی طرف ہے۔ لیٹ آئے گا۔

غنی اور اس کا اتنے سالوں کا ساتھ تھا۔ ان کے بیچ کبھی خفگی بھی نہیں ہوئی تھی پھر غنی کب اس کی کسی بات کا برا مانتا تھا۔ کاشا جس نے کبھی کسی کی نصیحت نہ سنی، مشورہ نہ مانگا، غنی کو وہ ہر طرح کا اختیار دیتا تھا۔ چاہے وہ عمل کرے نہ کرے، خاموشی سے سن ضرور لیتا تھا۔ غنی اس کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتا، وہ ہنستے ہوئے نظر انداز کرتا جاتا۔ وہ تقریباً ہر رات ہی اس سے تفتیشی پوچھ گچھ کرتا اور وہ بڑے تحمل سے وضاحت دیتا جاتا، حالانکہ جواب میں رد و بدل بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسے غنی کی روک ٹوک کبھی بری نہ لگی۔ بس اسے کاشا کی ایسی نازیبا حرکات گھر کی حدود میں کرنا سخت ناپسند تھا۔

کاشا نے کبھی اختلاف نہ کیا حالانکہ یہ گھر بھی اس کے سوتیلے باپ کی ملکیت تھا۔ غنی اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے یہاں سب کچھ کر سکتا تھا۔ کوئی پوچھنے والا یا انگلی اٹھانے والا بھی نہیں تھا مگر وہ غنی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں خود سے وابستہ لوگوں اور رشتوں حتیٰ کہ اپنی ماں تک کی پرواہ نہیں کی تھی مگر وہ غنی کے لیے پریشان تھا۔

رات کے ڈھائی بجے لان میں چکراتا پھر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہت اہم تھے۔ محبت بھی بہت تھی، یہ بھی وہ جانتا تھا مگر وہ اس قدر اندر سے اس سے جڑا تھا، اس کا احساس اسے اس کا انتظار کرتے ہوا۔ سحر طلوع ہوئی جا رہی تھی مگر وہ نہ آیا۔ کاشا آٹھ بجے تک اس کی راہ دیکھتے لوٹ آیا۔ سارا دن وہ وقفے وقفے سے اسے کال ملاتا رہا، بیل جاتی رہی مگر اس نے

کال ریسیو نہ کی۔ کاشانے بھی دوبارہ اس سے رابطہ نہ کیا' نہ وہ گھر گیا۔ ان دونوں کے مابین ان دیکھی سرد سی خاموشی چھاگئی۔

☼ ☼ ☼

حالات میں کتنا اتار چڑھاؤ آگیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ سردیوں کی شامیں طویل ہونے لگی تھیں۔ سردیوں کی شام کی خنکی اب مست ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لبریز ہوئی۔ خزاں رسیدہ درختوں کی اجڑی ہوئی شاخوں پہ ننھی ننھی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ سورج کی حدت حرارت بخش تھی۔ اس بدلتی رت میں کتنے چہرے' کتنے لوگ' رشتے بدل گئے۔ کون کہاں چپکے سے بچھڑ گیا' کہیں کوئی مجبورا" بے بسی کی حالت میں کسی کا ہم سفر بن گیا۔ زندگی بھی کبھی کسی من چلے کی طرح کتنی غیر مستقل مزاج ہو جاتی ہے کسی نقطہ پہ رکتی ہی نہیں۔ آوارہ گرد' بے پروا' من موجی سی' اپنی ہی مستی میں گنگناتی ہوئی یونہی چلتے چلتے کبھی کسی کا سب کچھ چرا لیا' کبھی کسی کی جھولی بن مانگے بھر دی۔

زندگی سے موت تک کا سفر کوئی کس طرح طے کرتا ہے۔ ارسل مر کر پل پل کے عذاب سے چھٹکارا پا گیا۔ اس سے وابستہ محبت کی لڑیوں میں پروئے رشتے' والدین' دوست عزیز و اقارب روئے دھوئے' صف ماتم بچھی' دکھ' تسلی' تاسف کے لفظوں سے دلاسا دیا گیا۔ مگر اس کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کوئی خاموشی سے مر گیا' خبر بھی نہ ہوئی۔ نہ کسی نے سینے سے لگایا۔ نہ ہی اپنے کندھوں پہ بار اٹھایا۔

ان دونوں اموات میں بظاہر بہت فرق ہے مگر۔۔۔

منصور جیسا سمجھ دار' زیرک بندہ بھی خود اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ جانے کیوں اس کے اندر سے آواز سی اٹھتی۔ شاہم روتی کیوں نہیں؟ شاہم اتنی مضبوط کس طرح لگتی ہے؟ اس نے نکاح والی رات شاہم کو آخری بار روتے پایا تھا' پھر کبھی نہیں۔ اس کے چہرے پہ' آنکھوں میں اک ٹھہراؤ سا تو تھا۔ جیسے کچھ بھی بڑا اور برا نہیں ہوا۔ وہ ان دونوں کے چہروں سے چھلکتی محبت کا آنکھوں دیکھا گواہ تھا۔ شاہم کا نارمل رہنا اسے ابنارمل کر دیتا تھا۔ نہ تھکن کی کوئی جھلک' نہ ہی مایوسی کی کوئی رمق۔

اپنے ہی طور پہ اس کے اندر شاہم کے لیے ایک کھنچاؤ سا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ شاہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ اب یہی زبردستی اسے کھلنے لگی تھی۔

یہ تو صرف شاہم ہی جانتی تھی کہ اس کی روح تک میں کتنا گمبھیر' جامد اور خوف ناک سناٹا اتر گیا ہے۔ قربانی کے حقیقی معنوں سے آشنائی تو ارسل کی موت کے بعد ہوئی تھی۔ جن بچوں کی خاطر اپنا سب سے قیمتی اثاثہ موت کی آغوش میں سلا دیا' اب اس جانے والے پہ ہلکان ہو کر وہ اس قربانی کو رائیگاں نہیں کر سکتی تھی۔

ارسل اور اس کی جدائی کا بہانہ یہ بچے بنے تھے تو اب ان سے محبت اور پرورش کے عہد کی پاس داری اسے کرنا تھی تاکہ روز قیامت اسے اس وفا پر قربان ہونے والے کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہ اس کی روح اور اپنے ضمیر کے آگے جھوٹی نہ پڑے۔ وہ خشک آنکھوں' بے تاثر چہرے اور نیم مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی' حالانکہ جن کڑے لمحوں سے وہ گزری تھی' اسے بہت وقت چاہیے تھا خود کو سنبھالنے کے لیے' سمجھنے کے لیے' مگر اس نے خود کو ذرا سی بھی رعایت نہ دی۔ وہ منصور کے سامنے اس لیے نہیں روتی تھی کہ کہیں وہ اس کے کردار کا موازنہ ماہم سے نہ کرنے لگے' اس زبردستی کے رشتے میں شک کی دراڑ نہ پڑ جائے' وہ اس کی طرف شکوک بھری نگاہ نہ ڈالے۔ وہ ڈرتی تھی اور۔۔۔

اور پھر شاید اس نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا تھا' وہیں اپنے آنسوؤں کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا ہنر بھی سیکھ لیا تھا۔ پھر وہ کندھا تھا' نہ نرم پوریں اور نہ ہی ٹشو پیپر۔

اب اس کی ذمہ داریوں میں منصور کا بھی اضافہ ہو گیا تھا' جبکہ منصور نے "اپنی" ذمہ داری ابھی تک

قبول نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح بہت بھاگم بھاگ ہوئی تھی۔ عمیر کی ٹائی نہیں مل رہی' حمزہ بیڈ کے نیچے گھسا پنسل باکس ڈھونڈ رہا ہے' افراتفری میں چیزیں پوری ہوئیں تو کھانے میں شور ہنگامہ' دعا کی اپنی الگ سے چیخ و پکار' ان سب سے بمشکل فراغت پاتے ہی منصور کی تیاری۔

منصور کے کھنچاؤ کو بہت تسلی سے برداشت کرتی وہ اس کے ہر کام' ہر فرض کو اولین فرض میں شمار رکھتی۔ پہلے وہ صرف بچوں تک محدود تھی' منصور کے کسی کام میں مداخلت نہ کرتی تھی' مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ منصور' اپنے شوہر سے بے اعتنائی کیوں برتتی۔ بچوں سے فارغ ہو کر وہ منصور کی طرف آگئی تھی۔

وہ شاور لے رہا تھا۔ ہر روز کی طرح منصور نے شاہم کے نکالے ہوئے کپڑے وارڈ روب میں رکھ کر اپنی مرضی سے نکال لیے تھے۔ بیڈ پر پڑے لباس کو پھیکی مسکراہٹ سے اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا تیسرا بٹن غائب تھا۔ ماجدہ پہ جھنجلانے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ سوئی دھاگے والا ڈبہ لے کر بٹن ٹانکنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں وہ بھی واش روم سے باہر آگیا۔

"چلے گئے بچے؟" بالوں میں تولیہ رگڑتے وہ باہر نکلا۔

"جی' تھوڑا لیٹ ہو گئے' کمرے میں آئے تھے۔ آپ شاید باتھ روم میں تھے۔" دانت سے دھاگہ توڑ کر اس نے بتایا۔

"یہ کام ماجدہ کے کرنے کے ہیں۔ تم خوامخواہ تکلیف کرتی ہو۔" اس کے ہاتھ سے شرٹ پکڑتے وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ کے کام کرنے میں تکلیف کیسی۔" وہ ہولے سے مسکرادی۔

"بہتر ہے خود کو بچوں تک محدود رکھو' ملازم ٹہلنے کے لیے نہیں ہیں۔" کپڑے اٹھائے وہ ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

اس نے تکیے درست کر کے' بیڈ شیٹ کی شکنیں نکالیں' چارج پر لگا ہوا موبائل اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا' گھڑی' والٹ' گلاسز اور کی چین سب ڈریسنگ ٹیبل پہ منتقل کر دیا تاکہ کوئی چیز بھول نہ جائے یا ڈھونڈنا نہ پڑے۔

کف لنکس بند کرتا وہ مکمل تیار ہو چکا تھا۔

"آپ بتائیں' ناشتے میں کیا بناؤں' اس روٹین کے ناشتے سے تو میرا دل اوب گیا ہے۔" ہیر برش اس کی طرف بڑھاتے وہ پوچھ رہی تھی۔ منصور کی اب سے کچھ دیر پہلے کی گئی تنبیہہ کا اس پر قطعاً" اثر نہیں ہوا تھا۔

"جو کھانے۔۔۔۔ کو جی چاہے۔۔۔۔ بنالو' مرضی ہے تمہاری۔" اس کی ساری توجہ بال سنوارنے پہ تھی۔

"آپ کے دل کی بھی تو کوئی مرضی ہو گی۔" اسے بغور دیکھتے اس نے کہا۔

منصور کے ہاتھ رک گئے۔ برش رکھ کر وہ اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگا۔

"میرے دل تک رسائی ممکن نہیں۔" گھڑی کلائی میں ڈالتے اس نے اس کہا' پھر بریف کیس اٹھایا تو شاہم چونک کر بولی۔

"بریک فاسٹ۔" شاہم خفیف سی ہو گئی تھی۔

"آئی ایم گیٹ آنگ لیٹ۔" (مجھے دیر ہو رہی ہے) جاتے ہوئے اس نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔

ایسے میں ماضی کے بہت سے دریچے کھلنے لگتے مگر اس نے بھی ماضی کے سارے کواڑ اپنے ہاتھوں سختی سے بند کیے تھے۔ وہ ہر ہمکنے والی یاد کو کسی اچھے مستقبل کی امید پہ' خود کو ڈانٹ کر یا کسی کام میں مصروفیت ڈھونڈ کر جھٹک دیتی۔ مگر بہت سی یادیں پوری ڈھٹائی سے وارد ہوتیں' ان ہی سے جان چھڑانے کی کوشش اس نے اپنے طور پر کی تھی۔ شاہم کو اپنے کمرے سے منصور کے بیڈ روم میں شفٹ ہونا ہی تھا' حالانکہ اس کا دل ہرگز نہیں مانتا تھا کہ وہ اس کمرے میں اس قدر استحقاق سے جائے ۔۔۔۔۔۔



منصور نے اس سے کہا بھی نہیں تھا' وہ اپنی زندگی سے وابستہ رہنے والی کی چھوڑی ہوئی جگہ آج بھی کسی کو دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ شاہم کے کمرے میں سیٹنگ کا سوچتا تھا۔ پھر شاہم کے پاس بھی اپنے کمرے میں نقش چند قیمتی لمحات تھے' جو اس کا زندگی بھر کا اثاثہ تھے وہ بھی اپنا روم کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔

بالآخر وہ دونوں نچلے پورشن کے ماسٹر روم میں سیٹ ہو گئے کیونکہ بچوں کا کمرا بھی نیچے ہی تھا اور اب انہیں شاہم کے ساتھ سونے کی عادت بھی پڑ چکی تھی۔ دعا اس کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ اس بڑے سے کمرے میں حمزہ اور عمیر کے لیے سنگل بیڈ لگا دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دوپہر میں اس نے چاکلیٹ کیک بنایا۔ اس نے ٹی وی چینل سے متعدد بار کیک کی ترکیب نوٹ کی تھی۔ شیف کی مدد سے اس نے کیک تیار کر ہی لیا۔ اسے فریج میں رکھ کے پکن کا بکھیڑا سمیٹا۔

شام کو جب منصور آفس سے لوٹا۔ اس نے چائے کے لوازمات کی ساتھ اپنی محنت کا بھی اضافہ کر دیا۔

"یو نو پاپا! ماما نے بنایا ہے یہ چاکلیٹ کیک۔"

حمزہ نے جب سے سنا تھا' شاہم نے کیک بنایا ہے تب سے اس کی رال ٹپک رہی تھی۔ وہ ماں کے ہاتھ کا بنا چکھنا چاہتا تھا۔ شاہم نے ہی منع کر دیا کہ پاپا آجائیں تو اکٹھے کھائیں گے۔

"ہوں۔" حمزہ کی بات پہ ہنکارا بھرتا وہ دعا کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔

اس نے پہلا پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کے منصور کے آگے رکھا اور پھر عمیر' حمزہ کو دیا۔ منصور کے لیے چائے کا کپ بنا کر وہ دعا کے لیے پلیٹ لے کر دوسرے صوفے پر آبیٹھی۔

"مام! ریئلی ویری ٹیسٹی' اسی لیے چھپا کر رکھا گیا تھا۔"

حمزہ مزے سے کھاتے ہوئے بولا۔

"ماما میرا برتھ ڈے کیک آپ کو بنانا ہے' ابھی سے آرڈر ہے۔۔۔۔"

"اور میرا بھی۔۔۔۔" حمزہ نے فوراً" عمیر کی بات اچکی۔

"او کے بابا او کے! آپ دونوں کے لیے بناؤں گی ماں کی جان' آپ کی ماں چوبیس گھنٹے آپ کے لیے حاضر ہے' سب کر دوں گی۔" اس نے فوراً" حامی بھرلی۔ مبادا ابھی مار کٹائی نہ شروع ہو جائے۔

"آپ نہیں لے رہے پاپا!" عمیر کا دھیان منصور کی پلیٹ پہ چلا گیا۔

"ہاں۔۔۔۔ ہاں' میں لے رہا ہوں' آپ کھاؤ۔" عمیر کے گال پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے بولا' مگر وہ چائے کے سپ لیتا رہا۔ وہ دونوں بھائی کیک کھا کر باہر لان میں کھیلنے چلے گئے۔

شاہم نے بے دلی سے برتن سمیٹ لیے۔

☼ ☼ ☼

غنی بڑے مست موڈ میں ست رفتار میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ سگنل پہ گاڑی روک کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو دوسری سڑک پر ہسپتال کی پارکنگ میں اسے کاشا نظر آیا۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا' وہ پچھلی سیٹ پہ کچھ پھینک کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گرین سگنل پہ غنی نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔ کاشا کو پانچ ہفتوں بعد یوں دیکھ کر اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ تین گھنٹے بعد گھر واپسی پہ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ گھر کے اندرونی حصے میں آتے ہی اسے عجیب سے احساس نے یکدم گھیرا' اس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔

"رحیم۔۔۔۔ رحیم خان۔" اس نے ملازم کو پکارا۔

"جی صاب!" وہ مؤدب حاضر تھا۔

"کاشا کہاں ہے؟"

اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کاشا آیا ہے؟ بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کی چھٹی حس نے آگاہ کر دیا تھا۔

"وہ جی تھوڑی دیر ہوئی' چلے گئے۔"

"آیا کب تھا؟" اس کی بے قراری قابل دید تھی۔

"وہ تقریباً" ڈھائی گھنٹے پہلے آئے تھے۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے کھانے کا پوچھا انکار کردیا' بولے "اکیلا چھوڑ دو۔ ڈیڑھ گھنٹہ اندر بند رہے اور پھر اٹھ کے چلے گئے۔" رحیم خان نے ساری تفصیل بتادی۔ اس نے اثبات میں سرہلایا اور کمرے کی طرف مڑ گیا۔

"آپ کے لیے کچھ لاؤں صاب؟"

اس نے اثبات میں سرہلا کے جاتے ہوئے غنی کو پکارا۔

"نہیں' تم جاؤ بس۔"

وہ انکار کرتا اپنے کمرے کے بجائے کاشا کے کمرے میں آگیا۔ جب سے وہ گیا تھا' وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے اپنائیت کا شدت سے احساس ہوا' جیسے وہ کاشا کے گلے لگ گیا ہو۔ شاید یہ اس کی یہاں موجودگی کی وجہ سے تھا۔ کاشا اور اس کی تصویریں اور اس کی اکیلے کی تصویریں' اس کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ اس کی قد آدم تصویر کے پاس آرکا۔

"سنتا تو ہے میری' پر مانتا کیوں نہیں' آئے گا نہیں میرے پاس..... میرے گلے سے لگنے..... اپنا فلسفہ سنانے..... پلیز کم بیک کاشا..... پلیز۔"

اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ آنکھوں میں ٹھہری نمی کو انگلیوں سے مسل کر اس نے بغور ہر طرف کا جائزہ لیا۔ مرکزی ٹیبل پہ جام کے خالی گلاس نہیں تھے' نہ ہی ایش ٹرے میں سگریٹ کا کوئی ٹوٹا' گیلا تولیہ بھی دوہرا تہرا کر کے بیڈ پہ نہیں اچھالا گیا تھا۔ کارپٹ بھی جوتے کی مٹی سے نہیں اٹا تھا۔ کاشا کب سے اتنا مہذب ہو گیا تھا۔

"کاشا اور اس کی فوٹو تھی' جس میں کاشا نے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ اس فوٹو کے نیچے غنی نے کاشا کے لیے ایک عبارت لکھ دی تھی۔

"You are always winner"

کاشا اس عبارت کو پڑھ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دابے دھیما دھیما مسکراتا رہا تھا۔ اس کا ابھی یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ صوفے پہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گیا۔ کارپٹ پہ نظریں جمائے اسے کچھ یاد آرہا تھا۔

"اسی لیے خبیث! میں تیرے کمرے میں نہیں آتا' ہر چیز پہ تیرا حق....."

غنی کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں فلور کشن پہ لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ غنی اس سے ریموٹ کا مطالبہ کررہا تھا۔

"چل بھوتنے بکواسی! بھرپوری ڈھٹائی سے یہیں آجاتا ہے' تیرا ہر چیز پہ حق ہے' سوائے اس کے۔" اس نے ریموٹ کی طرف اشارہ کرکے غنی کو چڑایا۔

"ذلیل نہ بن یار' بس پانچ منٹ دیکھ لینے دے' اتنی کمینگی اچھی نہیں ہوتی۔" غنی ریسلنگ دیکھنے کی فرمائش کررہا تھا۔

"اسے چھوڑ' یہ دیکھ۔" اس نے ایک بے ہودہ سی انگلش فلم کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ "دیکھ کیا لچک ہے اس کے جسم میں۔" غنی کی بات پہ اس نے ذرا بھی توجہ نہ دی۔

"تو کر اپنی مرضی' میں جارہا ہوں۔" وہ ناراض ہو کے اٹھ ہی گیا۔

"اچھا ناں! بیٹھ جا۔"

کاشا نے اس کے ٹراؤزر کا پائنچہ اپنی مٹھی میں جکڑ کر اسے روکا مگر وہ ریموٹ نہیں چھوڑا۔

"ایسا کر بیٹھ مت لیٹ جا' میں نے تیرے ایموشنز چیک کرنے ہیں۔" اس نے بیٹھے ہوئے غنی کی پیچھے سے شرٹ کھینچی۔

"کیوں' کون سے ایموشنز چیک کرنے ہیں۔" غنی نے جھنجلا کر اپنی شرٹ اس سے چھڑائی۔ کاشا اسے دو گھڑی سکون سے دیکھنے نہیں دے رہا تھا۔

"مجھے عورت ذات سے اس قدر الرجی ہے کہ..... اب مجھے شک ہوتا ہے کہ تیرے emotions Sexual (جنسی جذبات) میں کوئی گڑبڑ....."



"آج میں تجھے ضائع کر کے رہوں گا..... بچے گا نہیں....." غنی اس کی ہچکچاہٹ کے بیچ ہی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کاشا پہ فوراً" مکوں سے حملہ کردیا۔

"اسٹاپ اٹ غنی..... لگ جائے گی۔"

کاشا یونہی شور مچا رہا تھا۔ نہ اسے لگنی تھی نہ ہی غنی نے اسے لگانا تھی۔ ان دونوں کے قہقہے بلند ہوتے گئے۔

انہی قہقہوں نے غنی کو حقیقی دنیا میں واپس کھینچا۔

عمیر اور حمزہ شام میں منصور کے ہمراہ ٹینس کورٹ جانے لگے تھے۔ منصور کی بہت خواہش تھی کہ اس کے بیٹے قومی کھلاڑی بنیں۔ خود اسے بھی اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں ایسے بہت سے مواقع ملے جنہیں اس نے پڑھائی کے جنون میں گنوا دیا۔ جب وہ اپنے پاپا سے ان کی زبانی سنتا تھا کہ کیسے وہ محنت کر کے اس اسکالر شپ تک اور اسکالر شپ سے انگلینڈ تک پہنچے تو اس کا جنون اور بڑھ جاتا' مگر اب وہ سوچتا تھا کہ کاش میں اپنی غیر معمولی ذہانت کو کسی غیر نصابی سرگرمی میں بھی بروئے کار لایا ہوتا۔ اس کا وقت تو اب نہیں رہا تھا مگر وہ اپنے بیٹوں کے ذریعے اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتا تھا۔ وہ انہیں روزانہ ایک گھنٹہ کورٹ لے جاتا تھا حالانکہ ابھی وہ ریکٹ سنبھالنے کے لائق بھی نہیں ہوئے تھے۔

"ہری اپ حمزہ! عمیر کٹ لیے گاڑی میں بیٹھ بھی گیا ہے۔"

شاہم شام کے کھانے کی تیاری کے ساتھ حمزہ کو بھی ڈانٹ رہی تھی' جو فریج میں سے ساتھ لے جانے کے لیے فروٹس وغیرہ اپنے بیگ میں ڈال رہا تھا۔

"بس دو منٹ مام۔" وہ کب سے یہی راگ الاپ رہا تھا۔

شاہم نفی میں سرہلاتے اس کی مدد کرنے کو مڑی۔ شاہم سے چھپا کے تیسرا کین بیگ میں ڈالتا حمزہ پکڑے جانے پہ بہت گھبرا گیا تھا۔

اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے بھنویں اچکانے پہ اکتفا کیا۔

"سوری ماما' وہ..... میرا فرینڈ ہے عادل..... یہ اس کے لیے۔" اس نے کین باہر نکال لیا۔

یادیں اچھی ہوں یا بری' ہم لاکھ مصروفیت میں مشغول رہیں' یہ اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہیں۔ یونہی یادوں کا ایک دریچہ شاہم کی طرف بھی کھل گیا تھا۔

"اوکے' میں جارہی ہوں۔" شاہم نے فریج میں سے دو سیب اور تین کیلے نکال کر بیگ میں ڈالے تھے۔

"ایویں فضول میں' کہیں نہیں جانا' ابھی تو آئی ہو۔" وہ چاہے پانچ گھنٹے ہی کیوں نہ ارسل کے پاس بیٹھی رہتی' وہ ہمیشہ اس کی واپسی پہ رکنے کی تکرار ضرور کرتا۔ شاہم کے معاملے میں اسے وقت سے گلہ ہی رہتا۔

"ابھی نہیں' تین گھنٹے قبل آئی تھی' مائنڈ اٹ۔"

"جو بھی ہے تم....."

"آپی کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے لازمی' اگر میں وقت پر نہ پہنچی تو وہ پروگرام (ملتوی) کردیں گی اور پھر منصور بھائی سے ہو جائے گی میری پٹائی۔" شاہم نے محبت سے اسے سمجھایا۔

اس کو ارسل کا یوں روکنا بہت اچھا لگا کرتا تھا۔

"اچھا..... چلو ٹھیک ہے۔" نل بند کرکے وہ اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

"کل....." ہونٹ کا کونا دانت میں دبا کر وہ سرہلاتی ہنسنے لگی تھی۔ وہ روز ہی ملتے تھے پھر بھی وہ اس سے یہ سوال ضرور کرتا تھا۔

"گڈ بائے اینڈ ٹیک کیئر۔" اس نے جاتے جاتے ٹیبل پر رکھی پلیٹ سے چکن پیٹیز اچک لیا۔

"رکو..... رکو شاہی۔" اس نے تین قدم دور کھڑی شاہم کے شولڈر بیگ کو دبوچا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو' کچھ نہیں ہے۔" وہ اس کے بیگ کی زپ کھول رہا تھا۔

اسے کوفت ہو رہی تھی۔ اس کے کندھوں کا سارا وزن ارسل پہ تھا۔

"ہاں! تم کہہ سکتی ہو یہ کچھ نہیں ہے..... یہ کچھ بھی نہیں ہے' بھوکی' ندیدی' یہ چوری کرنا تمہاری ایکسٹرا کوالٹی ہے' میں اتنی دور سے تازہ اور مہنگا فروٹ لاتا ہوں اور تم اپنے اس بکسے میں ٹھونس کر چلتی بنتی ہو۔ جم سے واپسی پہ مجھے خالی فریج منہ چڑاتا ہے۔"

ارسل نے سارے پھل واپس نکال لیے۔

"تمہاری زبان بہت چالو ہو گئی ہے ارسل! اتنے بلیم..... صرف اس چونگے کے پھل کے لیے..... کتنے کمینے ہو تم..... میں نے تمہیں اپنا اتنا قیمتی دل دیا اور تم..... وہ رونے کی مصنوعی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

"نو مائی ڈیئر لیڈی..... میں جھوٹا' بکواسی' گھونچو' چوروں کا چور کرمنل اور تم..... تم۔"

اس نے بھی مصنوعی گھبراہٹ سے جواب دیا۔

"بہت برے ہو۔" وہ اسے دھکا دے کر آگے بڑھی۔

"مگر صرف تمہارا ہوں۔" اس نے کچن کے دروازے سے ٹیک — لگا کر بازو سینے پہ لپیٹتے ہوئے جاتی ہوئی شاہم کو دیکھ کر زور سے آواز لگائی۔

"جھوٹے....." ناک چڑھا کر بڑی دلکشی سے مسکراتی وہ بولی۔ سیب اس نے پھر بھی چھین کر لے لیا تھا۔

"ماما!۔" حمزہ نے اس کا ہاتھ ہلا کر اسے ہوش دلایا۔

"آں..... ہاں' ہاں۔" وہ بری طرح چونکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی بھر آئی۔ حمزہ کے قریب ہی منصور کھڑا تھا۔

"نکلو حمزہ!" اس نے حمزہ کو کندھوں سے پکڑ کر کہا جو بہت حیرت سے ماں کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاہم نے کین دوبارہ اس کے بیگ میں ڈالا اور زبردستی مسکرا کر بیگ اس کے کندھوں میں چڑھا دیا۔ وہ باہر بھاگ گیا۔

منصور کے دو قدم اور قریب ہونے پہ اس نے سر جھکا لیا۔

"جانے والے بھولتے نہیں ہیں' خود پہ اتنا سخت پہرہ مت بٹھاؤ کہ انہیں بھلاتے بھلاتے خود کو ہی فراموش کر دو۔"

"اس کے قدم نصیحت کر کے مڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اٹکے آنسو گالوں پہ لڑھک گئے۔

☼ ☼ ☼

ماہم اندر آ کے ٹھٹک گئی تھی۔ کاؤچ پہ بڑے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں کاشا پیچھے سر ٹکائے آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ سر شام وہ کیسے آ گیا تھا؟ وہ بھی خاموشی سے۔ بیرونی گیٹ پار کرتے وہ چوکیدار یا سیکیورٹی گارڈ میں سے کسی کی ماں' بہن ایک ضرور کرتا تھا۔ اس کی گاڑی کا میوزک والیوم اتنا ہوتا تھا کہ ساتھ میں چار چھ گھروں کے سوئے ہوئے بیدار ہو جاتے تھے' پھر ماہم کی شامت آتی تھی۔ ابھی وہ کب آیا' اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"کاشف آر یو فائن؟" اس نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ دھر دیے۔

"ہوں..... یا آف کورس۔" اس نے یکدم آنکھیں کھول کر جواب دیا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

"باہر دل نہیں لگا۔" وہ آہستہ آہستہ اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے پالتو بلی کی بڑی نرمی سے پشت سہلائی جاتی ہے۔

"دل کو کبھی اتنی چھوٹ نہیں دی کہ اپنی مرضی سے لگتا پھرے۔"

"تھک گئے ہو' دبا دوں۔" وہ اپنے ہاتھوں سے ہلکا ہلکا دباؤ ڈالنے لگی۔

"رہنے دو' انرجی فل ہو گئی تو تمہیں تھکا دوں گا۔" وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"تمہارا یہ غمگین چہرہ کھل رہا ہے مجھے۔" اس کے چہرے کی اداسی پڑھنا مشکل نہیں تھا کیونکہ وہ بناوٹی انسان نہیں تھا۔

"قریب بیٹھو۔"

اس نے تھوڑا سیدھا ہو کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

"کیا ہے؟" اس نے اشارتاً پوچھا۔

کاشا کا یوں جم کے تکنا اسے ہچکچاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

"بہت برا ہوں میں؟"

خود پسندی تھی یا خود اذیتی۔

"نہیں..... زیادہ نہیں۔ ابھی بہت اچھے لگ رہے ہو بہت عرصہ بعد پہلے والے کاشف۔" ماہم نے اس کی تبدیلی کو جھٹ پکڑ لیا۔

"پہلے اور اب میں کیا فرق ہے؟"

"میں صرف کاشف سے واقف تھی۔ شادی ہوئی تو معلوم ہوا کاشف کا نام و نشان نہیں' اس جسم میں صرف کاشا کا روپ ہے۔ جس کی....."

"جس کی....." اس نے بیچ میں اسے اچک لیا۔

"جس کی برائیاں اس کے لیے صفات ہیں۔ وہ محبت کا نہیں' نفرت کا پتلا ہے۔ آپ اس کے ساتھ ٹائم تو پاس کر سکتے ہیں' مگر لائف نہیں۔ اس کی ہمراہی میں آپ کو اپنی خواہش' آرزو' آزادی حتیٰ کہ آواز تک کا بھی گلا گھونٹنا پڑے گا۔ جس کے الفاظ حرف آخر ہیں۔"

اس کی حوصلہ افزائی سے فائدہ اٹھا کر ماہم نے اپنے اندر کی ساری بھڑاس نکال دی۔ وہ یونہی مسکراتا رہا پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال لیا۔

"اور تم محبت کی دیوی' اس نفرت کے پتلے کی پجارن ہو..... تمہارا وہ محبت کا سلوگن (نعرہ) زندہ باد ہے ابھی بھی یا مردہ باد ہو گیا؟" سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اس نے سلگایا۔

"میں بدبخت کیا جانوں' محبت کیا ہوتی ہے؟ میں سلوگن لگاتی ہوں اور تم۔" ماہم کو بہت دکھ ہوا تھا۔

"میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور یہ ذہن میں رکھو تم' نہ کوئی اور۔" وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔

"تم یہ نہ بھی بتاؤ۔ میں تب بھی جان چکی ہوں' کاشف ہم شادی شدہ ہیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں' تمہاری توجہ..... تمہاری محبت پہ میرا حق ہے بالکل اسی طرح جس طرح تم میری ذمہ داری ہو' ہمارا رشتہ ویسا نہیں ہے' جیسا ہونا چاہیے' ابھی تم نے خود ہی اعتراف کیا کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں' یہاں رک کر اس نے توقف کیا۔

کاشا کی نظریں بہت سنجیدگی سے اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں یہ سوچنے اور کہنے سے بھی ڈرتی ہوں کاشف! کہ تم میرے لیے ایک پچھتاوا بنتے جا رہے ہو۔ مجھے اس قدر مجبور مت کرو۔ عمر بھر کا رونا میرا نصیب نہ کرو۔ میں نے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا' اس کے عوض وفا کی نہیں' تھوڑی سے محبت کی التجا ہے۔ تم بہت دیالو ہو..... مجھے پجارن نہیں بھکارن سمجھ کر اپنی محبت کی صرف تھوڑی سی بھیک دے دو پلیز۔"

ماہم نے ہاتھ جوڑ دیے۔ کاشا کش لینا بھول کر اس کی گیلی آنکھوں کو بے خودی' حیرانی سے تکے گیا۔

وہ سوالی سے محبت کرتا تھا مگر سوال سے نفرت۔ اس نے کبھی کوئی بھکاری خالی جھولی نہیں لوٹایا تھا مگر اس سوالی نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس کی تڑپ نے اس کی بے نیازی سے ہلکا سا پردہ سرکا دیا۔

"آئی ہیو نو ٹائم' تم نے غلط جگہ سوال کیا ہے۔"

اس کے وجود کی ریتیلی چٹان کے ذرے بکھرنے لگے تھے۔ پژمردہ سنسان بدن' ساکت نگاہیں — بے جان ہلتے ہونٹ۔

"مطلب....." وہ رو رہی تھی۔

"مطلب....." اس نے غائب دماغی سے لفظ دوہرایا۔

کیوں؟ کیا؟ کیسے اور مطلب؟ کا جواب اس نے غنی کے سوا کبھی کسی کو نہیں دیا تھا۔

"مطلب یہ کہ..... میں دل دیتا ہوں مگر دل میں جگہ کسی کو نہیں۔" تھوڑے توقف کے بعد وہ بلاوجہ ہی ہنسنے لگا۔ کھوکھلی بے جان ہنسی۔

"اٹس مائی اسٹائل نا۔" راکھ جھاڑ کر اس نے لمبا سا کش کھینچا۔

"سچ کہو ماہم! بچے یاد آتے ہیں؟"
اس نے کتنی غیر مناسب اور بے موقع بات کی تھی۔

ماہم نے جھکا سر اثبات میں ہلایا۔
"اور..... منصور۔"
ماہم نے سر اٹھا کر تھوک نگلا۔ کاشا کی ہنسی اور سوالات۔ وہ اسے کوئی نفسیاتی مریض لگ رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی یوں منہ پھاڑ کے کسی کی ذاتیات میں داخل اندازی نہیں کی تھی۔ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اس کی فطرت نہیں تھی۔
"میں اپنی غلطیوں سے سیکھتی ہوں، انہیں سدھارتی ہوں مگر دہراتی نہیں۔" اس کا لہجہ مستحکم تھا۔
"منصور تمہاری غلطی تھی۔" اس نے اندازاً کہا۔
ماہم چند لمحے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔
"غلطی وہ نہیں ہتم ہو..... مگر اسے یاد کر کے میں دوسری غلطی نہیں کرنا چاہتی، پہلے بھی ماضی کو یاد رکھ کے حال تباہ کر لیا..... بٹ ناٹ اگین۔"
آخر میں اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔
کاشا سچ بول سکتا تھا، یقیناً سچ سننے کی ہمت بھی تھی

"اسٹرانگ سی چائے لاؤ۔"
وہ پھر غیر متوقع بولا تھا۔ ماہم کی اتنی تلخی پہ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں ابھرے تھے۔ ماتھے پہ ایک شکن بھی نہیں تھی، جیسے وہ ماہم کی اس اندرونی خلش سے آگاہ ہو۔
"ہاں۔" وہ پریشانی سے اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی، جو موبائل پہ نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔
"ہاں لیلیٰ! کتنی بھاگ دوڑ باقی ہے..... کل میڈیکل کے لیے جانا ہے..... پھر دو گھنٹے بعد ملتا ہوں۔ اوکے سی یو۔"
فون بند کر کے اس نے پھر سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

اسٹاک مارکیٹ ایک ہفتے سے مندی کا شکار تھی۔ اس اتار چڑھاؤ کی زد میں منصور بھی آگیا تھا۔ اسے لاکھوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اس کا پراجیکٹ بھی کینسل ہو گیا تھا۔ مارکیٹ میں روپے کی گرتی ہوئی ساکھ سب تاجروں کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ منصور جو بہت ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ اب ماتحتوں پہ چلانے لگا تھا۔ گھر میں بھی اس نے ایک بار شاہم اور پھر بچوں کو اپنے غصے کا نشانہ بنایا۔ شاہم چپ چاپ برداشت کر گئی۔ ابھی اس نے آفس سے آ کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دعا کو بخار تھا۔ شاہم نے منصور سے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا بھی تھا مگر اس نے اسے اکیلے جانے کا مشورہ دے دیا۔ دو دن سے دعا کو سنبھال سنبھال کر وہ خود اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ شام سے اسے بھی بخار محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی بھی وہ مسلسل رو رہی تھی۔
"یہ کیوں روئے جا رہی ہے؟ پلیز اسے چپ کرواؤ۔"

منصور نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر کوئی تیسری بار یہ الفاظ دہرائے تھے۔ اب کی بار لہجے میں واضح جھنجلاہٹ تھی۔
"دعا بیٹا! کیا ہو گیا ہے؟ چپ کر جاؤ میری جان، ابھی دوائی دی ہے نا، درد ختم ہو جائے گا۔ شاباش۔"
منصور کی پشت پہ ایک غصیلی نگاہ ڈال کر اس نے بیڈ سے جوکر اٹھا کر اسے دیا۔ اس نے روتے ہوئے بڑھتے ہوئے جوکر کو پرے کر دیا اور اپنا سر شاہم کے کندھے پہ ٹکا کے ہچکیوں سے رونے لگی۔
"اس کا رونا بند کیوں نہیں ہو رہا گاڈ سیک چپ کرواؤ اسے۔" وہ خاصی برہمی سے کرسی دھکیل کے اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ عمیر اور حمزہ جو کارٹون دیکھ رہے تھے، انہوں نے والیوم کم کر دیا۔
"کل سے کہہ رہی ہوں کہ بخار ہے اسے، مگر آپ کو کیا؟ آپ کو اپنی جمع، تفریق سے فرصت ملے تو



دھیان دیں۔ آپ کے اس رویے اور روز کی چخ چخ سے گھر کا سکون تباہ ہو رہا ہے، بہتر ہے کہ آپ اپنا غصہ اپنے اسٹاف اور ورکرز پہ نکال کر آیا کریں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں جو جلی کٹی برداشت کروں۔ اینڈ کائنڈلی آئندہ مجھ پر چیخیے گا مت۔" رندھے ہوئے لہجے میں بولتے اس کی آواز خاصی تیز ہو گئی تھی۔
تینوں بچے سہم کر چپ ہو گئے۔ وہ دو دن سے دعا کو بہلا بہلا کر اس کی خوشامدیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں بھائی واش روم تک اس کے بغیر نہیں جاتے تھے۔ منصور کا آف موڈ اسے الگ بھگتنا پڑ رہا تھا۔
"بی ہیو یور سیلف شاہم۔"
شاہم کو اس روپ میں دیکھ کے اس کی حیرت سوا تھی۔ وہ ساکن ہی ہو گیا تھا۔
"اپنے بی ہیویر کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی، اگر اتنی ہی نفرت ہے مجھ سے تو گھر سے باہر نکال دیں نا۔" آنسوؤں کا پھندا گلے میں اٹک گیا تھا، بات کرنا دشوار ہو رہا تھا۔
"کریں اپنا کام، میں باہر چلی جاتی ہوں، بہت بری لگتی ہوں۔" وہ آگے بڑھنے لگی، منصور نے سختی سے بازو پکڑ لیا۔
"چھوڑیے میرا بازو۔" اس نے رکھائی سے کہا۔
"چھڑوا لو۔" اس کے آنکھوں اور چہرے پہ بھی خفگی تھی۔
"جب بھی چھوڑنا ہے آپ ہی چھوڑیں گے، میں اپنا آپ نہیں چھڑواؤں گی۔" منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔
"اتنی مضبوطی سے پیر مت جماؤ کہ جب گرو تو سنبھل نہ سکو۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔
دعا کافی رو دھو کر اس کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ عمیر اور حمزہ بھی سو گئے۔ منصور واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی باہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہوش و حواس قائم ہوتے ہی اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ وہ منصور سے ناراض ہو کر کیسے چین کی نیند سو سکتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ باہر آئی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پہ نیم دراز تھا۔
"منصور....." اس نے بہت آہستگی سے پکارا۔
"ہوں۔" اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے کافی قریب کھڑی تھی۔
"بہت رات ہو گئی ہے، اٹھیں۔" اس نے پونے دو بجاتی وال کلاک کی طرف دیکھا۔
اس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہ ہوئی۔ وہ نیچے قالین پہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
"ایم سوری منصور! بہت زیادہ فضول بول گئی ہیں۔ بہت اسٹوپڈ ہوں۔ جانتی بھی ہوں کہ آپ کی آفیشل پرابلمز ہیں، آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہیں، میں دعا کو لے کے بہت تھک چکی تھی۔ مینٹلی ایگزاسٹ ہو گئی ہوں، میں آپ سے اونچا بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، پتا نہیں میں نے کیا کیا کہہ دیا۔" وہ رونے لگی تھی۔ وہ بے چینی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"پلیز پہلی اور آخری بار معاف کر دیں۔ میں..... پلیز۔"
"اٹھو اور رونا بند کرو۔" اس نے اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔
"سارا قصور تمہارا نہیں، میرا بھی ہے۔ میں بھی بہت ہائپر رہنے لگا ہوں۔ گھر کا سکون بہت بڑی نعمت ہوتا ہے جس میں، میں خلل ڈالتا جا رہا ہوں۔ میری آفیشل پرابلمز کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تم نے جو کیا وہ صرف ری ایکشن تھا۔ دعا بیمار تھی، مجھے تمہارے ساتھ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے تھا..... خیر میاں بیوی میں ایسی چھوٹی موٹی لڑائی ہو جاتی ہے، اتنا سیریس مت لو، معافی تو مجھے بھی تم سے مانگنا چاہیے۔"
منصور کے چہرے پہ الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پوری سچائی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اسے بری الذمہ کر دیا تھا۔
منصور کو اس کا یوں معافی مانگنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس سے بھلا کب کسی نے معافی مانگی تھی۔ اپنی غلطی کے باوجود۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" شاہم نے اس سے شکوہ کیا۔
"چلو۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
"ادھر نہیں اُدھر۔" اس نے بیڈ روم کی طرف جاتے منصور کا بازو پکڑ کر کچن کی طرف اشارہ کیا۔
"آپ نے کھانا نہیں کھایا' میں نے بھی نہیں کھایا' صرف رات کا کھانا ہی تو ہم ساتھ کھاتے ہیں۔ آپ ٹیبل پہ نہیں تھے' میرا بھی دل نہیں چاہا۔"
وہ نروٹھے پن سے اسے بتاتی' کچن میں لے آئی۔
منصور کو ایک عجیب سی انھونی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر کئی دنوں کا پلتا غبار آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے منصور سے معافی مانگی تھی' اس کے ناراض ہونے پہ روئی تھی' اس کی غیر موجودگی میں کھانا نہیں کھایا تھا۔
کسی بھی انسان کو جب تک یہ احساس ہے کہ کوئی ہے' جو میری پروا کرتا ہے تو وہ کبھی بھی کمزور نہیں پڑتا۔

☼ ☼ ☼

دستی گھڑی پہ سوا دس بجاتی سوئیوں کو ذرا غور سے دیکھ کر اپنے استقبال کے لیے کھڑے اسٹاف کو سر کے مبہم اشارے سے گڈ مارننگ کہتے وہ اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ آج اس کا کام معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ دو اہم میٹنگز تھیں۔ اسے ٹیکس کے سلسلے میں انکم ٹیکس آفیسر سے ملنا تھا۔ گودام کا چکر بھی لگانا تھا۔ اس حساب سے وہ کافی لیٹ ہو چکا تھا۔ بریف کیس ٹیبل پہ دھر کے' کوٹ کا اوپری بٹن کھولتے لمبا سانس خارج کر کے' وہ کرسی پہ بیٹھا تھا' جیسے شکر ادا کر رہا ہو' چلو یہاں تک تو پہنچا۔ انٹر کام پہ سیکریٹری سے آج کے دن کی تفصیلات پوچھیں۔
"ایکسکیوزمی سر! صبح سے آپ کے لیے تین بار کسی شخص کی کال آ چکی ہے۔" وہ اپنی مطلوبہ معلومات لے کر ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے اس سے بھی تیزی دکھائی گئی۔
"کون تھا؟" اس نے سرسری سا پوچھا۔
"نام نہیں بتایا' کافی Insist (اصرار) کیا ہے۔ بہت رعب دار بلکہ غصیلی آواز تھی۔ شاید وہ۔"
"ٹھیک ہے اب کال آئے تو مجھے ٹرانسفر کر دیں۔"
غنی نے فضول تفتیش بیانی سے جان چھڑائی۔
لمحہ بھر کو اس نے سوچا "کون ہو سکتا ہے۔" کاشا کے علاوہ اور کسی کا نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ کاشا کو یہاں کا چپڑاسی تک جانتا تھا' پھر وہ نام نہ بتانے والی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی وہ اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ اسی گمنام شخص کی کال موصول ہو گئی۔
"یس غنی اسپیکنگ۔"
"کاشا کہاں ہے آج کل' اپنی مخصوص جگہوں پر بڑا کم کم نظر آتا ہے۔" اس شخص نے غنی کو اپنا نام پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
"تم نے کاشا کا پوچھنے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟ وہ کوئی گیدڑ یا چوہا ہے' جو چھپ کر کہیں بیٹھ جائے گا۔"
کاشا کا ذکر سن کر وہ تپا ضرور تھا مگر اسے زیادہ غصہ اس شخص کے لہجے پہ آ رہا تھا جو کسی گڑبڑ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔
"شیر کو چوہا کیسے بنایا جاتا ہے' اس کا نسخہ جانی باؤ کو اپنے پرکھوں سے ملا ہے۔" کہنے والے کی مکروہ ہنسی میں صاف دھمکی تھی۔
"واٹ ربش' سیدھی طرح بکو۔"
جانی باؤ کے نام سے اسے تھوڑی بہت واقفیت تھی مگر وہ ذرا نہیں ڈرا تھا۔
"دیکھ شہزادے! ہم صرف نرمی سے بات کرتے اور سمجھاتے ہیں' بکنے والی کیٹگری سے نہیں ہیں' ہمیں گلا پھاڑنے سے زیادہ آسان انگلی دبانا لگتا ہے۔" بہت نڈر اور لاپروا لہجہ تھا۔
"کام کی بات کر رہے ہو یا فون رکھ دوں۔" اس نے سختی سے کہا۔
"آج رات ساڑھے دس آ جانا تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں' پھر تو اپنی زبان میں کاشا کو سمجھا دینا' سنا ہے تیری وہ مانتا ہے۔"
"مجھے کاشا کی کسی ایکٹوٹی میں کوئی انٹرسٹ نہیں



اور تم۔۔۔"
"مانا کہ تیری ناراضی ہے مگر ہے تو تیرا جگر ناں' کل کلاں کچھ ہو جاتا ہے تو ساری زندگی کا پچھتاوا ہے تیرے لیے۔" غنی ساکت سا ہو گیا۔ وہ شخص ان دونوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔
"کہاں آنا ہے؟" اس کی آواز کافی دھیمی تھی۔
غنی نے مطلوبہ جگہ کا ایڈریس سن کر اس کی مزید بکواس نے بغیر فون بند کر دیا۔ ٹھیک دس بج کر پچیس منٹ پہ اس کی کار پارکنگ ایریا میں جا رکی تھی۔ وہ وقت کا پابند تھا مگر یہاں وہ جان بوجھ کر صرف پانچ منٹ لیٹ آیا تھا۔ وجہ کوئی خاص نہیں تھی۔ صبح اس فون کال کو سوچ سوچ کر' اچھے برے اندازے لگا لگا کے اس کا ذہن اتنا الجھ گیا تھا کہ اس کی طبیعت بوجھل اور بدن دکھنے لگا تھا۔ اپنی تمام مصروفیت ملتوی کر کے وہ آفس سے اٹھ گیا۔ کئی بار اس نے سوچا کاشا سے لاکھ ناراضی سہی مگر اسے یہ معاملہ اسی سے معلوم کرنا چاہیے۔ اس شخص کی دھمکی بھری آواز نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔
وہ ابھی وسیع ہال کے بیچوں بیچ کھڑا ادھر ادھر متلاشی نظریں دوڑا رہا تھا کہ ویٹر اس کی طرف بڑھا۔
"سر! ٹیبل آپ کے لیے ریزرو ہے۔" ویٹر اسے مخصوص میز تک لے آیا۔ جہاں کرسی پر اس کی طرف پشت کیے کوئی موجود تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر براجمان ہوا۔
"مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گے کیونکہ۔۔۔"
"پلیز کم ٹو دی پوائنٹ' آئی ہیو نو ٹائم۔" وہ اس کا چھچھورا پن سننے کے لیے نہیں آیا تھا۔
سفید کلف لگے سوٹ میں ملبوس گردن اکڑائے' چہرے پہ خباثت کر ختگی' سیاہ گھنی داڑھی مونچھیں' سوا چھ فٹ قد بھرے ہوئے جسم والے اس بدمعاش صفت کو یہ بالشت بھر کا چھوکرا برا کھلا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس کا تیا پانچا کر دیتا۔
"جانی باؤ کا آدمی ہوں' کاشا نے ان سے گلبرگ کی ایک کوٹھی کا سودا کیا تھا۔ کاغذات اس کے نام نہیں ہیں۔ بلیک میں قبضہ دے گا' تم جانتے ہو گے اس طرح کی دو نمبری میں دام کا کوئی مول نہیں ہوتا' طاقت کا ہوتا ہے۔ بس سودے میں تھوڑی سی اونچ نیچ ہو گئی ہے۔ کاشا اپنی بولی سے ایک روپیہ کم وصولنے پر تیار نہیں جبکہ جانی باؤ کی نظر اس کوٹھی پہ ایسی ٹکی ہے کہ وہ چھوڑنے کو تیار نہیں' تم کاشا کو سمجھاؤ۔۔۔" میں ملا تھا اس سے۔ بڑی ہی الٹی کھوپڑی کا ہے' کیوں بھری جوانی کو کندھوں پر اٹھواتا۔۔۔"
"بس۔۔۔" غنی نے ہاتھ اٹھا کر اسے منحوس بولنے سے روکا۔
غنی کے لیے یہ نئی خبر دھماکا تھی۔ وہ اپنے تاثرات پہ قابو پا کے خاموشی سے اٹھ گیا۔
اس کا اگلا کام کاشا کو سارے شہر میں ڈھونڈنا تھا۔ اس کے تھکے ماندے اعصاب کو لمبی نیند اور آرام کی اشد ضرورت تھی۔ کاشا کا یہ کارنامہ جان کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ پہلا نمبر اس نے جم کا ڈائل کیا' وہ وہاں نہیں تھا' الماس باجی نے کاشا کا نام سنتے ہی وہ گوہر افشانیاں شروع کیں کہ غنی نے فون بند کر دیا۔ یقیناً کاشا نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا ہو گا۔ کاشا سے واسطہ پڑنے والوں کی اس کی پیٹھ پیچھے زبان یوں ہی فراٹے بھرتی تھی۔ آخری تلاش ریس کورس کی تھی' وہاں بھی لاعلمی کا اظہار ہوا۔ جوں جوں وہ انکار سنتا جا رہا تھا' اس کا خون مزید کھولتا جا رہا تھا۔
آخر کار وہ [illegible] نائٹ کلب آیا تھا۔ یہاں کاشا کی عیاشی کا سب سامان موجود تھا۔ اس کلب کی ممبر شپ غنی کے پاس بھی تھی۔ یہ بھی کاشا کی مہربانی تھی۔ جو وہ اپنے لیے پسند کرتا تھا' وہی غنی کے لیے بھی ماسوائے عورت کے۔
غنی اس کی ہر برائی میں برابر چلتا مگر جہاں عورت کا معاملہ آتا' وہ بدک جاتا۔ گاڑی پارک کرنے میں اسے کافی وقت ہوئی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ کلب کی روشنیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ تیز انگلش میوزک کے ساتھ تالیوں اور چیخنے چلانے کا شور بھی عروج پر تھا۔ فینسی لائٹس کی مدھم روشنی جل بجھ رہی تھی۔

اس نے مجمع کے اندر گھس کے چہروں کو جانچا۔ کتنے ہی نازک بدن اس کے ساتھ مس ہوئے تھے۔ جھومتے ہوئے کسی کے سلکی بال اس کے خدوخال سے ٹکرائے۔ کاشا یہاں بھی نہیں تھا۔ وہ رستہ بناتا اسی کلب کے فرسٹ فلور پہ آگیا' جہاں گندی گالیاں بکتے جواری اور عادی شرابی حال سے بے حال تھے۔ شراب پینے والوں میں عورتیں بھی شامل تھیں جو اور کسی میدان میں تو نہیں' البتہ یہاں مرد کے کندھے سے کندھا ملانے کی کوشش کرتی تھیں۔ کاؤنٹر پہ کھڑے وکی نے اس کی طرف دیکھتے آشناسی مسکراہٹ اچھالی۔ اس کلب کا ایک فلور ریاض تھا۔ جہاں کوئی یوں منہ اٹھا کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ کاؤنٹر پہ آگیا۔

"کاشا آیا تھا؟"

وہ جواب دینے کے بجائے آخری فلور کی طرف سر اٹھا کر ریلنگ کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"بہت پیے ہوئے تھے' وہاں ریلنگ پہ کسی حسینہ۔۔۔"

"جسٹ شٹ اپ وکی' اس کی بکنگ چیک کرو۔" وہ بھنا گیا۔ وہ مسکراہٹ کو بریک لگا کے کی بورڈ پہ انگلیاں چلانے لگا۔

کسی کی بکنگ کا پول کھولنا یہاں کے قاعدے قانون کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شہر کا سب سے مہنگا اور محفوظ ترین کلب سمجھا جاتا تھا' جہاں پر آپ کو نقاب پوشی کی ضرورت نہیں۔

"روم نمبر زیرو زیرو نائن میں کاشا موجود ہے۔"

غنی کو اپنی کنپٹیاں تپتی محسوس ہوئیں۔ اس کا سارا جسم دہک رہا تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وکی نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا مگر سیکیورٹی گارڈ اس کے رستے میں آگیا تھا۔

"رکو کدھر جاتے ہو' سارے کمرے بک ہیں۔"

اس کے تاثرات گارڈ کو ٹھیک نہیں لگے تھے۔ وہ تیز تیز چلتا اس کے سامنے تن گیا۔ غنی نے اسے دائیں بازو سے پرے دھکا دیا۔

اسے لگ رہا تھا وہ کاشا کو مار دے گا یا خود کو کچھ کر لے گا۔ گارڈ اپنا فرض نبھانے کے چکر میں اب کی بار بھاگتا ہوا اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

"بولا نہیں' بکنگ فل ہے' کارڈ دکھاؤ۔" پھولتی سانسیں ہموار کرتے اس نے کندھے پہ ڈھلکتی بندوق سیدھی کی۔ غنی نے اپنا سارا غصہ اس پہ نکالنے کا سوچا۔ ڈھلکتی بندوق کو جھٹکے سے کھینچ کر بٹ کو سیدھا کیا۔ اس اچانک افتاد پہ وہ گارڈ سنبھل نہ سکا۔ پانچ بھرپور واروں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ غنی نے اسے دفاع کا موقع ہی نہیں دیا۔ بندوق اسی پر پھینک کر وہ لمبی راہداری میں آگیا۔

روم نمبر زیرو زیرو نائن کو دھڑ دھڑاتے اسے پسینہ آچکا تھا۔

کاشا کے کمرے کی اندرونی صورت حال سے آگاہ ہونے کے باوجود دستک دینے کی جرات بھلا غنی کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی بار بھی کاشا جان گیا تھا کہ باہر کون ہے؟ اب بھی اس نے کافی تسلی و اطمینان کا مظاہرہ کیا۔ باہر کھڑے اپنا خون کھولاتے غنی نے ساتویں منٹ میں چوتھی بار دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ کاشا بدن پر بنیان چڑھاتا نکلا تھا۔ غنی کے اتنے سخت تاثرات نے اسے ٹھٹکا دیا۔

"جانی باؤ سے کیا جھگڑا ہے تیرا؟"

غصے کو ضبط کرتا وہ آخری حد پہ کھڑا تھا۔ وہ اتنے عرصہ بعد ملے تھے' وہ بھی اس انداز میں۔ وہ دو دن کی دوری پہ ایک دوسرے کو کتنی دیر بانہوں میں لپٹائے رکھتے تھے۔

"تو شہر بھر میں خجل خوار صرف یہ پوچھنے کے لیے ہو رہا تھا' گھر آجاتا یار۔۔۔"

"میری بات گول مت کر۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"میں گلبرگ والی کوٹھی' جس میں رہتا ہوں' وہ سیل کر رہا ہوں۔" کاشا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بتایا۔ وہ بھلا کیوں خائف ہوتا۔

"کیوں؟ وہ ماہم کی ملکیت ہے' تمہارے نام منتقل ہو گئی ہے؟"

"جانی باؤ انڈر ورلڈ کا بندہ ہے' قبضہ گروپ۔"

"ایکسکیوز می سر! یہ کیا بدتمیزی ہے' آپ نے ہمارے گارڈ پہ قاتلانہ حملہ کیا ہے' اسے زخمی کر دیا ہے۔" کلب کا منیجر دو تین لوگوں کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔ غنی یوں بیگانہ بنا کہ جیسے یہ سب کسی اور سے کہا جا رہا ہو۔

کاشا نے باری باری دونوں کو دیکھا اور معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

"ایسا کرو۔" وہ ہپ پاکٹ سے والٹ نکالنے لگا۔

"یہ رکھو۔" اس نے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اس منیجر کی طرف بڑھائے۔

"اسے ہسپتال لے جاؤ' پٹیاں وغیرہ کرواؤ' گلوکوز چڑھاؤ' جو باقی پیسے بچیں اس کی عیادت کے لیے جاتے ہوئے پھل خرید لینا کیونکہ مرا نہیں' نبض چل رہی ہے۔"

"مگر سر یہ سراسر زیادتی۔۔۔"

"اے منیجر! زیادہ بڑھ بڑھ کے طرف داری نہ کر' جس طرح غنی نے اس گارڈ کو اوقات یاد دلائی' یہ نہ ہو میں تجھے تیری اوقات یاد دلا دوں' اس پہ تو ترس کھا کے میں نے رقم دے دی ہے' تجھے کون دے گا؟ چل جا یہاں سے' کہیں میرا بھیجہ نہ الٹ جائے۔"

اس نے سر نفی میں ہلا کے اسے ہاتھ سے بھی دفع ہونے کا اشارہ دیا۔ منیجر ضبط کے کڑوے گھونٹ پی کے مڑ گیا۔

"یو آر گونگ گڈ کاشا!" غنی نے اس کے ہاتھ سے والٹ چھین لیا۔ "اسی پیسے کی دھن پہ تو اپنی عاقبت کو آگ میں جھونک رہا ہے۔ تو کتنا ذلیل انسان ہے' کسی نے تیری محبت میں اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا اور تو بدلے میں اسے اور برباد کرے گا۔ جس پیسے پہ تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے' کبھی اس عورت سے بھی پوچھ جو تیری ماں ہے' کہاں سے بھیجتی ہے تجھے' ایک جوان بیٹے کا بوڑھی بے بس ماں خرچہ پورا کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلتی ہے۔ اس کا جرم صرف تجھ جیسے سنپولیے کو جنم دینے کا ہے۔ کبھی کبھار مجھے لگتا ہے تو لالچی نہیں' صرف بدلہ لے رہا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے تیرے اندر سکون اترتا ہے' لاشعوری طور پر ہر عورت کو اپنی فرسٹریشن کا شکار بنا چکا ہے۔ تیری ماں نے تیرے ساتھ اچھا کیا یا برا' اس کی سزا تو ہر عورت کو دیتا ہے۔ اگر ماں سے نفرت ہے تو اس کا دیا کیوں کھاتا ہے؟ دوسروں کو خالی کرتے کرتے تو خود کھوکھلا ہو چکا ہے۔ جو کچھ تو کرتا پھر رہا ہے' جس دن مرا' تیرے جنازے کو کندھا دینے چار لوگ بھی نہیں آئیں گے' پھر تم۔۔۔"

"تم تو آؤ گے ناں' مجھ جیسے گنہگار کو چار کی نہیں' صرف تیرے کندھے کی ضرورت ہو گی۔" وہ جذباتیت میں رک رک بولتے غنی کو ٹوک کر استفسار کر رہا تھا۔

"جسٹ۔۔۔ شٹ اپ۔"

غنی بکتا جھکتا سلگتے جذبات لیے واپس مڑ گیا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ)

سائرہ عارف

# میری صبح کا ستارہ

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غرور ہے۔ بچپن کا منگیتر باوجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کر لی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں ددھیال پر پڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لا کر دیتی ہے اور پیسہ بٹورتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک ذہنی طور پر کمزور بھائی شہزاد ہے جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور مشورہ دینے کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاصی انسیت ہے جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

ناولٹ

فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال، کاشف کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف، ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دُور رہے، لیکن کاشف، اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقدِ ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں، بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پہیہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے او کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابلِ برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

## ۵
## پانچویں قسط

فاخرہ کا اندیشہ اگلے ہی روز سچ ثابت ہوا تھا۔ جب اقبال گجر نواز اکرم کے آفس جا پہنچا تھا۔ کاشف اپنے آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا، جب چپڑاسی نے آکر بتایا۔

"سر جی، آپ کو بڑے صاحب اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔"

"خیریت!" وہ بے ساختہ چونکا، ابھی گھنٹہ پہلے تو وہ ان سے ایک فائل پر سائن کروانے گیا تھا تو تمام تفصیلات طے کر لی تھیں۔ پھر اب کیا بات ہوئی تھی۔

"ہاں جی۔ خیریت ہی ہے، آپ کے والد صاحب آئے ہیں۔"

"کون والد صاحب؟" اس نے نا سمجھی سے پوچھا تو پیون بے ساختہ چونکا۔

"والد صاحب، ابا حضور۔ ابو جی، کیا کہتے ہیں آپ اپنے والد کو، باپ کو کاشف صاحب۔" پیون کے مذاق پر اس نے سہم کر، ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا دماغ میں یک دم ایک جھماکہ سا ہوا تھا۔

"اقبال!" اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

"ہاں جی، اقبال صاحب، بڑے صاحب کے آفس میں بیٹھے ہیں، آپ کو بلایا جا رہا ہے۔" پیون دانت نکالتا باہر نکل گیا تھا۔

"تو وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔" اس نے دانت پیسے۔ "اب کیا ہو گا، کیا کروں۔"

اس کا ذہن تیزی سے آنے والی صورت حال کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ نواز اکرم کے سامنے اقبال کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور اس کی اسی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر وہ کچھ بھی بول سکتا تھا۔

"اگر اس نے رانی کا قصہ نواز اکرم کو بتا دیا تو؟" پل بھر میں اس کا دل سکڑ کر پھیلا۔

"مجھے فوراً اس کے پاس جانا چاہیے، دیکھوں تو کیا کہہ رہا ہے۔" کاشف جلدی سے اپنے کیبن سے نکل کر نواز اکرم کے آفس کی جانب بڑھا۔

"ارے اقبال صاحب! آپ کاشف کے باپ ہیں، آپ سے بات...." اسی پل کاشف نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ نواز نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سر...." اس نے اجازت طلب نظروں سے نواز اکرم کو دیکھا۔

"آؤ آؤ کاشف! آؤ بیٹھو۔" اس نے اندر آکر ایک کڑی نگاہ اقبال پر ڈالی جو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بڑی کمینی سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ نواز اکرم اپنے موبائل پر مصروف ہوا تو اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں؟" اس کا لہجہ بے حد سنگین اور سرد تھا۔ مگر آواز بہت دبی ہوئی۔ اس وقت اس کی بے بسی اور اقبال کی کمینگی عروج پر تھی۔ اقبال کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کس بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ بے بس پرندے کی طرح محض پھڑپھڑا تو سکتا ہے، مگر آواز نہیں نکال سکتا۔

"نواز صاحب نے مجھے خود بلایا ہے، کچھ ضروری معاملات طے کرنے کو، جو صرف اور صرف بڑوں کے درمیان ہی طے ہو سکتے ہیں۔ کیوں نواز صاحب؟" اقبال نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے بڑے ہی مدبرانہ اور بزرگانہ انداز میں اسے جتلایا تھا۔ کاشف کے تن بدن میں آگ سی بھڑک گئی تھی۔

"بالکل بھئی۔ یہ شادی بیاہ کے معاملات تو بزرگوں کے درمیان ہی طے ہوتے ہیں نا۔" نواز اکرم کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

"الو کا پٹھا، کالا بھینسا، اب اسے کیسے بتاؤں۔" اس کے اندر گالیاں ابل رہی تھیں۔ مگر وہ بہت تابعداری سے سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ بڑے ہیں، کاروبار کا تجربہ بھی ہے، میں چاہتا ہوں، آپ کاشی کو اس کے کاروبار میں مدد دیں۔ کیونکہ بچے تو بہرحال بچے ہوتے ہیں نا۔"

"بالکل جی بالکل، آپ کی بات سونے جیسی ہے، آپ بالکل فکر مت کرو، میں سب سنبھال لوں گا جی!" اقبال اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بہت ہی خوش خوش کہہ رہا تھا۔ کاشف نے بمشکل خود کو کنٹرول کر رکھا تھا۔

"لیں اقبال صاحب! آپ کی لسی آگئی ہے۔ بھئی تمہارے فادر چائے نہیں پیتے تو میں نے ان کے لیے ان کا پسندیدہ ڈرنک منگوا لیا ہے۔" چپڑاسی نے سلور کے بڑے بڑے لمبے گلاس سامنے گلاس ٹاپ پر رکھے تو اقبال کی میلی گدلی ہوس زدہ آنکھوں کی چمک دُگنی ہو گئی تھی۔ اس نے غٹ غٹ کر کے پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھایا تھا۔ کاشف نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نواز اکرم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جہاں زبردستی اور مجبوری کی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ کاشف کے پیٹ میں یک دم گولا سا گھوما تھا۔

"واہ جناب واہ، سواد آگیا، یہ اپنے فیجے کی لسی تھی نا، بڑی مشہور دکان ہے جی۔ بڑی دنیا وہاں لسی پینے آتی ہے اور.... آ۔" بات کرتے کرتے اس نے منہ کھول کر بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے ڈکار لی۔ نواز اکرم بے ساختہ منہ بنا کر پیچھے ہوا تھا۔

"ابا جی! آپ میرے کمرے میں آئیں۔ باقی باتیں وہاں کر لینا، سر بہت مصروف بندے ہیں۔"

اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی اقبال کو بھی بازو سے تھام کر کھڑا کر لیا تھا۔

"اوئے صبر کر، مجھے نواز صاحب سے بات تو کرنے دے، یار میں نے ان سے کاروبار کے متعلق۔ تیرے.... کاروبار کے متعلق پیسے کی گل بات کرنی تھی اور۔"

"اقبال نے اپنا بازو اس کے سخت شکنجے سے چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے نواز اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"سر.... سوری سر.... ہم نے آپ کا بہت ٹائم لے لیا۔ میرے ابا جی بالکل فارغ بندے ہیں اور ہر کسی کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ سوری سر، آئیں ابا جی۔"

کاشف نے دونوں کو بولنے کا موقع دیے بغیر جلدی سے کہا۔

"اقبال، ارے یار اوئے سن، اوئے بات تو.... میں نے نواز صاحب سے۔" اس کی ساری ادھوری باتیں نظر انداز کیے کاشف اسے سختی سے کھینچتے ہوئے اپنے کیبن میں لے آیا تھا۔

"بس! بہت ہو گیا یہ تماشا، بند کر یہ ڈرامہ بازی، جانتا ہوں، تو پیسے کے لالچ میں یہاں آیا ہے، مگر۔"

اسے کرسی پر دھکا دے کر اس نے زہر خند لہجے میں دانت پیستے ہوئے اسے ٹوکا۔

"آہستہ، ہولی ہولی بول کا کے، ورنہ یہاں سے نواز سیٹھ کا کمرہ زیادہ دور نہیں ہے۔" اقبال گجر نے خباثت سے مسکراتے ہوئے اسے گویا تنبیہہ کی تھی۔

"تو کیا سمجھتا ہے، میں تیری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا۔ اگر تو یہاں... اس بلڈنگ میں بیٹھا ہے تو محض میری وجہ سے، ورنہ تیرے جیسے کو تو اس کے گیٹ پر کوئی بھیک بھی نہ مانگنے دے اور جو تو سوچ رہا ہے نا، وہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے نواز اکرم کو تیری اصلیت بتا دی تو۔" اس نے غصے سے اس کی جانب انگلی اٹھا کر کہا تو اقبال نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔

"اوئے کا کے! بچہ ہے نا، جوان خون سوچنے نہیں دیتا، تو میری اصلیت بتائے گا تو کیا میں چپ رہوں گا، رانی کے بارے میں تو نے یقیناً" سیٹھ صاحب کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ ہے نا؟" وہ کان کھجاتے ہوئے خباثت سے مسکرا کر اسے دیکھتا اپنی کرسی سے اٹھا تھا۔ کاشف کا منہ سرخ ہو گیا۔

"تو مجھے بلیک میل کرے گا کمینے، میں تیری..." وہ غصے سے بے قابو اس کی جانب جھپٹا تھا۔ اسی پل دروازہ کھول کر گل خان اندر آ گیا۔

"کاشف صاحب! آپ کے لیے چائے لاؤں۔" اس نے حیرانی سے کاشف کو دیکھا جو اقبال کے بے حد قریب کھڑا تھا۔ اور اس کا گریبان تھامے ہوئے تھا۔

"ہاں، آں ہاں، لے۔ لے آؤ۔" وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔

"ایک یا دو؟" گل خان نے بغور سر تاپا اقبال کا جائزہ لیا تھا۔

"ایک... ابا جی تو جا رہے ہیں واپس۔" اس نے ابا جی کو دانتوں تلے پیسا تھا، اقبال بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"ہاں، ہاں، میں تو جا رہا ہوں، بہت شکریہ، ان شاء اللہ جلد ملاقات ہوگی، رب راکھا۔" وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا، کاشف نے غصے سے میز پر مکا مارا۔

"کمینہ، گھٹیا، ابی نے اسے بتا کر اچھا نہیں کیا، میں پوچھوں گا، یہ کمینہ مجھ سے زیادہ پیارا ہو گیا ہے، انہیں۔" اس کا تمام غصہ فاخرہ پر نکلنا تھا اور اسی بات کا خدشہ کئی کلومیٹر دور بیٹھی فاخرہ کو بھی تھا۔ اسی لیے وہ بے حد پریشان اور متفکر بیٹھی آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ماما اور میرب شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور وہ خاموش تماشائی تین میں نہ تیرہ میں۔ روزانہ ہی بازاروں کے چکر لگ رہے تھے اور روزانہ ہی ہزاروں، لاکھوں کی شاپنگ ہو رہی تھی۔ مگر وہ اس ساری شاپنگ سے محروم، بے بسی سے بس ماں اور بہن کی آنیاں جانیاں ہی دیکھ رہی تھی، کبھی کبھار وہ لاؤنج میں ہی بیٹھی ہوتی تھی تو میرب اپنے کپڑوں اور جوتوں کو کھول کھول کر دیکھتی، اسے بھی دیدار کروا دیتی تھی۔

"پیارا ہے نا، بہت قیمتی ہے یہ سوٹ، شاپ والے نے کہا کہ آپ یہ ضرور لیں، آپ پر یہ بہت سوٹ کرے گا، لگتا ہے یہ آپ کے لیے ہی بنا ہے۔ کیسا ہے؟"

وہ سی گرین بے حد نازک اور خوب صورت کام والا دوپٹہ اپنے سر پر اوڑھ کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ماہین کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے دل سے اعتراف کیا۔ واقعی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"ہاں، مگر یہ کلر تم پر سوٹ نہیں کرے گا، یہ بہت فیئر (گورے) رنگ پر جچتا ہے۔ تم اس کلر کا سوٹ مت بنوا لینا۔ ورنہ..."

"ورنہ!" اس کا ہاتھ بے اختیار دوپٹے سے پھسل گیا تھا۔ اس نے غصے سے میرب کو گھورا۔

"ورنہ بہت عجیب لگو گی، تمہیں پتا ہے نا، تم نے میری نقل میں وہ پرپل سوٹ سلوایا تھا، جو تمہیں بالکل سوٹ نہیں کیا تھا اور تم نے وہ یقیناً" ارم کو دے دیا ہوگا۔" ماہین نے تحمل سے اس کی بات سنی۔ پھر یک دم ہنس دی۔

"وہ میں نے ارم کو نہیں دیا تھا، بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوڑے دان میں پھینک دیا تھا۔" اس نے بڑے ہی سرد لہجے میں اسے اطلاع دی اور پھر وہاں سے اٹھ کر چل دی جبکہ میرب کا منہ حیرانی سے کھلا رہ گیا تھا۔

"واٹ، کیا ماہین!" اور وہ اس کا چیخنا چلانا قطعی نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

"ہاہ، اب تپتی رہے، سمجھتی کیا ہے خود کو، یہ تم پر سوٹ کرے گا اور یہ نہیں کرے گا، ہر رنگ، ہر شے پر اسی کا حکم چلتا ہے، جیسے ہر چیز اس کے لیے بنی ہے، بڑی خوش فہم ہے۔" وہ اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے آئینے کے سامنے آ گئی تھی۔

"کیا واقعی سفید رنگ اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ اس پر سب جچ جاتا ہے اور سب اچھا لگتا ہے، اور میرا رنگ، مجھے گہرے رنگ پسند ہیں، مگر میں اپنے پسندیدہ رنگ نہیں پہن سکتی کیونکہ سب ہی مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ ماما ہر وقت کہتی ہیں۔ ہلکے ہلکے رنگوں کے کپڑے پہنا کرو، تو پھر میری خواہش کب پوری ہوگی۔" اس نے حسرت سے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ سفید شلوار، ہلکی پنک قمیص، سفید دوپٹہ۔

"کتنی کمی ہے میری زندگی میں رنگوں کی۔" مجھے گہرے رنگوں کی لپ اسٹک پسند ہے۔ مگر"

"تم اپنی مرضی کیا کرو، میرب تمہاری مرضی پر چلتی ہے کیا، جو تم اس کی مرضی پر چلتی ہو۔" ارم نے کئی بار اسے سمجھایا تھا، مگر وہ اتنی بہادر نہیں تھی کہ اس کی باتوں پر عمل کرنے کا سوچ بھی لیتی۔

"شادی کے بعد جو مرضی پہننا، جیسا مرضی پہننا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ایک بار مما نے کہا تھا۔

"تو کیا کاشف۔" ایک خوب صورت سی

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی تھی۔

"ہاں... وہ مجھے نہیں روکے گا' وہ کہتا ہے تم پر سب رنگ سجتے ہیں۔ تم ہر روپ میں مجھے اچھی لگتی ہو۔ وہ میرے ظاہری حسن کو نہیں دیکھتا' وہ تو میرے باطنی حسن کا دیوانہ ہے' مجھے سنہری پری کہتا ہے۔"

جوں جوں وہ کاشف کے بارے میں سوچ رہی تھی اس کے گہرے سانولے رنگ میں عجیب سی روشنی پھیل رہی تھی۔

"شادی کے بعد میں اپنے سارے پسندیدہ رنگ پہنوں گی گہرے رنگ' جو کبھی نہیں پہنے ہیں اور گہرا ڈارک میک اپ بھی کروں گی' سرخ' مہرون' اورنج لپ اسٹک بھی لگاؤں گی' تب مجھے ماما یا میرب دونوں میں سے کسی کا خوف نہیں ہوگا' نہ کوئی روک ٹوک' نہ طنز' نہ کوئی طعنے دینے والا۔" وہ بے حد خوش اور مطمئن سی سب سوچے جارہی تھی۔ موبائل بیل پر یک دم چونکی۔ بے ساختہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلی تھی۔ دوسری جانب کاشف کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"بڑی لمبی عمر ہے تمہاری' میں تمہیں ہی یاد کررہی تھی۔"

"واقعی' یعنی شیطان کو یاد کیا تو شیطان حاضر۔" وہ زور سے ہنسا۔

"تم شیطان نہیں ہو' تم تو فرشتہ ہو کاشف! میری صبح کا ستارہ' میری امید اور خوشی کی سحر۔" وہ جذب سے کہہ کر جیسے اپنے لفظوں کے سحر میں خود ہی کھوگئی تھی۔

"بہت شکریہ میری جان' یہ تو تمہاری ذرہ نوازی ہے' جو مجھے اتنا بلند رتبہ دیتی ہو' ورنہ میں کیا' میری اوقات کیا۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو کاشف! تم خود کو میری نظر سے دیکھو' میرے دل میں تمہاری محبت کتنی زیادہ ہے' تم اندازہ نہیں لگاسکتے ہو۔"

"لگا سکتا ہوں' یہ تمہاری محبت ہی تو ہے' جو مجھے نواز اکرم نے اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ ہاں بس ایک بات مجھے تکلیف دیتی ہے کہ۔" وہ یک دم سنجیدگی سے کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ ماہین بری طرح بے چین ہوئی۔

"کیا' کیا ہوا ہے' کیا بات تمہیں تکلیف دیتی ہے کاشف' مجھے بتاؤ۔"

"اپنی غربت' میں تمہیں اپنے دل کی ملکہ تو بنا چکا ہوں' مگر سچ مچ تمہیں کسی ملکہ کی طرح اپنے گھر میں نہیں رکھ سکوں گا۔ کیونکہ میں اتنا دولت مند نہیں ہوں' ایک غریب' معمولی...."

"کاشف...." اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی' ماہین نے چیخ کر اس کی بات کاٹی تھی۔

"تمہاری اس بات سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے کاشف! میں دولت کی بھوکی کوئی سطحی سوچ رکھنے والی لڑکی نہیں ہوں' مجھے روپیہ' پیسہ' دولت کی کوئی خواہش نہیں ہے' میرے لیے سب سے اہم تمہاری محبت اور عزت ہے' تم اپنے اندر سے یہ امیری' غریبی کا کمپلیکس نکال دو۔"

"او کے' او کے ڈیر' توبہ' میری توبہ' اب کوئی بات نہیں کروں گا' بس۔"

"پیسے کے علاوہ محبت اور اعتماد کی باتیں جتنی چاہے کرو' کوئی رکاوٹ' پابندی نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولی تھی۔

"سوچ لو' بہت بڑی اجازت دے رہی ہو' پھر نہ کہنا مجھے تنگ کرتے ہو۔" کاشف نے معنی خیزی سے اسے جتایا تو وہ سرخ ہوکر زبان دانتوں تلے دبا گئی۔

"کیا ہوا؟ اب چپ کیوں ہو۔" کچھ ہی دیر بعد وہ شرارت سے ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں' اچھا اب میں فون بند کررہی ہوں۔ پھر بات کروں گی' شام کو او کے بائے۔" اس نے کاشف کی "سنو' سنو" کو نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے فون بند کردیا تھا۔ ورنہ وہ مزید رومانٹک ہوجاتا۔

"کاشف!" بے حد سکون سے لیٹ کر بند آنکھوں میں اس کا سراپا سموئے اس نے آہستہ سے پکارا تھا۔

"آیان! شادی میں محض ہفتہ باقی ہے اور تم ابھی تک اپنی منی' شیلا ٹائپ گرل فرینڈز کے چکروں سے نہیں نکل سکے ہو۔ ابھی تک فون بھی آتے ہیں اور... تمہارے پاپا بہت ناراض ہورہے تھے۔ بیٹا! یہ تمہاری پسند سے شادی ہورہی ہے اور تم میرب سے محبت کے دعوے دار ہو تو اس کے لیے اپنی زندگی میں موجود سب لڑکیوں کو نکال دو کیونکہ ان سب کے ساتھ تم میرب کو خوش نہیں رکھ سکو گے۔ عورت مرد کی شیئرنگ کسی بھی صورت میں پسند نہیں کرتی۔ گھروں میں لڑائی' جھگڑے شروع ہوجائیں تو سب ہی کا آرام' سکون برباد ہوجاتا ہے اور میں اپنے گھر کا آرام' سکون کبھی برباد کرنا نہیں چاہوں گی' اسی لیے تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ تم سیریس ہوجاؤ۔"

عالیہ واسطی نے بڑے سنجیدہ انداز میں اسے سمجھایا تھا۔ آیان سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا ان کی بات سنتا رہا۔

"ماما ڈونٹ وری' آپ کو میری جانب سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اور وہ میری منی' شیلا ٹائپ گرلز تو محض ٹائم پاس ہیں۔ میرب کے آنے کے بعد ان کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔"

"پرامس۔" عالیہ واسطی ابھی بھی بے یقین تھیں۔

"یس ماما' شیور' آئی نو میرب بہت پوزیسو ہے میرے معاملے میں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کرے گی۔ سو میں بھی مزید پکا مسلمان بن جاؤں گا۔ نیک' شریف شوہر' جیسا ڈیڈی شادی کے بعد بن گئے ہیں۔" وہ ہونٹ دبا کر شرارت سے کہتے ہوئے ماما کو دیکھتا معنی خیزی سے ہنسا۔ عالیہ واسطی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تم اپنے ڈیڈی سے خود کو مت ملاؤ' انہوں نے کبھی تم جیسی حرکتیں نہیں کی ہیں۔ وہ بہت شریف اور اچھے انسان تھے۔" عالیہ واسطی نے خفگی سے اسے جتایا تو اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"اللہ ہر کسی کو آپ جیسی بیوی دے' جو شوہر کی ساری خامیوں پر پردہ ڈال کر اسے ستی ساوتری بن کر دکھائے۔"

"بکو مت۔ اتو رکو میں یونیورٹی کے زمانے سے جانتی ہوں' مجھ سے ملنے سے پہلے وہ جو بھی کرتے تھے الگ بات ہے' مگر مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے کبھی کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔"

"کیوں نہیں دیکھا مما' کل بھی بازار میں ایک بڑی اسمارٹ سی' فیشن ایبل آنٹی کو گھور رہے تھے۔" عالیہ واسطی کے دعوے پر اس نے جل کر کہا تو انہوں نے غصے سے اسے گھورا۔

"اپنے کرتوت پر پردہ ڈالنے کو تم اپنے باپ کو بدنام کررہے ہو' شرم کرو آیان! اور ہاں اب مزید کوئی ایڈونچر مجھے برداشت نہیں ہوگا۔ انڈر اسٹینڈ۔"

وہ اسے تنبیہہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ آیان واسطی نے منہ بنا کر سر جھٹکا۔ پھر گہرا سانس لے کر زیر لب بڑبڑایا۔ "لوگ صحیح کہتے ہیں شادی نہ کرنا یارو' پچھتاؤ گے ساری لائف۔ ابھی تو میرب گھر میں آئی بھی نہیں اور مجھ پر پابندیاں لگ رہی ہیں' بعد میں تو

"ہائے میری منی' شیلا' بلو' کِی۔ کیا ہوگا ان بے چاریوں کا اور خود میرا' میں کیا' ان سب کے بغیر صرف اور صرف ایک عورت کے لیے زندگی وقف کرسکتا ہوں؟" عجیب سی الجھن میں مبتلا سوچ رہا تھا۔ اس جیسے کلی کلی منڈلانے والے بھنورے کے لیے ایک ہی ڈال پر بسیرا بہت مشکل تھا۔

"اف' کیا ہوگیا ہے مجھے' کتنا عجیب سوچ رہا ہوں میں' توبہ۔" اس نے گھبرا کر سر جھٹکا' اور جلدی سے میرب کا نمبر ملایا۔ اسے میرب سے بات کرنے کی شدید خواہش ہورہی تھی یا پھر وہ خوف زدہ تھا' اپنے اندر اٹھتے جذبات سے اپنی توجہ ہٹانے کو فوراً" کسی ساتھی کی ضرورت تھی اور میرب سے بڑھ کر قریبی اور بہت خاص ساتھی کون ہوسکتا تھا۔

"ہیلو' چارمنگ! کیا کررہے ہو۔" دوسری جانب سے میرب کی کھنکتی' خوب صورت آواز نے پل میں طبیعت کو ہشاش بشاش کردیا تھا۔ وہ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔

"بور ہو رہا ہوں اور تمہیں مس کر رہا ہوں۔"

"ریئلی، آئی مس یو ٹو، تم ایسا کرو میرے گھر آجاؤ، دونوں مل کر کہیں ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ موسم بھی بہت اچھا ہو رہا ہے۔"

"او جیو میری جان، یہ ہوئی نا بات، میں ابھی آیا، تم نے تو میرے دل کی بات کردی ہے گریٹ۔" وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے فون بند کرکے باہر بھاگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما سے تو پوچھ لوں۔" میرب نے کہہ تو دیا تھا۔ مگر سارا سے بہر حال اجازت لینا تھی اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ سارا اسے اجازت نہ دیتیں۔

"شادی میں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ اب تم آیان سے ملنا جلنا کم کردو۔"

"واٹ! آپ کا مطلب پردہ شروع کردوں؟" سارا کی بات پر اس نے ہنستے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پردہ کرنے سے دلہن پر روپ آتا ہے میرب!" میرب نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"کم آن ماما! یہ پرانے زمانے کی دقیانوسی باتیں ہیں، آج کل تو یہ رنگ روپ صرف اور صرف ایک اچھے پارلر کی وجہ سے ہی آتا ہے اور میں اس شہر کے سب سے اچھے پارلر میں بکنگ کروا چکی ہوں۔ ہاں ماہین کو یہ ترکیب ضرور آزمانا چاہیے، ہو سکتا ہے اسی بہانے سے... میرا مطلب آپ سمجھ گئی ہوں گی ماما۔"

سامنے سے آتی ماہین کو دیکھ کر اس نے فوراً" بات بدل دی تھی۔ ماہین ٹھٹک کر رکی۔ وہ مزے سے اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر چلتی بنی تھی۔ اور ماہین وہاں سے ہل بھی نہیں سکی تھی۔

"تم کہیں جا رہی ہو؟" اسے یوں گم صم دیکھ کر سارا نے پوچھا تو وہ چونکی۔

"جی ماما۔ بازار جا رہی ہوں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"ارم کو بلایا ہے اسی کے ساتھ جاؤں گی۔"

"کتنا کام باقی رہ گیا ہے اور... ختم کرو اب یہ بازاروں کے چکر لگانا۔ ایک ہفتہ تو رہ گیا ہے شادی میں۔"

"جی ماما۔" جی تو چاہا، پوچھے، ابھی میرب جو باہر گئی ہے۔ کس لیے۔ کس کے ساتھ اور کیوں والے سوال اس سے تو نہیں پوچھے تھے آپ نے۔ پھر ساری پابندیاں میرے لیے۔ بس میرے لیے ہی کیوں۔؟ مگر ہمیشہ کی طرح خاموشی سے بیرونی دروازے کی جانب چل دی تھی۔

"سنو۔ گاڑی ہے۔؟" اس نے بیرونی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو یک دم ماما کی آواز آئی تھی۔

"جی ماما۔"

"کاشف لایا ہے گاڑی؟" ماما کے استفسار پر وہ پل بھر میں ان کا مدعا سمجھ گئی۔ بے ساختہ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے "ماما کاشف کی بے عزتی کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ اسے کم تر ثابت کرنا اور اسے اس کی اوقات یاد دلانا انہیں کبھی نہیں بھولتا تھا۔

"ماما! کاشف ڈرائیور نہیں ہے۔ اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔ گاڑی ڈرائیور ہی لایا ہے۔" اس نے "ڈرائیور" پر خاص زور دیتے ہوئے ماما کو دونوں کا فرق سمجھایا تھا۔ اور باہر نکل گئی تھی۔

"کیا بات ہے تمہارا موڈ کیوں آف ہے۔" ارم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ جی چاہا صاف صاف بتادے۔ مگر اس سچ سے خود اپنی بھی توہین ہوتی تھی۔ اس لیے بات پلٹ گئی۔

"یار! مجھے اس ٹیلر نے خوار کردیا ہے۔ ایک ہفتے سے مسلسل چکر لگا رہی ہوں۔ اور اب تک کپڑے نہیں سلے۔ آج میں نے اسے خوب سنائی ہیں۔ اگر آج بھی ماسٹر جی نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔" اس نے اپنا سارا غصہ ٹیلر پر نکال دیا تھا۔

"اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ہفتہ باقی ہے۔ مل جائیں گے کپڑے اور اگر کوئی رہ گیا تو میں پک کرلوں گی تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔" ارم نے بڑے پیار سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔ ارم نے بغور اسے دیکھا۔ بچپن سے وہ اس



کا ہر رنگ، ہر روپ، ہر انداز، حتی کہ لب و لہجے کا اتار چڑھاؤ بھی دیکھتی اور پرکھتی آئی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اب اس کے موڈ کو پہچان نہ پاتی یقیناً" اسے گھر سے ڈانٹ پڑی تھی۔ سارا یا میرب۔ اس نے ماہین کے منہ سے ہمیشہ ان ہی دونوں کے نام سنے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی میں بھی ہمیشہ یہی دو نام سرفہرست ہوتے تھے۔

"تم کسی اور کا غصہ ماسٹر صاحب پر اتار رہی ہو ماہین۔ سچ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہوئی ہے؟"

ارم کی بات پر یکدم اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ دل تو پہلے ہی بھرے جام کی طرح چھلکنے کو بے تاب تھا۔ ارم کی ذرا سی ہمدردی پر فوراً" اس کے اندر جیسے بگولے گھوم گئے تھے۔

"ماما کہتی ہیں۔" حلق تک نمکین پانی بھر گیا تھا۔

"پلیز رو تو نہیں۔" ارم نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں ایسی نہیں ہوں۔ پھر ماما مجھے الٹی سیدھی باتیں کیوں کہہ جاتی ہیں۔ کیوں۔ کیا ان کی نفرت۔" اس کے اندر کانٹا چبھا تھا۔ اذیت لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"میرب کو تو کبھی انہوں نے ایسے نہیں کہا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ان کی مرضی کے خلاف کام کرتی ہے۔"

اس کے انداز میں عجیب سی بے بسی اور محرومی تھی۔ جس نے چہرے کو مزید سیاہی مائل نیلا کردیا تھا۔ ارم نے اس کے کندھے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھا۔ اسے بہت ترس آتا تھا اس پر۔ وہ جب بھی اپنی بہن اور ماں کی زیادتی کا شکار ہوتی تھی تو ایسے ہی خود ترسی اور بے بسی سے بولتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اپنا کندھا پیش کردیتی تھی۔ تاکہ وہ کھل کر رو لے۔ اگرچہ وہ اپنا کندھا پیش کرنے کی پوری قیمت وصول کرتی تھی۔ اس کے ساتھ دوستی کا رشتہ محض بے غرض اور بے لوث نہ تھا۔ کپڑے، جوتے، تحائف، ہر ضرورت میں پیسوں سے مدد، بغیر ضرورت بخوشی دیے جانے والے تحائف۔

دونوں اپنی اپنی ضرورت کے لیے ایک دوسرے کی محتاج تھیں۔ اور یہی محتاجی دوستی کے پل صراط کا کام دے رہی تھی۔ دوستی بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی غرض کے ساتھ جڑی دوستی بھی دیرپا اور کھری ثابت ہوتی ہے۔ کچھ لو اور کچھ دو کا اصول، دو انسانوں کے درمیان کا بنیادی اصول دوستی، تعلق اور رشتے داری استوار کرتا ہے۔

"چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ دل برا مت کرو۔ آؤ! ماسٹر صاحب کی دوکان آگئی ہے۔" ارم نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی۔ وہ ابھی بھی نم آنکھیں لیے خود کو سنبھال رہی تھی۔

"تم چند دن کی مہمان ہو اپنے گھر میں۔ سب کی باتوں کو ایک کان سے سنو اور دوسرے سے اڑادو۔ دیکھنا شادی کے بعد تم سب باتیں بھول جاؤ گی۔ کاشف کی محبت، پیار اور اعتماد تمہیں سب کچھ بھلا دے گا۔ تم بہت خوش رہو گی اور یہ سارا گزرا وقت۔ جو تمہیں تکلیف دیتا ہے نا۔ یاد بھی نہیں رہے گا۔"

ارم کی حسین باتوں نے ٹانک کا کام دیا تھا۔ وہ فوراً" سب کچھ بھلا کر مسکرا دی تھی۔ کاشف کا خیال۔ اس کے ساتھ گزارے جانے والے دن، نئے گھر کا تصور اور نئے گھر کی خواہش۔ اسے سب کچھ بھلا دیتا تھا۔ اور پھر نہ تو اسے سارا کی زیادتیاں یاد رہتی تھیں۔ اور نہ ہی میرب کے طنز اور مذاق۔ وہ ساری تلخی کاشف کے لہجے کی مٹھاس سے ختم ہو جاتی تھی۔

اسے بھی آنے والے دنوں کا شدت سے انتظار تھا۔ جب سارا وقت اسی کا ہو گا اور کاشف کا۔ اور ان دونوں کے حسین، خواب ناک محبت بھرے دن۔

ارم نے شاپ میں داخل ہونے سے قبل اطمینان سے اسے دیکھا۔ اس کا موڈ بہت نارمل اور اچھا ہو گیا تھا۔ کاشف کا ذکر اس کے موڈ کو ہمیشہ ہی بدل دیتا تھا۔ اور پھر وہ تمام وقت بڑے خوش خوش انداز میں اس کے ساتھ شاپنگ کرتی رہی تھی۔ ماسٹر صاحب نے اگرچہ ابھی تک اس کے دو سوٹ سیے بھی نہیں تھے۔ اس

کے باوجود اس نے ان پر غصہ نہیں کیا تھا۔ نہ چیخی چلائی نہ پریشان ہوئی۔ اسی طرح خلاف طبیعت دکان دار سے بغیر جھگڑا کیے اس نے اتنا میک اپ کا سامان بھی خرید لیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک بہ بڑا معرکہ تھا۔ جس کے لیے ارم خود کو خاصا تیار کر کے آتی تھی کہ ماہین کو ہر وہ پراڈکٹ چاہیے ہوتی تھی جو رنگ گورا کرتی تھی۔ خواہ وہ اس کے لیے مناسب ہوتی تھی یا نہیں۔ اور اگر دو کاندار شامت اعمال اسے کسی معاملے میں مشورہ دے دیتا تھا تو وہ بھڑک اٹھتی تھی۔ اسے اپنے رنگ کی مناسب سے میک اپ کا سامان خریدنا قطعی پسند نہ تھا۔

"مجھے یہ ہلکے براؤن۔ پیلے اور سفیدی مائل آف وائٹ کلرز بالکل پسند نہیں ہیں مت دکھائیں۔ برائٹ ڈارک کلرز دکھائیں۔" اس کی ایک ہی ڈیمانڈ ہوتی تھی۔ اور اسی لیے بے تکے اور بے کار سامان سے بھری الماریاں بھی اسے مطمئن نہیں کر سکی تھیں۔ مگر آج تو کمال ہی ہو گیا تھا۔

"آج تم نے بہت اچھی شاپنگ کی ہے۔ ساری چیزیں ہی بہت شان دار ہیں۔" گھر آ کر ارم ڈبے کھول کھول کر اس کی لائی ہوئی چیزوں کی تعریف کر رہی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنسی۔

"کیونکہ یہ سب تمہاری ہی پسند ہیں۔ تمہیں تو اچھی لگیں گی نا۔" اس نے اس کے ہاتھ سے نیلا دوپٹہ لے کر اپنے کندھے پر پھیلایا اور آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"خالی میرے اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم خود بھی تو پسند کر رہی تھیں۔ جب ہی تو خرید رہی تھیں۔" وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے ہی آ گئی تھی۔

"ہوں۔ چوائس تمہاری اچھی ہے۔ مجھے کاشف نے بھی کہا تھا کہ تمہارے مشورے سے شاپنگ کروں۔" ماہین کی بات پر ارم حیرت سے چونکی۔

"کاشف بھائی نے کہا تھا۔ کیا مطلب انہیں کس نے بتایا میری چوائس کے متعلق۔"

"میں نے۔ جتنا میں تمہارے بارے میں جانتی ہوں۔ اتنا ہی وہ بھی جانتا ہے۔" ماہین کے انکشاف پر وہ غصے اور خفگی سے اسے گھورنے لگی۔

"تم نے مائنڈ کیا میری بات کو؟" اس کی خاموشی پر ماہین نے اچنبھے سے پوچھا۔ ارم اس کی کسی بات کو مائنڈ بھی کر سکتی ہے۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتی تھی۔ اس کا مذاق' اس کا غصہ' اس کے طنز۔ سب ہی کچھ ارم نے ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ تو پھر اب۔ یہ معمولی سی بات۔!

"نہیں مائنڈ تو نہیں کیا۔ مگر حیران ضرور ہوں۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تم میری باتیں کاشف بھائی کو بتاتی ہو۔"

"تمہاری باتیں بتاتی نہیں ہوں۔ کاشف کے ساتھ کرتی ہوں۔ میری واحد مخلص' رازداں دوست کم بہن اور اس کی سالی۔ آدھی گھر والی۔" ماہین نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے قریب بٹھا لیا تھا۔ ارم بے ساختہ ہنس دی۔

"خیر۔ میں کیا بنوں گی۔ آدھی گھر والی۔ وہ تو میرب کا مقام ہے اور اسی کا رہے گا لیکن تمہارا شکریہ تم نے مجھے اتنا اعتماد دیا۔ مان دیا۔"

"تم مجھے میرب سے بڑھ کر عزیز ہو ارم۔" اس نے بے ساختہ اسے گلے لگا لیا۔

"تھینک یو۔ اس کے ساتھ ہی تو خلوص اور محبت کا رشتہ تھا اس کا۔ اسے ارم ثروت پھپھو کی طرح لگتی تھی۔ مہربان نرم دل اور درد آشنا۔ جیسے ثروت پھپھو اس کا ہر رنگ' ہر انداز پہچانتی تھیں۔ اسی طرح ارم بھی اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کرتی تھی کہ وہ خوش ہے یا دکھی۔

"میں نے کل ثروت پھپھو سے کہا تھا کہ آپ اب آ جائیں۔ غیروں کی طرح شادی کارڈ پر لکھی ڈیٹ پر آئیں گی تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

"پھر آ رہی ہیں وہ۔؟" ارم نے سینڈوچ کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

"کہہ تو رہی تھیں کہ کوشش کروں گی۔ ایک دو دن میں آنے کی۔ مگر مجھے پتا ہے' انہیں اپنے چڑیا گھر کو چھوڑ کر آنا بہت مشکل لگتا ہے۔"

"مجبوری ہے نا ان کی بھی۔ تم ضد نہ کرو۔" ارم کی بات پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ضد۔ میں بھی انسان ہوں۔ ارم۔ دل چاہتا ہے ضد کرنے کو۔ اور خواہش ہوتی ہے کسی سے اپنا آپ اپنی بات منوانے کی۔ ماما اور میرب سے تو کبھی میں نے کچھ نہیں کہا۔ بابا کو بھی مجبور نہیں کرتی ہوں۔ مجھے پتا ہے وہ میرے لیے بہت حساس ہیں اور میری بات ہر صورت پوری کرنے کے لیے پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مان اور زور وہاں ہی آزمایا جاتا ہے۔ جہاں مان جانے کی آس ہو۔ میں نے کبھی بھی ماما کے ساتھ ضد نہیں کی کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ وہ ڈانٹ دیں گی اور صاف جواب پر میرا دل ٹوٹ جائے گا۔" اس کے لہجے میں ٹوٹا ہوا کانچ سا بکھرا تھا۔ ارم کا دل بوجھل ہو گیا۔

"تم بہت حساس ہو گئی ہو ماہین! اتنا فیل یوں کرتی ہو ہر بات کو۔ بس نارمل رہا کرو۔" ارم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

"تمہارے اپنوں کے رویے ہمیں ابنارمل بنانے ہیں ارم۔ خیر وہ یک دم سنبھل گئی تھی۔

"آؤ کچھ اور کھاتے ہیں یہ سینڈوچ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ کوئی مزے کی چٹ پٹی چیز بنواتے ہیں خالہ سے۔" وہ اسے لے کر کمرے سے نکل گئی اور کچن کی جانب ان دونوں کو ہنستے کھلکھلاتے جاتے دیکھ کر لاؤنج میں بیٹھی سارا علوی کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"بے وقوف لڑکی کو نہ جانے کب عقل آئے گی۔ ہر وقت اس لالچی' لڑکی کو ساتھ چپکائے رکھتی ہے۔ بھوکی۔" اس نے دانت پیس کر ارم کی شان میں اضافہ کیا۔

"شکر کروں گی۔ شادی کے بعد کم از کم اس بلائے جان سے چھوٹ جائے گی اس کی بے وقوفی' کم عقلی میرب سے ہی عقل سیکھ لے۔ جو دوستی بھی اپنے اسٹینڈرڈ کے مطابق کرتی ہے۔" وہ دونوں بیٹیوں کے موازنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتی تھیں۔

"میرب! تم سے ایک بات پوچھوں۔" وہ دونوں ساحل کی گیلی ریت پر چلتے جا رہے تھے اور ان کے ننگے پاؤں آتی جاتی لہروں سے عدم توازن کا شکار ہو کر لڑکھڑاتے تھے تو دونوں ایک دوسرے کا سہارا لے کر زور زور سے قہقہے لگانے لگتے تھے۔

"ہوں بولو....." میرب نے اس کا بالوں بھرا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے..... تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" آیان کا سوال سن کر وہ بے ساختہ لڑکھڑائی تھی۔ پیروں تلے سے ریت جاتی لہر بہا لے گئی تھی۔ آیان نے فوراً اسے سنبھالا۔

"تھینک یو۔ تم نے محبت کے بارے میں پوچھا ہے۔ نہیں کی ہے۔" میرب کی بات پر اس نے کچھ دیر بغور اسے دیکھا تھا۔

"مجھ سے پہلے کبھی کسی کو پسند کیا۔ کوئی اچھا لگا۔" بہت کائیاں تھا وہ بھی۔ اس کا جواب بن سنے ہی جان گیا تھا۔ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور لڑکیوں پر تو اس نے گویا پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔

ماضی' وہ کیا شعر ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

شعر پڑھ کر وہ زور سے ہنسی۔

"اگر یہی سوال تم سے کروں تو' تمہارا جواب کیا ہو گا؟" مقابل بھی تو میرب نواز تھی۔ اسی میدان کی شہہ سوار' جس کا وہ شاطر کھلاڑی تھا۔

"تو؟" آیان نے بغور اسے دیکھا۔ پھر گہری سانس لے کر سامنے سے آتی بڑی لہر کو دیکھنے لگا' جس کی اونچائی اس کے کندھوں کے برابر تھی اور جو بڑی تیزی اور تندی کے ساتھ پھنکارتے ہوئے اسے اپنی لپیٹ میں لینے کو اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ پھرتی سے میرب کا بازو تھام کر پیچھے ہٹا۔ اس کے باوجود دونوں سر تا پا بھیگ گئے تھے۔

"اف پانی بہت wild ہو رہا ہے۔ آؤ باہر چلیں۔" میرب کے منہ میں نمکین پانی چلا گیا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔ کنارے کے بنچ پر آیان کی پانی والی بوتل پڑی تھی۔ اس نے بوتل کا ڈھکن اتار کر میرب کو دیا۔ صاف شفاف منرل واٹر سے کلیاں کر کے منہ دھو کر اس نے چند گھونٹ حلق میں انڈیلے اور گیلی شرٹ جھاڑتے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئی۔ آیان بھی اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بھرپور نظر اس کے بھیگے قیامت خیز سراپے پر ڈالی۔ دودھیا رنگت سیاہ شرٹ میں دمک رہی تھی۔ اس کا بازو بنچ کی پشت پر پھیلا اور ہاتھ میرب کے کندھے پر جا ٹکا تھا۔ میرب یکدم چونکی۔ بغور اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھا۔ آیان کی نگاہوں میں عجب سا تاثر تھا۔

"آئی تھنک۔ ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے اب چلیں۔"

اس کے اندر ایک سنسناہٹ سی دوڑی تھی۔ اور اگلے ہی پل وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیا! کیوں بھئی؟ ابھی تو ہمیں بہت باتیں کرنا ہیں۔ بیٹھو نا یار!" آیان نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا۔ مگر وہ اس وقت یہاں بیٹھ کر خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ مرد کے انداز و اطوار اور اس کی نظروں کے زاویے اس نے بھی بہت دیکھے تھے۔ آیان کی نظریں بھٹک بھٹک کر اس کی سیاہ شرٹ جو اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی، پر اٹھ رہی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ یہ بھٹکنا صرف نظروں کا ہی نہیں تھا۔ قدموں کو بھٹکنے کے لیے محض چند فٹ سے بھی کم کا فاصلہ مشکل نہ تھا۔

"آیان، چلو نا مجھے، مجھے خارش ہو رہی ہے۔ میری سکن بہت حساس ہے۔ لگتا ہے ریش پڑ گئے ہیں۔ اوہ گاڈ! او نا پلیز۔" اس کے سفید بازوؤں پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ آیان نے کوفت سے اسے دیکھا۔

"او کے آؤ چلیں۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ تمہیں سی واٹر سے ایسی الرجی ہے۔"

"ہاں۔ مجھے یہ پانی سوٹ نہیں کرتا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے بیگ سے لوشن نکال کر اپنے بازوؤں، ہاتھوں پر مل لیا تھا۔ جس سے سرخ دھبوں میں کچھ سکون ملا تھا۔

"مجھے گھر چھوڑ دو۔ میں شاور لے کر چینج کروں گی۔"

آیان نے سر ہلایا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میرب نے شدت سے اس کی خاموشی اور خفگی دونوں محسوس کی تھیں۔ مگر ابھی باز پرس کا وقت نہیں تھا۔ ناراضی کا اظہار وہ بھی کر سکتی تھی۔ مگر موقع مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے مسکرا کر اسے خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اسی پل ماہین بھی روش پر اسے آتی دکھائی دی تھی۔

"تم کہاں سے آ رہی ہو؟" اس نے سر تا پا اسے کڑی نظروں سے گھورا تھا۔ میرب کے منہ میں سمندر کا نمکین پانی گھلنے لگا۔

"جہنم سے۔" وہ چیخ کر بولی تھی۔ ماہین نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"جہنم میں کیا نہانے گئی تھیں!؟"

"ہاں۔ تم بھی جاؤ۔ تمہیں عقل آ جائے گی۔" وہ اسے گھورتی تلخی سے جواب دے کر اندر چلی گئی۔ ماہین کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

"ہوں، جہنم میں تو یہ ضرور جائے گی۔ جیسے اس کے کرتوت ہیں۔

ماما کو اب کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اس کی بھی تو شادی میں ایک ہفتہ بلکہ چھ دن باقی ہیں۔ بھگتے گی خود ہی سزا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے گیٹ کی سمت چل دی تھی۔

"گل خان، کاشف صاحب آ رہے ہیں۔ آ جائیں تو مجھے اطلاع کرنا۔" اس نے چوکیدار کو اطلاع دی اور واپس مڑی۔ کاشف کے لیے اس نے کپڑے خریدے تھے اور وہ اسے دینے تھے۔ اسی لیے اسے بلایا تھا۔ ماما اپنی کسی فرینڈ کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ میرب گھر نہیں تھی۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے کاشف کو بلا لیا تھا۔ مگر اب میرب کی واپسی ہو گئی تھی۔



"اگر آج میرب نے کاشف کو کچھ کہا تو میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ عمر اور رتبے میں بڑی ہوں۔ ڈانٹ دوں گی۔" اس نے فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر لان کی کرسیوں کو ترتیب سے سیٹ کر کے ایک پر بیٹھ گئی بیس منٹ کے انتظار کے بعد کاشف آ گیا تھا۔

"ہاں جی آپ بتائیں۔ کیا حکم ہے۔ جو اتنی ایمرجنسی میں بلایا ہے۔ میں تو تمہارا میسج پڑھتے ہی گھبرا گیا تھا۔ ایسا آرڈر تو تم نے کبھی پہلے نہیں دیا۔" کاشف کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

"بات واقعی بہت ضروری ہے۔ ایک منٹ میں آئی۔"

"مگر بات کیا ہے جو....!" اسے جاتے دیکھ کر اس نے بے ساختہ پکارا۔

"صبر سے بیٹھ جاؤ۔ کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ میں آتی ہوں۔" اس نے رک کر اسے محبت بھری ڈانٹ پلائی۔ تو وہ یکدم کسی بچے کی طرح سہم کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش، ساکت اور سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ ماہین ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔

"یہ لو۔" ڈھیر سارے شاپر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ کیا ہے بھئی....!" وہ حیرت سے ٹھٹکا۔

"تمہارے سوٹ۔ ٹیلر کو دے دو۔ اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ تم اپنی مرضی کے سلوا لو۔" وہ مسکرائی۔

"اتنے زیادہ.... یہ تو، یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" کاشف حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ شاپر کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔

"کیسے ہیں!" اسے بھی اس کا خوش ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

"زبردست، بہت اچھے، بہت ہی اچھے ہیں۔" اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایسے قیمتی اور خوب صورت کپڑے خرید سکتا ہے۔

"یہ تو بہت زیادہ پیسوں کے ہیں۔" اس کے لہجے میں اپنی کم مائیگی کا احساس جھلک رہا تھا۔

"تو میں کیا تم سے قیمت مانگ رہی ہوں۔" ماہین نے خفگی سے اسے گھورا۔

"نہیں۔ مگر تم نے بھی تو بہت زیادہ پیسے خرچ کر ڈالے ہیں نا۔" کاشف کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"مجھے اچھا لگتا ہے، تمہارے لیے شاپنگ کرنا۔ اچھی اچھی چیزیں خریدنا۔ میرب نے آیان کے لیے بہت قیمتی گفٹس لیے ہیں۔ میں کیوں نہ لیتی۔ بابا کی کروڑوں کی جائیداد میں میرا بھی تو برابر کا حصہ ہے۔"

ماہین کی بات پر کاشف کے دل میں ڈھیروں سکون اترا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ آنے والے وقت میں اس کے لیے بہت آسانیاں پیدا ہونے والی ہیں۔ اس کی تمام خواہشات اور تمنائیں یوں ماہین کے توسط سے پوری ہو جائیں گی۔ یہ تو اس کے لیے پرائز بانڈ سے بھی بڑھ کر حیران کن سرپرائز تھا۔

ابھی کل ہی تو رانی اس سے کہہ رہی تھی کہ جلدی سے سارا مال سمیٹ لو تاکہ ہماری شادی بھی جلد از جلد ہو جائے" اور اس نے اس سے کہا تھا کہ ابھی صبر کرو۔ جب تک وہ تمام مال و دولت سمیٹ نہیں لیتا۔ تب تک رانی سے شادی نہیں کرے گا۔ اس جیسے شخص کے لیے محبت یا محبوب اہم نہیں تھا دولت روپیہ پیسہ اہم تھا۔ اس کے لیے محبت یا محبوب دونوں کا مفہوم بالکل الگ تھا۔ رانی بچپن کی ساتھی، کزن اور منگیتر تھی، خوب صورت، جوان، شوخ اور چنچل مگر ساری خوبیوں پر اس کا ایک ریڑھی والے کی بیٹی ہونا ناقابل معافی خامی تھی۔ وہ تمام عمر سسک سسک کر ایک ایک شے کو ترستا اور اپنی خواہشات کو دباتا رہا تھا اس کے بعد تو اب جا کر اس کی دلی مراد پوری ہونے چلی تھی۔ وہ تمام محروم لمحے ننگے پاؤں، ستے ہوئے چہرے اور خشک آنکھیں لیے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے پھر اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی تمام تشنہ آرزوؤں کی تکمیل نہ کرتا۔ رانی کا باپ اس کی شادی جلد از جلد کر کے اپنا فرض پورا کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ابھی اس کا فرض اپنے گلے ڈالنے کو تیار نہ تھا۔

"کاشف.... ہیلو کیا سوچ رہے ہو۔ کہاں گم ہو۔"

ماہین نے اس کا بازو ہلا کر اسے جگایا تو وہ چونکا۔

"ہاں..... آں..... وہ' وہ میں' میں سوچ رہا تھا کہ تم مجھے اتنے مہنگے تحائف روزانہ دیتی ہو اور میں' میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ حالانکہ تمہیں تحفہ دینے کو دل تو بہت کرتا ہے۔ مگر تمہارے معیار کے مطابق۔"

"کاشف! تمہارا یہ احساس کمتری مجھے بہت ہرٹ کرتا ہے۔ کتنی مرتبہ سمجھا چکی ہوں کہ خود کو کم تر مت سمجھا کرو۔ مجھے روپیہ پیسہ' مہنگے تحائف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری محبت کا تحفہ چاہتی ہوں کاشف! جو میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے اس کی چاہ ہے۔"

ماہین نے اس کا ہاتھ تھام کر بڑے پیار سے انداز میں کہا تھا' کاشف نے بے ساختہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط' توانا اور گورے چٹے ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔ اس کے دودھیا' بے حد خوب صورت ہاتھوں میں ماہین کے سیاہ رنگ والے ہاتھ بہت عجیب لگ رہے تھے' مگر وہ محبت کی بارش میں پور پور بھیگتی اس فرق کو بھول چکی تھی۔ جبکہ کاشف کی نظر اس کے ہاتھوں پر ہی تھی۔ اسے ان سیاہ ہاتھوں سے یکدم شدید کراہیت محسوس ہوئی تھی' سیاہ دھبوں کے درمیان اس کے دمکتے سفید ہاتھ۔ اس کا دل چاہا' جلدی سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑوا لے۔ ورنہ اس کے ہاتھ بھی سیاہ ہو جائیں گے اور یکدم اس خیال نے کچھ اس طرح اسے اپنے شکنجے میں جکڑا تھا کہ اگلے ہی پل اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ سیاہ ہاتھوں کے اوپر سے سمیٹ لیے تھے۔

"کاشف....." ماہین اس کی قربت کی گرمی میں گم یک دم چونکی تھی۔ گھبرا کر اسے پکارا۔ وہ دونوں ہاتھ عجیب سے انداز میں مسل رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت دیکھی تھی۔ کراہیت آمیز یا نفرت بھری۔ ماہین کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا کرے۔ کیا کہے۔

"میں' میں سوری۔ میں بھٹکنے لگا تھا۔ میں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کسی طرح ماہین کو مطمئن کرے اور اسے مطمئن کرنے کو ابھی اس کا اپنا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ عجیب سی الجھ جانے والی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی۔ جیسے طبیعت کسی ناپسندیدہ شے کو دیکھ کر بے زار ہو جائے یا اوبھ جائے۔ حلق تک الٹی آجائے۔ مگر کی نہ جائے۔

اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا کاشف؟" ماہین نے حیرانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وہ میں پلیز مجھے ابھی جانے دو ورنہ۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ماہین حیرت زدہ' گم صم سی بیٹھی تھی۔

"ابھی تو میں نے اسے اپنی چیزیں بھی دکھانا تھیں اور ارم کی باتیں بھی بتانا تھیں۔ مگر یہ کیا ہوا کاشف کو ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔ میں تو کچھ بولی ہی نہیں بس۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اس کا چہرہ مایوس اور پریشان لگ رہا تھا۔ بوجھل اداسی اور خاموشی کی چادر اس کے چاروں جانب تنی تھی۔ دل یکدم ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کاشف تو اپنے کپڑے بھی یہاں ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے شاپرز پر نظر ڈالی۔

اتنی محنت کے بعد' اتنی جدوجہد کر کے اس نے کئی گھنٹوں کے بعد مختلف دوکانوں پر چھان پھٹک کر اس کے لیے اتنے خوب صورت کپڑے خریدے تھے اور ان کا یہ حشر! اس نے بے حد دکھ سے سارے شاپر سمیٹ کر دونوں ہاتھوں میں بھر لیے تھے۔ لاؤنج میں میرب کبھی بھی آسکتی تھی۔ اس کی تنقید اور جرح کے لیے اس کا ذہن ابھی بالکل تیار نہ تھا۔ سو بے زاری سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کاشف کو بزنس کے لیے پیسے دیے ہیں؟"

رات کو سارا علوی نے اپنے کمرے میں آتے ہی نواز اکرم سے سوال کیا تھا۔ نواز بری طرح چونکا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس کے منہ سے نکلنے ہی والا تھا۔ اگر وہ اپنی زبان دانتوں تلے نہ دبا لیتا۔ اسے سارا کی سی آئی ڈی کے ایکٹو ہونے کے بارے میں اگر کوئی شک و شبہہ تھا بھی تو دور ہو گیا تھا کہ اس قدر رازداری برتنے کے باوجود اسے پیسوں کا علم ہو گیا تھا۔

"کیا کاشف نے خود..... کیونکہ اس بات سے تو صرف کاشف اور میں۔"

"کیا ہوا نواز! کیا سوچ رہے ہو۔ بہانے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جھوٹ بولنے سے تمہارا ہی قد چھوٹا ہو گا۔ میں جانتی ہوں۔ تم اس کلرک کو بہت کچھ دے چکے ہو۔ پھر اب مزید کیوں پیسہ دے کر اسے اس کی اوقات بھلا رہے ہو۔"

"مم..... میں' میں تو اسے کاروبار کروانا چاہتا ہوں تاکہ۔"

"تاکہ وہ تمہارے رعب سے باہر اپنی من مانی کرتا پھرے۔ اتنا مت دو اسے کہ وہ کل تمہیں دھتکار دے۔ مانا اپنی بیٹی کے لیے تم اسے خرید رہے ہو۔ مگر اسے غلام سے آقا بنانے کی غلطی مت کرو۔ ورنہ تم اور تمہاری لاڈلی' جس کے کہنے پر تم اسے آیان واسطی کے ہم پلہ لانے کی کوشش کر رہے ہو۔ دونوں پچھتاؤ گے۔"

سارا علوی نے سفاکی اور بے رحمی سے آئینہ نواز اکرم کے چہرے کے سامنے لا رکھا تھا۔ بے چارے نواز میں اسے جھٹلانے کی ہمت تھی نہ ہی سراہنے کی۔ لا حسب معمول ہکلا سا گیا تھا۔

"نہیں سارا! ایسا نہیں ہو گا میں تو..... کاشف بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ہمیں دھوکا نہیں دے گا۔"

"یقیناً" اچھا ہو گا۔ مگر جس طرح تم اسے پیسہ دے رہے ہو۔ پھر وہ اچھا نہیں رہے گا۔ کم ظرف کو اتنا مت دو کہ ظرف ہی چھلک جائے۔ آیان واسطی جدی پشتی امیر رئیس زادہ ہے۔ اس کا اور کاشف کا کیا مقابلہ۔"

"کوئی مقابلہ نہیں اور میں کب دونوں کا مقابلہ کر رہا ہوں؟" سارا کے کڑے استفسار پر نواز فوراً" بولا تھا۔

"تو پھر نا انصافی کیوں کر رہے ہو۔ میرب کا بھی تو تمہاری جائیداد میں اتنا ہی حصہ ہے۔ تو صرف ماہین کو اتنا دینے کی کیا تک ہے۔ فلیٹ گاڑی تک تو ٹھیک ہے کہ ہماری ہی بیٹی کے کام کی چیزیں ہیں۔ مگر بینک بیلنس' بزنس کے نام پر پیسہ' وہ اسے دینا عقل مندی نہیں ہے نواز! پتا نہیں' تمہاری ساری کاروباری چالاکیاں اور تجربہ کہاں چلا گیا ہے تم بے سوچے سمجھے کاشف کو اتنا نواز رہے ہو۔" سارا جب لتاڑنے پر آتی تھی تو یونہی سانس لیے بنا اسے کھری کھری سناتی تھی۔

"میں تو محض اپنی عزت کے لیے ہی یہ سب کر رہا تھا تاکہ لوگ مجھے یہ نہ کہیں کہ۔"

"کیوں لوگ اندھے ہیں یا خلا سے آئے ہیں۔ جو یہ بات کریں گے۔ اس شہر کا ہر بندہ جانتا ہے کہ کاشف تمہارے آفس کا معمولی کلرک ہے۔ بھلے' تم اسے ارب پتی بنا دو۔ مگر اس کا عہدہ اور اوقات نہیں بدلے گی۔" سارا نے اس کی بات کاٹ کر اسے سچائی بتائی تھی۔ نواز کا سر جھک گیا۔

"نواز اکرم! عقل کرو جب تک وہ لڑکا تمہارا محتاج ہے۔ تمہارے کام کا ہے۔ جس دن تم سے غرض کا یہ رشتہ ختم ہو گیا۔ اسی دن وہ اڑ جائے گا بھلے تم سونے کا پنجرہ بنواؤ یا چاندی کا۔ سمجھے۔" وہ اب اپنے ہاتھوں پر لوشن مل رہی تھی۔ نواز کی نظر بے ساختہ اس کے سفید دمکتے ہاتھوں پر گئی تھی۔

"کتنے خوب صورت ہاتھ ہیں سارا کے۔" اس نے بے ساختہ سوچا تھا' پل بھر کو وہ ماہین اور کاشف والا معاملہ بھی بھول گیا تھا۔

"مسز واسطی کا فون آیا تھا کہہ رہی تھیں۔ پہلے ماہین کی رخصتی ہو گی' اگلے روز میرب کی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا "الگ الگ..... مگر دونوں کی ایک ساتھ۔"

"ناممکن' کہاں آیان' کہاں کاشف۔ بات تو ان کی ٹھیک ہے نا۔ انہوں نے بہت سے ایم این ایز اور میسرز' ممبرز اسمبلی انوائیٹ کیے ہیں۔ بزنس کمیونٹی کے ہیڈز' شہر کی کریم ہو گی اور ان کے ساتھ وہ اقبال گجر کے نشئی اور نکمے' تھرڈ کلاس گلی محلے کے آوارہ دوست

کیا جوڑ ہے نواز! میں نے تو عالیہ واسطی کو ہاں کہہ دی ہے۔"

وہ اپنی پنک نائٹی کا کھلا گلا درست کر رہی تھی۔ سفید صراحی دار گردن اور اس سے نیچے دمکتا جسم۔

"کیوں ٹھیک کیا نا میں نے....؟" اس نے بڑی ادا سے نائٹی کے گلابی ریشمی ربن کو اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور نواز سے چند فٹ کے فاصلے پر آبیٹھی۔

"ہاں.... ہاں ٹھیک ہے۔ تم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔" وہ تو سارا کے سامنے انکار کی جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا اور جو سارا حکم دے دے تو پتھر پر لکیر بن جاتا تھا۔ ابھی بھی اس نے اطلاع نہیں دی تھی۔ اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اس کے فیصلے کے سامنے انکار کی مجال نواز میں کہاں تھی۔ خاموشی سے سر جھکا لیا تھا اور سارا نے کسی ملکہ کی طرح اپنی لمبی حسین گردن اکڑا کر فاتحانہ نظروں سے نواز کو دیکھا۔ ایک مغرور اور فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آئندہ یہ میرے آفس نہ آئے۔ اس نے مسٹر نواز سے دس ہزار لیے ہیں۔ مزید ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ لالچی انسان۔"

وہ غصے سے لال پیلا زور زور سے بولتے ہوئے اسے بالکل اقبال کی طرح لگا تھا۔ وہ بھی تو غصے میں ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ چکراتا تھا اور زور زور سے بولتا رہتا تھا۔

"میں نے اسے نہیں بھیجا تھا۔" اس نے دکھ سے اسے ٹوکا۔

"اگر تم نہ بتاتیں تو کیا فرشتے اسے اطلاع دیتے؟ میرے منع کرنے کے باوجود تم نے اسے یہ سب بتا دیا۔ پھر کہتی ہو میں بولوں بھی نہیں کس منہ سے بلاتی ہو مجھے۔ زندگی میں پہلی بار میں دل سے خوش ہو رہا تھا۔ مگر اقبال نے میری ساری خوشی ملیامیٹ کر دی ہے۔ تمہاری وجہ سے اماں! صرف تمہاری وجہ سے۔" وہ غصے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ فاخرہ اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

"میں جانتی تھی یہ تو ہونا ہی تھا۔ کیا کروں نہ اقبال میرے کہنے میں ہے اور نہ ہی یہ کاشف۔ فرق کیا ہے دونوں میں، دونوں مرد ہیں اور عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالنے کے چکروں میں ہیں۔ اقبال برا مرد تھا اور ہے۔ جبکہ میرا بیٹا بھی اب برے مردوں کی صف میں آکھڑا ہوا ہے۔ اس بے چاری لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا چاہتا ہے اور رانی بھی اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ یا اللہ رحم کرنا۔ ان لوگوں کی آنکھوں پر دولت نے پٹی باندھ دی ہے۔ لالچ، ہوس اور حرص کے غلام۔ ماں کو کہتا ہے میرا قصور کیا ہے۔ ایک عورت کو دھوکا دے رہا ہے محبت کے نام پر اور پھر بھی معصوم بننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

فاخرہ جلتی کڑھتی کاشف کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جبکہ دوسری جانب کاشف یہاں سے نکل کر سیدھا رانی کے گھر پہنچا تھا۔ اس کا ابا گھر نہیں تھا۔ ورنہ وہ پھر کاشف کے پیچھے پڑ جاتا کہ شادی کرو۔

کاشف نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس کی خالہ، رانی کی ماں صحن میں بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی تھی۔ کاشف کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اندر سے رانی بھی نکل آئی تھی۔ اسے دیکھ کر بڑی ادا سے مسکرائی۔

"جا رانی! اچھی سی چائے بنا کر لے آ۔ کتنے دن کے بعد تو کاشف بابو آیا ہے۔"

اس کی ماں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب کاشف بابو بن گیا ہے۔ اسکوٹر پر نہیں گاڑی میں آتا ہے۔ اس کی بیٹی کو بھاری سونے کے زیورات، تحائف، کپڑے لے کر دیتا ہے۔ یہی اس کی خالہ تھی اپنی بیٹی کی خوب صورتی پر اتراتی تھی اور اس کی آمد پر ناک بھوں چڑھاتی تھی۔

"تم چائے پیو۔ میں بھنڈیاں چڑھا دوں۔" وہ اب انہیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی دینے لگی تھی اور اس موقع میں رانی اسے اپنی ادائیں دکھاتی تھی اور دونوں مل کر زیادہ سے زیادہ نواز اکرم سے دولت سمیٹنے کی پلاننگ کرتے تھے۔

"اماں نے اقبال کو سیٹھ نواز کے متعلق بتا دیا ہے۔ وہ الو کا پٹھا وہاں آگیا تھا۔" اس نے غصے سے اسے اطلاع دی۔

"کہاں؟" رانی حیرت سے اچھلی۔

"میرے دفتر، نواز اکرم کے پاس۔ دس ہزار لے آیا ہے وہ۔"

"ہائے اللہ اس جیسے لالچی اور بلیک میلر نے پہلی قسط وصول بھی کر لی۔ خدا خیر کرے۔ وہ تو نواز کو سیٹھ نواز سے نواز فقیر بنا دے گا۔ کاشی! اس کا علاج کرو ورنہ یہ ہمارے حصے پر بھی قبضہ جما لے گا۔"

"جانتا ہوں۔ بہت گھٹیا ہے۔ لالچی ہے۔ مگر اتنی آسانی سے اس کھیر میں سے اسے کچھ نہیں دوں گا۔ قتل کر دوں گا کمینے کو۔" کاشی نے نفرت سے مکا تانا۔

"ہائے اللہ نہ کرے اس گنہگار کے قتل میں تم کیوں پھانسی لگو گے۔ ذرا ٹھنڈا رکھو دماغ۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"یہی تو فکر ہے۔ مجھے شادی میں چھ دن رہ گئے ہیں صرف چھ دن اور یہ نیا تماشا شروع ہو گیا ہے۔"

"تو فکر نہ کر۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ ویسے ایک ترکیب میں نے سوچی ہے۔ اگر تو نواز اکرم کو اس کی اصلیت بتا دے تو وہ۔"

"ناممکن۔ تو اس کالے بھجنے سیٹھ کو نہیں جانتی ہے۔ وہ اس بات کو بنیاد بنا کر کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے اور شادی تک۔"

"بڑا شوق ہے تجھے شادی کا۔ اس کالی بھینس سے۔" رانی نے تڑخ کر اسے ٹوکا تھا۔

"اوہو، تم کیوں جلتی ہو اس سے میں نے کہا بھی ہے۔ وہ تو تیری جوتی کے برابر۔" اسی پل موبائل کی تیز دھن نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی تھی۔ اس نے نمبر دیکھا پھر رانی پر نظر ڈالی۔ وہ اسے ہی گھور رہی تھی۔

"کس کا ہے؟" اس نے شکی نظروں سے سوال کیا۔

"ایک دوست کا۔ اس کے پاس مجھے جانا تھا۔ مگر تیرے ساتھ باتوں میں لگ کر بھول گیا۔ اسی لیے وہ مس کال دے رہا ہے۔ میں چلتا ہوں۔"

"اچانک۔ یہ چائے تو۔"

"تو پی لے میری جگہ۔" اس نے بائیں آنکھ دبا کر اسے مسکرا کر کہا اور باہر نکل گیا۔

"کمینہ....." وہ سرخ چہرہ لیے زیر لب اسے گالی دیتی چائے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔

کاشف نے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھتے ہی ماہین کو واپس کال کی۔ رانی کے سامنے تو وہ اس سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ بار بار کال کیوں کر رہی تھی۔ یہ بھی کاشف کو معلوم تھا۔

"ہیلو....." اس کے ہیلو کہنے کی دیر تھی۔

"ہیلو کاشف! کہاں ہو بھئی۔ کب سے کال کر رہی ہوں تمہیں۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"ہاں میں.... میں ایک دوست کے گھر آیا ہوا ہوں۔ خیریت.....!"

"خیریت، تم اچانک یوں ناراض ہو کر اٹھ کر کیوں چلے گئے تھے۔ اپنے کپڑے بھی لے کر نہیں گئے۔ میری شاپنگ بھی تمہیں دیکھی۔ مجھے تو ابھی تم سے ڈھیروں باتیں کرنا تھیں۔ تمہیں ہوا کیا تھا، میری کوئی بات تمہیں بری لگی تھی۔"

"بری؟" یکدم اس کی نظریں اپنے ہاتھوں کی جانب اٹھی تھیں۔ سیاہ دھبوں کی صورت میں دو ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔

موبائل اس کے قدموں میں بریک کے قریب جا گرا تھا۔ اس میں سے ماہین کی آواز آرہی تھی۔ وہ متواتر ہیلو، ہیلو کر رہی تھی۔ مگر کاشف خوف زدہ نظروں سے موبائل کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ابھی وہ سیاہ دھبے اس کے اندر سے نکل کر اسے چمٹ جائیں گے۔ موبائل ساکت ہو گیا تھا۔ اب ماہین کی آواز نہیں آرہی تھی مگر وہ ہنوز گم صم پتھرایا ہوا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آمنہ ریاض

# ستارۂ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خونِ جگر سے سونا اُگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربعہ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ، اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دُعا بن چکا ہے۔ اس کی دُعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دُنیا آباد رکھتا ہے، ہر دم اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بی بی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی، شیزوفرینہ کی مریض ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتلائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبیعتاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان تھے۔ جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پھوپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیرہ اور نمرہ، تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ، تنوی کا منگیتر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً ماوی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر جب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا۔ اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبہ دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے.... ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروس کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو یہ بات جنت بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۴

## چوبیسویں قسط



یہ عالم استعجاب تھا یا مقام آگہی؟
وہ سمجھ نہ سکی، بس چپ چاپ دیکھا کی۔
ہوتا یہ ہے کہ دل ایک ہوتا ہے، لیکن اس دل کے سو تقاضے ہوتے ہیں۔ اول الذکر اپنا آپ تسلیم کیے جانے کی شدید ترین خواہش اور وقت سے پہلے سر اٹھانے والی ہر خواہش آتش فشاں کا ایسا دہانہ جس میں سے کسی بھی وقت لاوا بہہ نکلنے کا خدشہ ہر وقت لاحق رہے۔
فاروق نے تو اس کو سرسری ہی دیکھا تھا۔
ایسے جیسے سر راہ کسی پر نظر پڑ جائے۔
لاشعور کے کسی کونے میں پہچان کی کرن چمکے تو انسان دوسری نظر ڈال لیتا ہے تو فاروق نے بھی اس پر ایسی ہی نظر ڈالی تھی۔
لیکن یہ ایک نظر جنت کے لیے نئی کائنات کے انکشاف کا ادراک ثابت ہوئی۔
وہ کائنات جہاں طرز زندگی الگ ہوتا ہے۔
اس کائنات کے رسم و رواج، رکھ رکھاؤ، تہذیب و تمدن کا اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔
لیکن جنت اس کائنات کے اسرار و رموز سے واقف نہیں تھی۔
وہ الجھ گئی، اس پراسراریت میں گم ہونے لگی کہ بہرحال اس کائنات کے اسرار میں کشش بہت تھی۔ نہ صرف کشش بلکہ ایک پرلطف سی مٹھاس تھی سو وہ کھنچتی چلی گئی، آنکھیں بند کر کے اس کائنات کی سحر انگیزی میں گم ہونے لگی۔
اس کے پاس ایک باپ تھا، جس نے بے تحاشا محبت دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں، سوتیلی ماں تھی جس نے خود کو اور اپنی اولاد کو اس کے عتاب سے بچانے کے لیے چاپلوسی کی راہ اختیار کی تھی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی اور سکون سے رہتی۔ جنت کی غلطیوں پر اس نے آنکھیں بند رکھنا سیکھ لیا تھا۔ باقی بچیں سہیلیاں.... تو مطلبی، خود غرض سہیلیاں بھی آج تک کسی کے کام آئی ہیں؟
کون تھا اس کے پاس جو بتاتا کہ اس ایک نظر کے طلسم کے ہاتھوں خوار نہ ہونا، محتاط رہنا، یہ پراسرار کائنات جسے تم جیسی ناسمجھ کم فہم لڑکیاں کسی نو دریافت شدہ سیارے کی طرح خود پر منکشف ہونے دیتی ہیں، صدیوں سے پنپ رہی دلدل بھی ہو سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"شکریہ جلال بیٹے! آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے کتنی بڑی فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ ماوی کی خوشی میرے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ آپ کے اس فیصلے سے میں بے حد خوش ہوں، سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔" ثمینہ احساس تشکر سے بھرپور لہجے میں کہہ رہی تھیں۔
جلال کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں جھجک آمیز مسرت، ثمینہ کی بات سن کر وہ فطری سی گھبراہٹ کا شکار ہو گیا۔
"پلیز ثمینہ آنٹی! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔" اس نے جلدی سے کہا، پھر گلاس میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں آپ کو بتانے آیا تھا، آج حویلی جا رہا ہوں، اپنے بزرگوں سے بات کر کے جلد ہی آپ کو انفارم کر دوں گا۔"
"میں انتظار کروں گی۔ تمہاری اور ماوی کی منگنی ہو جائے تو سکون سے ڈبلن واپس چلی جاؤں گی۔"
ثمینہ نے شہد ٹپکاتے لہجے میں کہا۔ جلال جس طرح مسکراتا ہوا آیا تھا ویسے ہی رخصت ہوا یوں بھی آج کل

جس نئے جذبے نے اس کے دل میں ہلچل مچار کھی تھی اس جذبے کے ساتھ لبوں پر بات بے بات مسکراہٹ کھیلنا کچھ ایسا حیران کن عمل نہیں ہے۔

جلال کے جانے کے بعد ثمینہ صوفے پر بیٹھ گئیں اور اس ساری صورت حال پر غور کرنے لگیں جو انہوں نے بڑی محنت سے ترتیب دی تھی۔ انہیں اپنی کامیابی کا پہلے بھی یقین تھا' جلال کی جانب سے مثبت جواب ملتے ہی یہ یقین کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ لیکن ابھی بھی کوئی سوچ تھی جو انہیں لاحق تھی' دراصل ہر امکان اپنے ساتھ ایک اندیشہ ضرور لاتا ہے۔

اور یہ ہی اندیشہ ثمینہ کی فکر مندی کا سبب تھا۔ وہ جانتی تھیں جلال کو اس راہ پر لانا ہرگز مشکل نہ ہوگا' اصل مسئلہ ماوی کا تھا جو ماضی کے حقائق سے لاعلم' بے فکری کی زندگی گزار رہی تھی۔

یکایک ثمینہ کے سامنے کئی ایک سوالیہ نشان منہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ماوی راضی ہو جائے گی۔"

"راضی ہونا تو بڑے دور کی بات ہے' کیا وہ میری بات کا اعتبار بھی کرے گی؟"

"ہاں ضرور... کیوں نہیں؟ ماں ہوں میں اس کی' میری بات پر اعتبار نہ کرے گی تو کس کی بات پر کرے گی؟"

وہ خود ہی سوچتی اور اپنے ہر سوال کا جواب دیتی رہیں یہاں تک کہ باہر آسمان پر تیزی سے بادل پھیل گئے اور پورا دن تاریکی میں ڈوب گیا۔

دین محمد ششدر سا اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو جنت کے ہاتھوں پٹتا دیکھ رہا تھا' وہ اس قدر حیران پریشان ہوا تھا کہ آگے بڑھ کر بچی کو بچا بھی نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بچی کو اچھی طرح جھنجھوڑنے کے بعد جنت اسے صحن میں پھینک کر اندر چلی گئی۔ بڑی دیر سے خاموشی سے ایک طرف کھڑی بشریٰ نے آگے بڑھ کر بچی کو اٹھایا اور سہلاتے ہوئے اسے کمرے میں لے آئی۔

"آپ کب آئے؟" کمرے میں دین محمد کو دروازے کے قریب کھڑا دیکھ کر بشریٰ بُری طرح چونکی۔ دین محمد آج طبیعت خرابی کی وجہ سے اپنے مقررہ وقت سے پہلے گھر آ گیا تھا' لیکن جنت اور بشریٰ دونوں ہی اس بات سے ناواقف تھیں۔

دین محمد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر بچی کو اپنی آغوش میں لے لیا' بچی کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور پے در پے پڑنے والے تھپڑوں سے لال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی اور دین محمد کے کندھے سے لگ کر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔

"جنت اسے اتنی بری طرح کیوں مار رہی تھی؟" دین محمد نے پوچھا' بشریٰ خاموش رہی' لیکن اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جو دین محمد کو نظریں چرانے پر مجبور کر سکتا تھا۔

"اس نے جنت کی پلیٹ سے بوٹی اٹھالی تھی اور ہاتھ مار کر شوربا گرا دیا تھا۔"

بشریٰ نے بالآخر زبان کھولی۔

"دین محمد اور حیران ہوا' کیا بوٹیاں ختم ہو گئی تھیں؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"



"اسے اچھا نہیں لگتا' کوئی اس کی پلیٹ میں سے کھائے۔"

"یہ تو بہت چھوٹی بات ہے۔"

"شوربا گرنے سے اس کے کپڑے بھی خراب ہو گئے تھے۔"

"چھوٹی عقل کی عورت! یہ کوئی ایسی بات ہے کہ بچی کو اس بے دردی سے مارا پیٹا جاتا۔" دین محمد نے یک دم بھڑک کر کہا' لیکن اگلے ہی پل اسے احساس ہوا کہ اس کے اشتعال کی حق دار جنت ہے' بشریٰ نہیں' لیکن جنت پہ وہ غصہ کیسے کر سکتا تھا۔ وہ تو اس کی لاڈلی نازوں پلی اولاد تھی۔

"تو وہاں کھڑی اپنی اولاد کو پٹتا دیکھتی رہی۔ آگے ہو کر روک نہیں سکتی تھی اسے؟"

"میں کیسے روکتی۔" بشریٰ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جنت کا ہاتھ پکڑ لیتی۔" دین محمد نے کہا۔

"جنت کا ہاتھ پکڑ لیتی تاکہ آپ کے گھر آنے پر وہ آپ سے شکایت لگاتی اور پھر آپ مجھے مارتے۔"

دین محمد چپ کا چپ رہ گیا' بشریٰ نے جیسے اس کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا تھا۔

"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں جی! کہ میں نے جنت کو کیوں نہیں روکا۔ آپ بھی تو یہاں کھڑے دیکھتے رہے۔ آپ نے اسے کیوں نہیں روکا؟" بشریٰ نے بچی کو دین محمد سے لے لیا۔

"آپ فکر مند نہ ہوں۔ آپ نے آج پہلی بار جنت کے ہاتھوں اسے پٹتے دیکھا ہے۔ اس لیے پریشان ہو گئے ہیں' میں تو ہر دوسرے دن دیکھتی ہوں۔ اپنی بیٹیوں کو ڈھور ڈنگروں سے بھی زیادہ بے دردی سے مار کھاتے دیکھنے کی مجھے عادت ہو گئی ہے' آپ کو بھی ہو جائے گی۔"

بشریٰ نے جیسے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا۔

دین محمد وہیں کھڑا عالم پشیمانی میں گھر گیا۔ بشریٰ نے کئی مرتبہ اسے جنت کے ناروا سلوک کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی' لیکن ہر بار دین محمد نے جنت کی طرف داری کی تھی' کیونکہ اسے کبھی لگا ہی نہیں کہ جنت بھی کچھ غلط کر سکتی ہے۔

لیکن ہاں جنت کی پیدائش کے بعد پہلی مرتبہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے جنت کی تربیت میں کچھ نہ کچھ کوتاہی ضرور سرزد ہو گئی ہے۔ دین محمد گاؤں کے معززین میں شمار ہوتا تھا' کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی بیٹی کے متعلق اس کے منہ پر کچھ کہہ سکے' لیکن بہرحال اس نے بھی کچھ چہ میگوئیاں سن ہی لی تھیں۔ وہ ان چہ میگوئیوں پر ہرگز کان نہ دھرتا۔ بشرطیکہ فاروق اور جنت کو سرِ راہ بات کرتے ہوئے نہ دیکھ چکا ہوتا۔ اس کا دل چاہا تھا فاروق کا منہ توڑ دے' لیکن اس سے بھی زیادہ صدمہ اسے جنت کی روش پر پہنچا تھا۔

وہ جنت کو بشریٰ سے زبان چلاتے دیکھ چکا تھا' چھوٹی بہنوں کو مارتے پیٹتے دیکھ چکا تھا اور اس کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی ہے۔ اس نے تو جنت کو اتنی محبت دی تھی کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کو نہ دیتا ہوگا۔ کیا محبت بھی کسی کو بگاڑ سکتی ہے؟

"ثروت!" ائیر پیس میں آواز ابھری تھی۔ آواز تھی کہ مسرت کا سندیسہ۔ ثروت کے رگ و پے میں ایک سرخوشی سی دوڑ گئی۔

"دانیال! آپ۔" انہوں نے کہا تو فقط اتنا کہ بلیوں اچھلتے دل نے الفاظ ہی گم کر دیے تھے۔

وہ کم عمر لڑکیوں یا جذباتیت کے ہاتھوں بے حال عورتوں کی طرح خفا ہو کر نہیں نکلی تھیں۔ بڑی سوچ بچار کے

بعد اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ انہیں وہاں سے ہٹ جانا چاہیے، ممکن ہے ان کی غیر موجودگی دانیال کو ان کے رویے کی بدصورتی کا احساس دلا دے۔ اتنا عرصہ بے زبان بن کر گزار دیا، پہلی بار اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تھی تو بھی خدشات ساتھ ساتھ تھے، گو کہ عقل ان کا شانہ تھپکتی تھی۔

جس مرد کے لیے عورت نے اپنی زندگی نثار کی ہو، اپنی وفائیں، اپنا اخلاص جس کے نام لکھا ہو، جس کے بچوں کی پرورش کے لیے اپنے دن رات قربان کیے ہوں، وہ ہی مرد، عورت کو ساری زندگی شک کی مار مارتا رہے، کہاں کا انصاف ہے؟

وہ آتو گئی تھیں، لیکن دل و جان سے دانیال کی محض ایک پکار کی منتظر تھیں۔ فیصلہ تو کر ہی چکی تھیں کہ وہ ایک بار پکار لیں تو جھکنے میں لمحہ بھی نہیں لگائیں گی اور شکر ہے انہوں نے پہل کر بھی لی تھی۔ لیکن دانیال کے اگلے جملے نے جیسے سارے جوش و مسرت پر ٹھنڈا پانی انڈیل دیا۔

"الماری کی چابیاں کہاں رکھی ہیں؟" وہ بھی انا پرست تھے۔ ارادہ کچھ تھا لبوں سے کچھ ادا ہوا۔ جھکنا تو ان کی بھی فطرت میں نہیں تھا، کچھ ضد بھی زور پکڑ چکی تھی۔

"اوہ۔۔۔" ثروت کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ گہری سانس بھر کر بولیں۔

"میرے پرس میں رکھی رہتی تھیں ہمیشہ سے۔ آتے ہوئے نکال کر آنا یاد ہی نہیں رہا۔"

"انسان میں اتنی عقل ہونا چاہیے، لیکن خیر عقل کا جذباتیت سے کیا تعلق؟" طنزیہ سلگاتا ہوا لہجہ۔

ثروت کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"جذباتیت انسان کے پاس سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رہنے ہی کہاں دیتی ہے۔" دانیال حسن نے مزید کہا۔

"غالباً" آپ شک کہنا چاہ رہے ہیں۔" ثروت نے بھی حساب برابر کرنے کی ٹھانی۔ لیکن اس بار دانیال حسن کا دماغ بھک سے اڑ گیا، یوں بھی ان کے سرد مہری میں ڈوبے ہوئے طنز اس وقت تک کاری ثابت ہوتے تھے، جب تک ثروت زبان بندی کے فیصلے پر عمل در آمد کر تیں۔

"کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے، تب ہی شک زور پکڑتا ہے۔" انہوں نے سلگ کر کہا۔

"جی نہیں۔۔۔ کچھ لوگوں کو ہوا میں تیر چلانے کا بھی شوق ہوتا ہے۔۔۔ لیکن آپ نہیں سمجھ سکتے۔"

"چابیاں؟

"میں کل ہی ڈاک کے ذریعے بھجوا دوں گی۔" ثروت نے ان سے زیادہ سرعت سے کہا۔

"بہتر۔۔۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم نے احتیاط سے کام لیا ہوتا تو مجھے فون کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔"

"اف۔" ثروت کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

"بچے کیسے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"خوش و خرم۔ انہیں اس گھر میں کس چیز کی کمی ہے کہ کسی اور کے در پر جا بیٹھیں۔" ایک اور وار۔۔۔ ثروت نے تحمل سے سہا۔

"میرا دوست فرمان قریشی تو تمہیں یاد ہو گا؟ اس کا بیٹا میڈیکل میں ہے، میں کل اس کی تصویر تمہیں ای میل کر دوں گا، اپنی رائے سے آگاہ کر دینا۔ میرا خیال ہے انبیا کے لیے وہ بہترین شریک حیات ثابت ہو گا۔" کھٹاک کی آواز کے ساتھ فون بند ہو گیا۔

ثروت ہکا بکا سی ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہیں، ان کے کانوں میں اپنا ہی جملہ گونج رہا تھا۔

"علیحدگی کا فیصلہ ہو تو میری بیٹی کو اس گھر سے رخصت کر دیجیے گا۔"

"تو۔۔۔ تو کیا فیصلہ ہو چکا؟" ایک ہراس میں گھری ہوئی آواز ان کے دل سے ابھری تھی اور پھر دل کسی اتھاہ میں

ڈوبتا چلا گیا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد دین محمد نے فاروق سے بات کرنے کا ارادہ کیا' بلکہ بات بھی کیا کرنا تھی سیدھے سادے طریقے سے اسے ڈرا دھمکا کر اس گاؤں سے رخصت کرنے کی ٹھانی۔

لیکن فاروق کوئی نو عمر لڑکا نہیں رہ گیا تھا جو ماموں سے چار تھپڑ کھا کر ہراساں ہو جاتا' وہ جوان بھرپور لڑکا تھا' جس کے بازوؤں میں دین محمد سے زیادہ طاقت تھی' پھر وہ محکمہ زراعت کا ملازم تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کوئی اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا تو فاروق اتنی استطاعت رکھتا تھا کہ نہ صرف اسے دھوبی پٹکا دے کر زمین پر گرا دیتا' بلکہ اس کی گردن بھی توڑ دیتا۔

دین محمد کی بات سن کر وہ بری طرح بھڑک گیا۔

"مجھے کچھ کہنے سے بہتر ہے اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔ سو مرتبہ اس سے کہہ چکا ہوں' میرے پاس نہ آیا کرے' مگر اس کی ہڈی میں تو سکون ہی نہیں ہے۔"

"تو الو کے پٹھے' میری بیٹی...." دین محمد اس کی بات پر بری طرح بھڑک گیا۔

"گالی مت دینا ماموں۔" فاروق نے اس سے زیادہ اشتعال انگیز لہجے میں کہا۔ "غیرت مندی صرف تم میں نہیں ہے' میں بھی راجپوتوں کا خون ہوں۔ تمہاری عزت کی پروا نہ ہوتی تو آج تمہاری لاڈلی کے کرتوت سارے گاؤں کو پتا چل چکے ہوتے۔ جتنا تم نے مجھے اور میرے ماں باپ کو ذلیل کیا تھا' میں چاہتا تو بڑے آرام سے تمہاری عزت کا جنازہ نکال کر تمہارے ساتھ حساب برابر کر لیتا' لیکن مجھے صرف اپنی ماں کی پروا ہے' جس کو تم اور تمہاری بیٹی بڑی عزیز ہے اور میں نہیں چاہتا میرے کسی عمل سے میری ماں کو دکھ پہنچے۔

میری مانو ماموں! اپنی اس فتنی کے دو بول پڑھا کر رخصت کر دو' یہ اب تمہارے قابو میں نہیں آنے والی' میں یہاں کب تک ہوں' آج نہیں تو کل میرا تبادلہ کسی اور جگہ ہو جائے گا' لیکن میری جگہ یہاں جو بھی آئے گا' وہ بھی مرد ہی ہو گا اور اتفاق سے اسے تمہاری عزت کی پروا کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی.... ہر کوئی میری طرح نہیں ہو گا' نا کہ پلیٹ میں پیش کی جانے والی شراب کو انکار کر دے۔ اس لیے بہتر ہے سنبھال لو اپنی بیٹی کو۔"

فاروق کی زبان الفاظ نہیں زہر اگل رہی تھی۔

دین محمد اٹھے ہوئے سر اور کندھوں کے ساتھ فاروق سے جواب طلبی کرنے گیا تھا' لیکن واپسی میں اس کا سر اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فاروق کی بات میں سچ اور جھوٹ کا تناسب کتنا تھا' وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ دشمنی کے باوجود فاروق نے اس کی عزت کی پروا کی تھی۔

دین محمد بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ جنت کی جگہ اس کا بیٹا ہوتا تو وہ مار پیٹ کر اسے سمجھا سکتا تھا' لیکن جنت لڑکی تھی اور دین محمد کی بے حد لاڈلی۔ وہ اسے پھولوں کی چھڑی سے بھی چھونے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی غلطیاں تو ہم سب ہی کرتے ہیں' بعض اوقات ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا کوئی مجموعہ ہمارے لیے مشکلات بھی کھڑی کر دیتا ہے' لیکن کچھ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور کوتاہیاں مل کر دلدل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور خود پر پہلا قدم پڑتے ہی انسان کو اپنے اندر کھینچ لیتی ہیں۔

دین محمد کی غلطیاں بھی ایسی ہی دلدل کی صورت اختیار کر چکی تھیں اور دین محمد سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس دلدل میں پیر رکھے بغیر دوسری طرف کس طرح پہنچے۔

بیٹی کی محبت نے بالآخر اسے ایک بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

شبیہہ کمرے میں داخل ہوا تو جلال چھوٹے سے لیدر بیگ میں روزمرہ ضرورت کا سامان رکھ رہا تھا اور کہیں روانگی کی تیاری میں دکھائی دیتا تھا۔

"کدھر کی تیاری ہے جناب؟" اس نے تھکے تھکے انداز میں لیکن خوش گواریت سے پوچھا۔ ابھی کیمپس سے لوٹا تھا اور تکان زدہ دکھائی دیتا تھا۔

"میں گاؤں جا رہا ہوں۔" جلال نے مصروفیت بھرے انداز میں جواب دیا۔

"ایں!" شبیہہ چونکا۔ "یہ اچانک گاؤں جانے کا پلان کیسے بن گیا؟ صبح تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔" اس نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"بس اچانک پلان بنا' سب لوگ بہت یاد آ رہے تھے' سوچا جا کر مل ہی آؤں۔" جلال نے اصل بات گول کرتے ہوئے بہانہ بنایا۔

"تم بھی چلو شبیہہ' پرسوں واپس آ جائیں گے۔" ساتھ ہی اسے بھی آفر کی۔

"نہیں یار! مجھے تو کل تک ہر حال میں اپنا پروجیکٹ سبمٹ کروانا ہے۔" شبیہہ نے معذوری ظاہر کی۔ "تم یوں کرو' تم بھی رک جاؤ' کل اکٹھے گاؤں کے لیے نکلیں گے' ویسے بھی آج موسم بہت خراب ہے' میرا نہیں خیال ایسے موسم میں تمہیں ڈرائیونگ کا رسک لینا چاہیے۔"

وہ شورہ مار کر تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا۔

"کیا بات ہے' بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟" جلال نے بات ٹالتے ہوئے پوچھا۔ شبیہہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی آنکھوں کو انگلیوں سے مسلنا شروع کر دیا تھا۔

"شبیہہ! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" جلال نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہوں.... ہاں۔" شبیہہ نے سابقہ انداز میں کہا' پھر دل ہی دل میں کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اسے پوچھنے لگا۔

"جلال! آج صبح تم پارک گئے تھے؟"

"ہاں.... میں تو روز جاتا ہوں۔" جلال نے جلدی سے کہا' ساتھ اس کے چہرے پر موجود کشمکش بھانپ کر بولا۔

"بات کیا ہے شبیہہ؟"

"میں نے کئی روز سے انہیں نہیں دیکھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو۔"

"تمہاری ثروت آنٹی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ امی' ممی یا ماں ٹائپ الفاظ تو وہ ان کے لیے کبھی بولتا ہی نہیں تھا' اب ان کے لیے کوئی جذبہ دل میں ابھر تو رہا تھا' لیکن اس جذبے کو بھی کوئی واضح نام دینے سے وہ قاصر تھا۔

جلال نے بغور اسے دیکھا۔

"ہاں.... میں نے بھی کئی روز سے انہیں نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے' وہ پارک آ ہی نہیں رہیں' ورنہ میری ملاقات ضرور ہوتی۔"

شبیہہ نے اس بار کوئی جواب نہ دیا' لیکن اس کے چہرے پر الجھن یا فکر مندی بڑھ گئی تھی۔

"ممکن ہے وہ بیمار ہوں' یا یہاں موجود ہی نہ ہوں' ورنہ جب سے میں یہاں آیا ہوں' ایک بھی دن میں نے انہیں غیر حاضر نہیں پایا۔" جلال نے کہا۔

"اگر تم کہو تو میں ان کے گھر جا کر ان کی خیریت معلوم کر لیتا ہوں۔"

"ارے نہیں' اب اتنی بھی امپورٹنٹ نہیں ہیں وہ۔" اس کی سخت مزاجی عود کر آئی۔ جلال کو اکتاہٹ سی محسوس ہوئی۔

"خیر امپورٹنٹ تو وہ ہیں' نہ ہوتیں تو تم ان کے لیے فکر مند نہ ہوتے۔"

"آتے جاتے ہر دوسرے تیسرے نظر آ ہی جاتی تھیں۔ آنکھوں کو عادت ہو جاتی ہے بھئی' سڑک کنارے درخت لگا ہو تو اس سے بھی آنکھیں مانوس ہو جاتی ہیں۔ ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔" شبیہہ نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"میں ابھی انہیں روز دیکھتا ہوں پارک میں ملاقات ہو جاتی ہے' لیکن میں نے تو ان کی کمی محسوس نہیں کی۔" جلال جرح کرنے لگا۔

شبیہہ نے خاموشی سے منہ پر تکیہ رکھ لیا۔ جلال سمجھ گیا' اب وہ اس موضوع پر کچھ نہ سُنے گا۔ جلال خاموش رہ کر اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ تو خود شبیہہ سے ماوئ کا ذکر کرنا چاہ رہا تھا' لیکن وہ خود الجھا ہوا تھا۔ جلال کی بات میں کہاں دلچسپی لیتا۔ یہ ہی سوچ کر جلال نے اس ذکر کو کسی اور وقت پر ٹال دیا۔ لیکن وہ ماوئ کے متعلق سوچنے لگا' اسے ماوئ کے متعلق سوچنا اچھا لگ رہا تھا' پتا نہیں پھول ملنے پر اس نے کیسا ردِ عمل ظاہر کیا ہو گا؟ کاش! میں اپنے لیے ان تمام جذبوں کے رنگ اس کے چہرے پر دیکھ سکتا جو وہ میرے لیے محسوس کرتی ہے۔

ابھی وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ شبیہہ کی آواز سنائی دی۔

"اور ہاں..... تم اس روز روڈ پر کس لڑکی کے ساتھ تھے؟ میں اسے پہچان گیا ہوں' یہ وہ ہی لڑکی تھی نا' جس نے بے وجہ مجھ سے جھگڑا کیا تھا؟ مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ تمہیں ذرا فرینڈز بناتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے۔ ایسی بدتمیز لڑکیوں سے دوستی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پتا نہیں ایسی منہ پھٹ' بدتمیز لڑکیاں کن احمقوں کو اچھی لگتی ہوں گی۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ جلال سر پکڑ کر بیٹھ گیا' وہ تو شبیہہ کو اپنے اور ماوئ کے بارے میں بتا کر دادی جان کو راضی کروانے کے سلسلے میں پہلا اور سب سے اہم ووٹ اپنے حق میں کروانا چاہ رہا تھا' کہاں یہ صورت حال کہ شبیہہ صاحب اپنی ناپسندیدگی جتا گئے تھے۔ جلال کو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت تیز بارش تھی۔ بادل گرجتے تو لگتا اللہ کا قہر نازل ہو رہا ہے۔ بجلی کڑکتی تو تیز روشنی آنکھیں چندھیانے لگتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا درمیان میں حائل شیشہ توڑ کر اندر گھس آئے گی۔

کیسا غضب کا طوفان تھا۔ ہوا در و دیوار سے ٹکراتی پھرتی تھی۔

ثمینہ کب سے چپ چاپ کھڑی شیشے کے اس طرف تباہی مچاتے طوفان کو دیکھ رہی تھیں۔

باہر اگر اتھل پتھل تھی تو اندر! ایک سکوت کا عالم تھا جیسے سمندر پر رات پھیل رہی ہو ایسا سناٹا جو وحشت میں مبتلا کر دے۔

ماوئ نے کئی بار دیکھا۔ ثمینہ گم صم سی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں۔ وہ ہر بار مخاطب کرنے کا ارادہ کرتی پھر ٹال دیتی خدا معلوم۔ کس گہری سوچ میں مبتلا تھیں۔ وہ خود ٹی وی کے سامنے ڈٹی بیٹھی تھی۔ ایک بڑا سا پیالہ گود میں دبوچ رکھا تھا دوسرے ہاتھ میں لکڑی کا چمچہ جس کے ساتھ باؤل میں چینی اور مکھن کا آمیزہ پھینٹا جا رہا تھا۔ دونوں ہی کاموں میں انہماک قابلِ دید تھا۔



بالآخر اس خاموشی کو ثمینہ نے ہی توڑا۔

"کیا کر رہی ہو ماوئ! آؤ باتیں کریں۔"

"ایں..... " ماوئ نے چونک کر کہا۔ "ہاں..... باتیں تو مجھے بھی آپ سے کرنی ہیں لیکن پہلے ذرا یہ کوکیز بیک ہونے رکھ دوں؟"

"کوکیز میری بات سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔" ثمینہ نے آہستگی سے کہا۔

"جب میں کافی کے ساتھ کوکیز آپ کی خدمت میں پیش کروں گی تو آپ کو باتیں کرنے کا مزہ آ جائے گا۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"ویسے بھی میں آج آپ سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے۔ تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟" ثمینہ نے کہا۔

"کیا؟"

"تم زرین کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہو ناں؟"

"زرین کون؟"

"تمہاری پھپھی جان۔"

"ارے ہاں..... " ماوئ بُری طرح چونکی اور آنکھیں متاثر کن انداز میں پھیلا کر پوچھنے لگی۔ "لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں ان کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ ہائے گاڈ ممی! کیا آپ کے پاس موکل ہیں' جو آپ کو ہر خبر دے دیتے ہیں۔"

ثمینہ اس کی بات پر آہستگی سے ہنسیں۔

"نہیں موکل نہیں ہیں میرے پاس۔"

"پھر جو میں سوچ رہی ہوتی ہوں یا جو بات میرے دل میں ہوتی ہے' اس کا آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے؟" اس نے الجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

"کیونکہ میں تمہاری ماں ہوں اور ماؤں کو سب پتا ہوتا ہے۔" ثمینہ نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"اچھا..... " ماوئ نے ابرو اچکا کر پل بھر کو سوچا۔

"پھر آپ مجھے پھپھو کے بارے میں بتائیں گی ناں؟"

"ہاں..... بتاؤں گی' آج تو سب کچھ بتاؤں گی۔" ثمینہ نے خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے کھڑکی کی طرف رخ موڑا۔

"چلیں ٹھیک ہے میں بس بیس منٹ میں اپنا کام سمیٹ کر آتی ہوں۔" وہ پھرتی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

ثمینہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہیں جہاں بارش مزید تیز ہو گئی تھی اور موٹی موٹی بوندیں زور زور سے بند شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اللہ جانے کون سا طوفان زیادہ شدید تھا' وہ' جو کھڑکی سے باہر تباہی مچا رہا تھا یا وہ' جو ثمینہ کی ذات کو اتھل پتھل کیے دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بھائی دین محمد! پریشان لگ رہے ہو۔"

دین محمد نے چونک کر حسین احمد کو دیکھا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر فکر مندی سے دین محمد کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ پریشان تو نہیں ہوں بس سوچ رہا تھا اس کا مول اچھا لگ جائے تو اگلی بیائی کے لیے سہولت رہے گی۔" دین محمد نے مہارت سے بہانہ بناتے ہوئے کہا اور رغبت سے کھانا کھانے لگا۔

وہ اپنی کپاس کی ضرورت کے سلسلے میں قریبی قصبہ کی منڈی میں آیا ہوا تھا' یہیں اس کی ملاقات اپنے بے حد عزیز لیکن کئی سال پہلے بچھڑے ہوئے دوست حسین احمد سے ہوگئی۔ حسین احمد اور اس کا خاندان کئی سال اسی گاؤں میں رہ چکے تھے جس گاؤں سے دین محمد کا تعلق تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت دین محمد ایک معمولی درجہ کا زمین دار تھا لیکن اب اس کی حیثیت میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا جنت کی پیدائش کے چند مہینے بعد حسین احمد نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں چھوڑ دیا تھا' حسین احمد شہر میں جا بسا تھا۔ ان دونوں نے اتنے طویل عرصہ بعد کی ملاقات میں خوب باتیں کی تھیں۔ از سر نو میل جول بڑھانے کی بات بھی ہوئی۔ حسین احمد نے زہرہ کے انتقال کی خبر سن کر دکھ کا اظہار بھی کیا تھا حسین احمد نے یہ بھی کہا۔

"دوسری شادی کرکے تو نے بڑا اچھا کیا' آخر انسان کب تک اکیلے زندگی گزار سکتا ہے۔ مرد کو بیوی کی ضرورت پڑتی ہی ہے پھر بیٹیوں کی تربیت ماں سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو دین محمد ہرگز اس کی بات نہ مانتا لیکن اب اسے اس بات پر سو فیصد یقین آچکا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ جنت کی طرف سے بہت پریشان ہوتا تو سوچتا شاید اس سے ہی جنت کی تربیت میں کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ اس نے کبھی بشریٰ کو اتنا اختیار دیا ہی نہیں کہ وہ ماں بن کر جنت کو ڈانٹ ڈپٹ لے یا کوئی بات سمجھانے کی کوشش ہی کرے۔

لیکن اب تو پانی سر سے گزر چکا تھا اور بعض اوقات فکر مندی سے اسے رات رات بھر نیند بھی نہ آتی تھی۔

اس کو یاد تھا وہ کئی بار زہرہ کے سامنے اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ وہ جنت کو رخصت نہیں کرے گا بلکہ اس کے لیے کوئی ایسا لڑکا تلاش کرے گا جو گھر داماد بن کر ان کے ساتھ رہے لیکن وقت اور حالات بڑی تیزی سے انسان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کردیتے ہیں۔ دین محمد بھی اب اسی کوشش میں تھا کہ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ ملے وہ جنت کو رخصت کردے کیوں بھی اس کے ساتھ کی بہت سی لڑکیاں بیاہی جاچکی تھیں' صرف دین محمد تھا جس نے جنت کو گھر میں بٹھا کر رکھا ہوا تھا۔

وہ کھانا کھاتے ہوئے ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ حسین احمد نے اس بار تشویش کے عالم میں اس کا کندھا ہلایا۔

"تجھے ہوا کیا ہے دین محمد!"

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں حسین بھائی!" دین محمد نے کہا۔ حسین احمد اس سے عمر میں کئی سال بڑا تھا لیکن دونوں کی دوستی خوب تھی۔

"اچھا اس سے ملو۔ اس کو پہچانتے ہو کہ نہیں؟" حسین احمد نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔ دین محمد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اونچے قد کا اور مضبوط ڈیل ڈول والا تیس بتیس برس کا جوان مسکرا رہا تھا۔

"دلاور حسین۔۔۔" دین محمد نے بے ساختہ کہا اور اس سے بغل گیر ہوگیا۔ "تم بھی کمال کرتے ہو بھائی حسین! کیا اپنے بھتیجے کو بھی نہیں پہچانوں گا۔"

وہ دلاور سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔ پتا چلا وہ فوج میں بھرتی ہوچکا تھا۔ چند سال پہلے شادی بھی کی لیکن بیوی بیٹے کی پیدائش کے وقت فوت ہوچکی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں شادی کرلے لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔ تو ہی سمجھا اسے دین محمد! آخر بیوی کے بغیر گزارا کرنا آسان ہے۔"

دین محمد' دلاور حسین کو کیا سمجھاتا۔ اس کے ذہن میں تو بجلی کی طرح کوندا لپکا تھا۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر دلاور حسین کو دیکھا۔ شکل وصورت "بہترین خاندان' زمین جائیداد کا مالک پھر حکومت کا ملازم۔۔۔ جنت کے ساتھ خوب جچتا' لیکن اگلے ہی پل اس نے اپنے خیال کو رد کر دیا اور دل مسوس کر رہ گیا' جنت اور دلاور کی عمروں کا فرق یاد آگیا تھا پھر دلاور کا بیٹا بھی تھا۔

کچھ چیزیں انسان کو اپنے لیے غلط اور اولاد کے لیے درست لگتی ہیں اور کچھ چیزیں انسان اپنے لیے درست اور اولاد کے لیے غلط قرار دے دیتا ہے یہ طرز عمل صحیح ہے یا نہیں لیکن انسان اکثر ایسا کرتا ہے۔

دین محمد نے دل ہی دل میں دلاور حسین کو جنت کے لیے غیر مناسب قرار دیتے ہوئے اپنی اور بشریٰ کی عمروں کے فرق کو بھلا دیا تھا۔

لونگ واشکارا لونگ واشکارا
مائیں نی مائیں مینوں لونگ گھڑا دے
لونگ گھڑوا دے نگ جڑوا دے
نگ جڑوا دے ایسا۔۔۔۔

ولید کی اونچی اونچی تانیں سارے گھر میں گونج رہی تھیں انبیاء کا بس نہ چلتا تھا' اسے اٹھا کر گھر سے ہی باہر پھینک دے۔ صبح سے ایسے ہی شادی بیاہ کے گیت سنا سنا کر اس کے کان کھا رہا تھا۔

"ولید کے بچے! اب تم خاموش نہ ہوئے تو گلدان اٹھا کر تمہارے سر پر مار دوں گی۔" اس نے کتاب پٹخ کر دھمکایا۔ کل اتنا اہم ٹیسٹ تھا اور یہ لڑکا مستقل اس کے سر پر سوار۔

"اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات ہے؟" ولید نے معصوم سی شکل بنا کر پوچھا۔ "تمہیں یہ گانا پسند نہیں تو کوئی اور سنا دیتا ہوں۔۔۔۔ اچھا وہ گانا کیسا رہے گا۔"

ابھی وہ یہیں تک ہی پہنچا تھا کہ انبیاء چیخ اٹھی۔

"خبردار' خبردار اب ذرا سی بھی آواز نکالی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ غضب خدا کا صبح سے میراثیوں والا دورہ تمہیں پڑا ہوا ہے۔ پتا نہیں یہ سارے زنانہ گیت تم نے کہاں سے یاد کیے ہیں اوپر سے تمہاری آواز۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے درجن بھر کوے ایک ساتھ چیخ رہے ہوں میرے تو کان ہی پک گئے۔ اب میں تمہاری آواز میں مزید کچھ نہیں سن سکتی۔ رحم کرو مجھ پہ۔" آخر میں وہ بالکل ہی روہانسی ہو کر بولی تھی

ولید نے خفگی سے اسے گھورا۔

"ایک تو صرف تمہاری خاطر میں نے اتنے گانے یاد کیے ہیں اس پر سے تم باتیں بھی تم مجھے ہی سنا رہی ہو۔"

"میری خاطر کس خوشی میں؟" انبیاء نے چڑ کر کہا۔ "میں نے تم سے فرمائش کی تھی کیا؟"

"ابھی تک تو نہیں کی لیکن شادی پر تو کرو گی۔۔۔۔ اب تمہاری اونگی بونگی سہیلیاں تو گا نہیں سکتیں۔ کوئی تو ہونا چاہیے جو اچھی آواز میں گا سکے یہی سوچ کر میں نے آج سے پریکٹس شروع کر دی ہے لیکن تمہیں تو قدر ہی نہیں ہے۔" انداز احسان جتانے والا تھا۔

"اس کی فکر تم نہ کرو۔" انبیاء نے رخ اسٹڈی ٹیبل کی جانب موڑتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"میری شادی میں ابھی بہت وقت ہے پھر اور ویسے بھی تم سے تو اسّی فیصد بہتر گا لیں گی میری اونگی بونگی سہیلیاں۔"

"جی نہیں۔۔۔۔ یہ غلط فہمی اپنے دل سے فوراً نکال دو۔" ولید نے کہا۔



"لگتا ہے میری سہیلیوں کی آوازیں سنے بغیر ہی تم حسد میں مبتلا ہو گئے ہو۔" انبیاء نے چڑایا۔

"ارے ان سے حسد کرتی ہے میری جوتی۔۔۔۔ وعدہ رہا اپنی شادی پر اپنی ساری بے سری سہیلیوں کا مجھ اکیلے سے مقابلہ کروا لینا۔ ایک گھنٹہ بھی میرے آگے ٹھہر گئیں ناں تو اپنا نام بدل دوں گا۔" ولید نے جوش سے کہا۔

"اچھا تو پھر؟" انبیاء کو اس کی بات بڑھک سے زیادہ نہ لگی۔

"اپنے دل سے یہ غلط فہمی نکال دو کہ تمہاری شادی میں بہت وقت ہے۔ ڈیڈی تو عنقریب رخصت کرنے کے چکروں میں ہیں۔۔۔۔ لڑکا بھی پسند کر چکے وہ تو۔"

انبیاء دھک سے رہ گئی۔ اس کے ہاتھ سے پین چھوٹ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو ولید!" اس نے سراسیمگی سے ولید کو دیکھا۔

"تمہیں تمہاری شادی کی خوش خبری سنا رہا ہوں۔" ولید نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے خود ڈیڈی کو فون پر کہتے سنا ہے۔"

"یہ خوش خبری ہے؟" انبیاء نے چڑ کر کہا۔

"تو پھر کیا ہے؟"

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی ولید!" اسے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی "اور پھر ڈیڈی' ممی کی غیر موجودگی میں اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔"

"میری مانو۔۔۔ چپ چاپ شادی کر کے اپنی لائف سیٹ کرو۔ لڑکوں کی زندگی تو ماں باپ کی علیحدگی کے بعد بھی ٹھیک رہتی ہے۔ شیبہ العباس بھائی کو ہی دیکھ لو۔۔۔۔ کس بات کی کمی نظر آتی ہے ان کی زندگی میں "میں اور روئی بھی سیٹ ہو ہی جائیں گے اصل مسئلہ تمہارے لیے ہو گا ویسے بھی لڑکیاں ابنارمل ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ابنارمل ری ایکشن دیتی ہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو ولید! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" انبیاء نا سمجھی سے کہا۔

"ڈیڈی اور ممی میں ڈائیورس ہونے والی ہے' اس سے پہلے ہی تمہاری شادی ہو جانا چاہیے۔" بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔

"شٹ اپ ولید! کبھی تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" انبیاء نے غصے سے کہا۔

"غصہ مت کرو الو!" ولید نے تحمل سے کہا۔ "جو بات چند روز بعد تمہیں ممی یا ڈیڈی سے پتا چلنا ہے' وہ میں بتا رہا ہوں تو بھڑک کیوں رہی ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے' ممی یونہی اتنے روز سے نانا جان کے گھر جا کر بیٹھی ہوئی ہیں؟"

انبیاء بے طرح فکر مند ہو گئی ہر امکان سوچ چکی تھی مگر اس نہج تک تو اس نے ہرگز نہ سوچا تھا۔

"ولید! یہ بھی تم نے ڈیڈی کو کہتے سنا ہے یا تمہارا اندازہ ہے؟" یکایک اسے خیال آیا۔

"میری چھٹی حس بتا رہی ہے۔" ولید نے سنجیدگی سے کہا۔

"خدا کرے تمہاری چھٹی حس اس بار غلط اشارہ دے رہی ہو۔" انبیاء نے صدق دل سے کہا۔

"آمین۔" ولید کی آواز دھیمی تھی۔

"میں ممی کو فون کروں؟"

ولید نے کندھے اچکا دیے۔ انبیاء کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا لیکن اگلے ہی پل وہ اٹھی اور اپنے سیل فون پر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

دین محمد' باجی زبیدہ کو دیکھ کر بے حد حیران ہوا۔

پچھلی بار باجی زبیدہ زہرہ کے انتقال پر حویلی آئی تھی اور دین محمد نے اسے بے حد بے عزت کر کے نکال دیا تھا۔

اس قدر تذلیل سہنے کے بعد وہ ایک بار پھر اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حویلی آگئی تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف ماں جائے کی محبت اور جنت تھی۔

یہ بات صرف باجی زبیدہ ہی جانتی تھی کہ اس نے فاروق کو کن دقتوں سے جنت کے ساتھ شادی پر آمادہ کیا ہے۔ لیکن دین محمد اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود اسے دیکھ کر پھر اکڑ گیا اور مصلحت آمیزی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے زبیدہ کو مزید بے عزت کرنے لگا۔

"پاگل پن نہ کر دین محمد! تو نہیں جانتا گھر آئے بر کو ٹھکرا کر تو کیسی بڑی حماقت کر رہا ہے۔" باجی زبیدہ نے اس کی ساری جلی کٹی سننے کے بعد بھی منت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں نے کیا کرنا ہے کیا نہیں...... مجھے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے باجی!" دین محمد نے تڑخ کر کہا۔ "تیرے بیٹے نے میرے منہ پر کالک ملنا تھی سو مل دی۔"

"ارے میرے بیٹے نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ تو اسے الزام دے۔ جنت خود اس سے ملنے جاتی رہی ہے۔" بالآخر باجی زبیدہ کی برداشت بھی جواب دے گئی۔

"بس بس...... میری بیٹی کے بارے میں ایک بھی اور لفظ نہ کہنا۔"

"دیکھا...... اپنی اولاد کے بارے میں کوئی غلط لفظ سننا کتنا برا لگتا ہے۔ پھر بھی میں جب سے آئی ہوں مسلسل فاروق کو کوس رہا ہے اور میں خاموشی سے سن رہی ہوں۔ ایک بار بھی تجھے نہیں ٹوکا...... جانتا ہے کیوں؟ صرف اس لیے تاکہ خاندان کو بدنامی سے بچایا جاسکے۔ فرشتہ تو کوئی بھی نہیں ہوتا کہ غلطی سے دور رہے۔ اب جنت نے جو حماقت کرنا تھی سو کر دی تو تو عقل مندی کا فیصلہ کر...... میں نے فاروق کو راضی کر لیا ہے۔ بس تو بھی مان جا تو میں اگلے سوموار کو جنت کو رخصت کروالوں۔"

لیکن دین محمد نے راضی تو کیا ہونا تھا۔ باجی زبیدہ کو اتنی باتیں سنائیں کہ بیچاری کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہی۔ صرف اسی پر دین محمد نے اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ الزام بھی جڑ دیا کہ وہ اور فاروق دین محمد کی زمینیں ہتھیانے کے لیے یہ سارا کھیل رہے ہیں۔

باجی زبیدہ اپنے بھائی کی عزت بچانے کے خیال سے بڑی آس لے کر اس کے پاس آئی تھی لیکن دین محمد نے اس کے خلوص کی رتی بھر بھی قدر نہ کی۔ جب زبیدہ رخصت ہونے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"صرف تیرے اسی رویے کی وجہ سے میں اپنی مری ہوئی ماں کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکی۔ مجھے ڈر تھا کہ پھر حویلی آنے پر تو مجھے بے عزت کرے گا۔ لیکن اس بار تو میں تیری عزت کو سہارا دینے آئی تھی دین محمد! تو نے پھر بھی میری قدر نہ کی۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں تیری بات مان لیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے فاروق کو شادی کے بعد اسی حویلی میں آکر آباد ہونا پڑے گا۔ میں جنت کو خود سے دور جانے نہیں دوں گا۔" دین محمد نے ٹالا۔

"لو سن لو اماں! جس بھائی کی محبت میں تم دیوانی ہوئی جا رہی ہو۔ وہ تمہارے بیٹے کو سسرال میں کتے کی سی زندگی گزارنے کی ترغیب دے رہا ہے۔" فاروق نے استہزائیہ انداز میں پہلی بار زبان کھولی۔

"چلو یہاں سے اماں! ماموں نے ساری زندگی بیٹی کو گھر بٹھانا ہے۔ اس کے کارناموں کا گند بھی اسے خود ہی سمیٹنے دو۔"

دین محمد کا دل چاہا فاروق کا منہ توڑ دے۔

"تو تو بیٹی کی محبت میں پاگل ہے دین محمد! تجھے ذرا بھی احساس نہیں تیری غیر معمولی محبت نے جنت کے ذہن کو کس قدر خراب کیا ہے۔ عورت کا ذہن ہی سیدھے راستے پر نہ چلے تو نسلیں کی نسلیں خراب ہو جاتی ہیں...... لیکن تو نہیں سمجھے گا۔ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔" زبیدہ زیر لب بڑبڑاتی اور روتی ہوئی رخصت ہوئی۔

دین محمد نے نخوت سے اسے جاتے دیکھا۔ تکبّر سے سر جھٹکا اور فیصلہ کر ڈالا۔

"میری معصوم بچی کو غلط راہ پر ڈال دیا لیکن میں سب سنبھال سکتا ہوں۔ کل ہی نہیں آج ہی میں بھائی حسین احمد سے ملنے روانہ ہو جاتا ہوں...... جنت میری لاڈو کے لیے دلاور حسین سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

اس نے پکا تہیہ کر لیا اور یوں جنت فاروق کے بجائے دلاور حسین کا مقدر بن گئی۔

ثمینہ سارا دن مصروف رہی تھیں۔ ایک بھی پل ایسا نہیں گزرا جب وہ ماوی کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے تانا بانا نہ بنتی رہی ہوں انہیں ماوی کو کس حد تک آگاہ کرنا ہے کتنا سچ بتانا ہے کتنا جھوٹ؟ وہ تقریباً سب فیصلے کر چکی تھیں لیکن پھر بھی کوئی گھبراہٹ تھی جو ان کے اعصاب پر سوار تھی۔

پورا لائحہ عمل ترتیب دینے کے بعد بھی بعض اوقات حسب منشا نتیجہ ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ امید ہو تب بھی گھبراہٹ سر پر سوار رہتی ہے یہی کیفیت ثمینہ کی تھی وہ کبھی بیٹھ جاتیں، کبھی چہل قدمی کرنے لگتیں۔ کھڑکی کے پار لان کی روش دکھائی دے رہی تھی جو تیز بارش میں تواتر سے بھیگ رہی تھی گو کہ طوفان کی شدت میں کمی آ گئی تھی لیکن کبھی کبھی بجلی بڑے زور سے کڑکتی اور بادل پوری قوت سے گرجتے تھے۔

انہیں خبر نہ ہوئی کب کچن سے نکل کر ماوی لاؤنج میں آ گئی۔

وہ کافی کے ساتھ پاپ کارن اور کوکیز بیک کر کے لائی تھی۔

"اتنی تیاری تو میں تب کرتی ہوں جب کوئی اچھی سی مووی دیکھنا ہو...... مجھے یقین ہے آپ آج مجھے کوئی بہت اچھی سی اسٹوری سنائیں گی۔" ماوی نے ہنس کر کہا تھا ثمینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اسی پل بجلی زور سے کڑکی تھی۔ ماوی کا چہرہ اس روشنی میں منور ہوا تھا۔

"ہاں ماوی! میں تمہیں اچھی سی اسٹوری ہی سناؤں گی لیکن اس سے بھی پہلے مجھے تمہیں ایک اور بات بتانا ہے، جسے سن کر تم ضرور شاکڈ ہو جاؤ گی۔" ثمینہ نے تمہید باندھی۔

"ایسی کیا بات ہے ممی!" ماوی نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں پتا ہے، تمہارے بابا جان کا انتقال کیسے ہوا تھا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ہارٹ اٹیک سے۔"

"کیونکہ تمہیں حقیقت کا علم نہیں ہے۔ تمہارے بابا کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔" ثمینہ کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ ماوی کی سماعت تک بمشکل پہنچی۔ لیکن اس دھیمی آواز نے بھی ماوی کے سر پر گویا آسمان گرا دیا تھا۔

"آ...... آپ کیا کہہ رہی ہیں ممی!" الفاظ اس کے لبوں سے بمشکل ادا ہوئے تھے۔

"اور آپ نے مجھے پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟ کس نے قتل کیا تھا بابا جان کو اور آپ نے اتنا عرصہ یہ بات مجھ سے چھپا کر کیوں رکھی تھی۔" ماوی نے تابڑ توڑ سوال کر ڈالے۔

"پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ بتانے کا صحیح وقت نہیں آیا تھا لیکن آج میں تم کو سب کچھ بتاؤں گی۔ تمہارے ہر اُس سوال کا جواب تمہیں ملے گا جو تمہارے دل میں سر اٹھاتا ہو۔" ثمینہ نے کافی کے مگ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"پھر بتائیں، کس نے میرے بابا جان پر ظلم کیا تھا۔" ماوی نے بے قراری سے کہا۔

"جنت بی بی نے۔" ثمینہ نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہارے بابا پر ہوئے ہر ظلم کی ذمہ دار وہی عورت تھی حتیٰ کہ انہیں قتل بھی اسی نے کیا تھا۔"

کافی کی سطح سے اٹھتی ہوئی بھاپ ان دونوں ماں بیٹی کے درمیان پردے کی طرح تن گئی تھی۔ ماوی کو ثمینہ کا چہرہ دھندلا دکھائی دینے لگا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

خلق کہتی ہے جسے دل تیرے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دُنیا، اسی ویرانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین، خلاصہ ہے اس افسانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نا! تماشا مرے غم خانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

فانی بدایونی

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو، یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

یہ ٹھٹھرتی ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشیٔ آواز نما کچھ کہتی ہے

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کر سوتے ہیں
اور دُور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامانوس اُداس نوا کچھ کہتی ہے

جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے

کبھی بھور بھئے، کبھی شام پڑے، کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رُت کی ہوا کچھ کہتی ہے

ناصر آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے، جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

ناصر کاظمی

سُنو!
اک بار پھر سے
پیار کا آغاز کرتے ہیں
نہ میں تم کو
تمہاری بے وفائی یاد دلاؤں گا
نہ تم مجھ کو
میری پچھلی خطاؤں پر سزا دو گی
کوئی وعدہ
کوئی پیمان جھوٹا
اب نہیں ہوگا
میں فوراً لوٹ آؤں گا
مجھے تم جب صدا دو گی
یہ تعلق ٹوٹ جانے سے
بہت تنہا رہا ہوں میں
تمہارا دل بھی روتا تھا
مجھے سب نے بتایا ہے
ہماری بے وفائی نے
ہمیں کتنا ستایا ہے
محبت یاد آئے تو
پلٹ کر لوٹنا سیکھو!
گرا کر بُت اناؤں کے
اَنا کو توڑنا سیکھو!
تعلق ٹوٹ جائے تو
اُسے پھر جوڑنا سیکھو!
سُنو!
اک بار پھر سے
پیار کا آغاز کرتے ہیں

ابنِ آس

کھو کے اس کو جہاں کے میلے میں
ہم بہت روئے تھے اکیلے میں

اس کی خوشبو کی چاپ سنتے ہی
پھول کھلنے لگے تھے بیلے میں

مجھ سے وعدہ کیا ہے ملنے کا
اس نے آئندگاں کے میلے میں

آؤ ڈھونڈیں کہاں گیا سورج
شام کے سُرمئی جھمیلے میں

اس سے کہنا کہ لوٹ آئے وہ
بات کرنا مگر اکیلے میں

اس کے چھوتے ہی ہوش کی ناؤ
بہہ گئی خوشبوؤں کے ریلے میں

نعمان فاروقی

ثانیہ غلام نبی

# ہنسی کی مہکتی مسکانیں

## اسی جگہ،

جارج اور ہنری دونوں شکاری تھے۔ انہوں نے افریقہ جا کر گینڈے کے شکار کا فیصلہ کیا اور ایک چارٹر طیارہ کروا کر افریقہ کے جنگل پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے دو گینڈوں کا شکار کیا اور انہیں رسیوں سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے جہاز کے قریب پہنچ گئے اور پائلٹ سے مطالبہ کیا کہ انہیں جہاز پر سوار کرانے میں اُن کی مدد کرے۔

پائلٹ نے ان سے کہا کہ میں دو گینڈوں کو جہاز پر سوار کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ اس میں حادثے کا خطرہ ہے۔

جارج اور ہنری نے کہا کہ ہم پچھلے سال بھی یہاں آئے تھے اور دو ہی گینڈے شکار کیے تھے۔ مگر پچھلے سال والے جہاز کے پائلٹ نے تو انہیں لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔"

یہ سن کر تذبذب کا شکار پائلٹ تیار ہو گیا اور دونوں گینڈوں کو جہاز میں سوار کروا کے جارج اور ہنری کے ساتھ جہاز کو اُڑا دیا۔

جہاز صرف چند کلو میٹر آگے بڑھا اور پھر دھڑام سے ... زمین پر پڑے ہوئے

ہنری نے سر اُٹھا کر جارج کو دیکھا اور بولا۔

"جارج! پچھلی بار بھی ہم اسی جگہ پر گرے تھے ناں؟"

شہناز شاز سے سیال۔ خانیوال

## ازدواجیات،

※ گھریلو جھگڑے کے دوران شوہر نے شکوہ کیا۔

"گھر آنے پر مجھے کبھی تازہ کھانا نہیں ملتا۔"

"اتنے ناشکرے نہ بنو۔" بیوی تڑپ کر بولی۔

"ابھی کل ہی تو ہم نے رات کے کھانے کے ساتھ اُبلا ہوا انڈہ کھایا تھا۔ کیا وہ باسی تھا؟"

※ بیوی نے اخبار پڑھتے ہوئے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ خبر پڑھی تم نے؟ اخبار میں لکھا ہے کہ افریقہ میں ایک شہر ایسا ہے جہاں آپ صرف بیس ڈالر میں اپنے لیے بیوی خرید سکتے ہیں۔"

شوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے بیگم؟ ناجائز منافع خوری کی وبا تو دنیا کے ہر کونے میں پہنچ چکی ہے۔"

※ شوہر ناشتے کی میز پر اخبار پڑھ رہا تھا۔ بیوی گھبرائی ہوئی آئی اور بولی۔

"میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا تھا کہ میری سونے کی انگوٹھی میری انگلی میں ذرا ڈھیلی ہے۔ کسی سنار سے ٹھیک کرا کے لا دو مگر تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ آخر وہ کہیں گر گئی۔ میں تو اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔"

شوہر نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر پُرسکون لہجے میں کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کل میں نے دفتر سے آ کر جو پتلون الماری میں لٹکائی تھی، اس کی جیب سے مجھے وہ انگوٹھی مل گئی ہے۔"

※ شوہر نے حیرت اور غصے سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟ ایک اور نیا سوٹ لا کر دوں؟ آخر تم نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے؟ کیا پیسے درختوں پر اُگتے ہیں؟ میں اتنے پیسے کس طرح کماؤں کہ ہر ہفتے تمہیں نیا سوٹ لا کر دوں؟"

"یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔" بیوی نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے، میں نے کبھی تمہارے کاروباری معاملات میں دخل نہیں دیا۔"

گیلانی سسٹرز۔ کہروڑ پکا

## افسوس،

ایک صاحب اپنے دوست کے ہمراہ ایک اسٹیج ڈراما دیکھنے چلے گئے۔ اسٹیج پر ایک سے ایک حسینہ آ کر ایکٹ کرتی رہی مگر ہر حسینہ کو دیکھنے کے بعد وہ صاحب یہی کہتے رہے۔

"لعنت ہے۔"

آخر دوست سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا۔

"کمال ہے یار! یہاں حسین سے حسین لڑکیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں اور تم پھر بھی کہے جا رہے ہو، لعنت ہے۔"

وہ صاحب بولے۔ "میں ان حسیناؤں کے بارے میں نہیں، اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

## تاخیر،

بیٹے نے باپ کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا حال ہیں ڈیڈی! میں ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا کہ ڈیڈی کو سلام کرتا چلوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں بیٹا!" باپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تمہاری ممی بھی ادھر سے گزر رہی تھیں۔ انہوں نے بھی سوچا کہ مجھے سلام کرتی جائیں۔ سارے پیسے وہ لے گئی ہیں۔"

بشانہ ظفر۔ لاہور

## ہاں یا نہیں،

دفعہ 302 کے مقدمات کا شہرت یافتہ وکیل قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ملزم پر بڑی سخت جرح کر رہا تھا۔ پہلے تو خوب گرجتی گرجتی آواز میں اس سے کوئی اوٹ پٹانگ سوال کرتا اور جب ملزم جواب دینے کے لیے منہ کھولتا تو وکیل کڑکتی ہوئی آواز میں اسے گھورتے ہوئے کہتا۔

"بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں ہاں یا نہیں میں مختصر جواب چاہتا ہوں۔"

ملزم بے چارے نے پہلے تو ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن جب تیسری چوتھی مرتبہ اسے ٹوکا گیا تو وہ جھنجلا کر بولا۔

"جناب! یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر بات کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا جائے۔ بہت سی باتیں ایسی بھی تو ہو سکتی ہیں جن کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا ہی نہیں جا سکتا۔"

"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" وکیل نے جواب دیا۔

"تم مجھ سے کوئی سوال کر کے دیکھو۔ میں تمہیں ہاں یا نہیں میں جواب دوں گا۔"

"بہت بہتر جناب!" ملزم بولا۔ اور پھر ایک لمحہ کچھ سوچے بغیر اس نے کہا۔

"ہاں تو قبلہ! ذرا یہ بتائیے کہ کیا آپ بھی اپنی بیوی کو مارنے پیٹنے ہیں؟"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

## دلیل،

کسی ہوٹل میں ایک خرگوش اور شیر داخل ہوئے۔ کچھ دیر توقف کے بعد دونوں ایک خالی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیرا آیا اور بڑے مؤدب انداز میں بولا۔

"فرمائیے جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

خرگوش نے کان کھجایا اور آنکھ میچ کر کہا۔

"بھائی! میرے لیے تو ایک گھٹی سلاد لے آؤ اور دیکھو، ساتھ انڈے زندے نہ ہوں۔"

بیرے نے سوالیہ نظروں سے خرگوش کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "اور آپ کے دوست کیا پسند فرمائیں گے؟"

"کچھ نہیں۔" خرگوش نے جواب دیا۔

"کیا انہیں بھوک نہیں ہے؟" بیرے نے پھر سوال کیا۔

خرگوش مسکرا کر بولا۔ "میاں ... سوچو اگر یہ بھوکے ہوتے تو بھلا میں ان کے ساتھ کیسے یہاں پہنچ پاتا؟"

عظمیٰ غلام نبی۔ کراچی

## درخواست،

برسات پر دلدل سے لبریز ایک علاقے میں رائل انجینئرز کور کے آفیسر انچارج نے اپنے ایک لیفٹیننٹ کو سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ لیفٹیننٹ نے جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد کرنل کی خدمت میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! دلدل قد آدم گہری ہے اور اس پر سڑک تعمیر نہیں کی جا سکتی۔"

"بکواس!" کرنل نے گرج کر کہا۔ "جس چیز کی ضرورت ہو، لکھ کر دو۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمہاری تحریری رپورٹ آنے پر ہی ضرورت کی چیزیں مہیا کر کے دوں گا۔"

لیفٹیننٹ سیلوٹ کر کے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل کو ایک چٹ ملی۔ جس پر لکھا تھا۔
"دلدل والے علاقے میں سڑک تعمیر کرنے کے لیے سولہ سولہ فٹ کے دس سپاہی مہیا کر دیجیے تاکہ تعمیرات کا کام شروع کیا جا سکے۔"

عذرا ناصر۔ کراچی

## سوال

عید میلے پر ایک بچھڑے ہوئے بچے نے پنڈال کے باہر سپاہی کو روک کر کہا۔
"آپ نے میری امی کو میرے بغیر کہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے؟"

نمل، زینب کراچی

## عزیب

تین بچیاں اپنے وجود میں آنے کا واقعہ بیان کر رہی تھیں۔
پہلی نے کہا۔ "مجھے تو ڈاکٹر صاحب لے کر آئے تھے۔"
دوسری نے کہا۔ "امی نے مجھے ریکس کے ہاں سے خریدا تھا۔"
تیسری نے کہا۔ "میری امی بے چاری غریب تھیں۔ انہوں نے مجھے گھر پر ہی بنا لیا تھا۔"

نادیہ۔ گجرات

## بے اعتبار

ایک لڑکی اپنی سہیلی کو بتا رہی تھی۔
"مردوں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ آج سے میں نے قسم کھائی ہے کہ طارق کا منہ نہیں دیکھوں گی اور مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کروں گی۔"
"آخر ہوا کیا؟" دوسری سہیلی نے پوچھا۔ "کیا طارق کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہے؟"
"نہیں۔ بلکہ طارق نے مجھے دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ جبکہ وہ مجھے کل بتا کر گیا تھا کہ وہ کراچی جا رہا ہے۔"

عائشہ ایمن۔ کراچی

## وجہ

ایک روسی فوجی چھٹی پر گھر گیا تو اپنی بدشکل بیوی کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔
"میری حور پری! تم کتنی سویٹ ہو۔"
بیوی بولی۔ "میں جانتی ہوں تم مجھے یہ خطاب کیوں دے رہے ہو۔ کیونکہ میں دو گھنٹے سنگھار میز پر گزار کر آئی ہوں۔"
شوہر نے کہا۔ "نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دو سال افغانستان میں گزار کر آیا ہوں۔"

عابدہ نشاد۔ کراچی

## مشورہ

آنجہانی مفکر و ادیب برنارڈ شا کے پاس ایک افسانہ نویس اپنا افسانہ لے کر گیا اور کہا۔
"میرا یہ افسانہ پڑھ کر لوٹا دیں۔ میں نے ایسے کئی افسانے لکھ کر الماری میں رکھے ہوئے ہیں۔"
برنارڈ شا نے افسانہ پڑھا اور مسودہ افسانہ نویس کو لوٹاتے ہوئے کہا۔
"اسے بھی الماری میں دوسرے افسانوں کے ساتھ رکھ دو۔"

مدیحہ یوسف۔ فیصل آباد

## مہارت

انور صاحب اپنے دوست جمال صاحب کو اپنی موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر روانہ ہوئے تو جمال صاحب کافی گھبرا رہے تھے کیونکہ وہ موٹر سائیکل پر سفر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ انور صاحب نے تیز رفتاری سے ایک شارع پر موٹر سائیکل کو دوڑاتے ہوئے اونچی آواز میں جمال صاحب کو تسلی دی۔
"آپ کو گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ میں دن میں کئی مرتبہ اس سڑک پر جاتا ہوں اور مجھے پتا ہے کہ اس سڑک پر کہاں کہاں گڑھا ہے۔"
عین اسی وقت موٹر سائیکل ایک گڑھے سے گزری اور بری طرح اچھلی۔ جمال صاحب گرتے گرتے بچے۔
انور صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔
"اور یہ انہی گڑھوں میں سے ایک گڑھا تھا۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

شگفتہ جاہ

## حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ اُم المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رات کے وقت باہر نکلیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں دیکھ لیا اور پہچان گئے۔ کہنے لگے۔

"اے سودہ! اللہ کی قسم، تم ہم سے نہیں چھپ سکتیں۔"

جب حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واپس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرے حجرے میں شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں گوشت کی ہڈی تھی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی اور جب نزول وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ اپنی ضروریات کے لیے باہر نکل سکتی ہو۔"

تشریح:-

آج کے دورِ نازک میں ضروریاتِ زندگی اور معاشی جدوجہد اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اکثر مواقع پر عورتوں کا گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس بارے میں تنگی نہیں رکھی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ شرعی حدود میں پردہ کر کے عورتیں باہر نکلیں۔

(صحیح بخاری۔ جلد ششم۔ حدیث نمبر 5237)

## مومن کی اہمیت،

حضرت ابوالحسن بیعت عقبہ میں بھی شریک ہوئے تھے اور جنگِ بدر میں بھی۔ وہ فرماتے ہیں۔

ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی کھڑا ہو کر کہیں چلا گیا اور اپنی جوتیاں وہیں بھول گیا۔ ایک آدمی نے وہ جوتیاں اٹھا کر اپنے نیچے رکھ لیں۔ وہ آدمی واپس آ کر کہنے لگا۔

"میری جوتیاں کہاں ہیں؟"

لوگوں نے کہا۔ "ہم نے تو نہیں دیکھیں۔"

پھر اس کے بعد جس آدمی نے وہ جوتیاں چھپائی تھیں، اس نے کہا۔

"یہ ہیں جوتیاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مومن کو پریشان کرنے کا کیا جواب دو گے؟"

اس آدمی نے کہا۔ "میں نے تو مذاق میں چھپائی تھیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین بار یہی فرمایا۔

"مومن کو پریشان کرنے کا کیا جواب دو گے؟"

جو لوگ بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو شہید کرتے ہیں ان پر ہتھیار اٹھاتے ہیں، اپنا انجام سوچیں۔

## ماں کی دُعا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا۔

"جنت میں میرے ساتھ کون ہوگا؟"

ارشاد ہوا۔ "فلاں قصاب بھی تیرے ساتھ ہوگا۔"

آپ کچھ حیران ہوئے اور اس قصاب کی تلاش میں چل پڑے۔ وہاں دیکھا تو ایک قصاب اپنی دکان میں گوشت بیچنے میں مصروف تھا۔ اپنا کاروبار ختم کر کے اس نے ایک گوشت کا ٹکڑا کپڑے میں لپیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قصائی کے بارے میں مزید کچھ جاننے کے لیے بطور مہمان گھر چلنے کی اجازت چاہی۔

گھر پہنچ کر قصائی نے گوشت کو پکایا پھر روٹی پکا کر اس کے ٹکڑے شوربے میں نرم کیے اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ایک انتہائی کمزور بڑھیا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے بمشکل تمام اس بڑھیا کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ایک ایک لقمہ اس کے منہ میں دیتا رہا۔ جب اس نے کھانا تمام کیا تو بڑھیا کا منہ صاف کر دیا۔ کھانا کھا کر بڑھیا نے قصاب کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر قصاب مسکرا دیا اور بڑھیا کو واپس لٹا کر باہر آ گیا۔

[illegible] یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

آپ نے قصاب سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے اور اس نے تیرے کان میں کیا کہا، جس پر تو مسکرا دیا؟"

قصاب بولا۔ "اے اجنبی... یہ عورت میری ماں ہے، گھر پر آنے کے بعد میں سب سے پہلے اس کا کام کرتا ہوں تو خوش ہو کر روز مجھے یہ دُعا دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں حضرت موسیٰ کے ساتھ رکھے۔ جس پر میں مسکرا دیتا ہوں کہ بھلا میں کہاں اور موسیٰ کلیم اللہ کہاں؟"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

## جواہر پارے،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"یہ مت دیکھو کہ کون بات کر رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا بات کہہ رہا ہے۔"

آپ رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا۔

"ہر بھائی چارہ ختم ہو جاتا ہے، صرف وہی بھائی چارہ باقی رہتا ہے، جو لالچ کے بغیر ہو۔"

حمزہ، اقرا۔ کراچی

## ایمان کامل،

حضرت سعد بن ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت زنیرہؓ رومی باندی تھیں۔ وہ مسلمان ہوئیں تو ان کی بینائی جاتی رہی۔ اس پر مشرکوں نے کہا۔

"ہمارے بتوں (لات و عزیٰ) نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔"

حضرت زنیرہؓ نے کہا۔ "انہوں نے (لات و عزیٰ) نے نہیں کیا۔ میں لات و عزیٰ (کے معبود ہونے) سے انکار کرتی ہوں۔" پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی واپس لوٹا دی۔

## نیت پر انحصار ہے،

حضرت عاصم بن عمر بن قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں میں ایک پردیسی آدمی رہتا تھا۔ اسے کوئی جانتا [illegible]

جب بھی اس کا تذکرہ ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔ "یہ تو دوزخ والوں میں سے ہے۔"

جنگ احد کے دن اس نے خوب زور و شور سے لڑائی لڑی اور اکیلے ہی سات آٹھ مشرکوں کو قتل کر ڈالا۔ وہ بڑا بہادر اور جنگجو تھا۔ آخر وہ زخموں سے نڈھال ہو گیا تو اسے بنو ظفر کے محلے میں اٹھا کر لایا گیا تو بہت سے مسلمان اس سے کہنے لگے۔

"اے قزمان! آج تو تم بڑی بہادری سے لڑے ہو۔ تمہیں خوشخبری ہو۔"

اس نے کہا۔ "مجھے کس چیز کی خوشخبری؟ اللہ کی قسم! میں نے تو صرف اپنی قوم کی ناموری کے لیے لڑائی لڑی ہے۔ اگر میرا یہ مقصد نہ ہوتا تو میں کبھی نہیں لڑتا۔"

چنانچہ جب اس کے زخموں کی تکلیف بڑھ گئی تو اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور خودکشی کر لی۔

## پردہ پوشی،

ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی کے عیب بیان کر رہا تھا، حضرت علیؓ نے منع فرمایا تو کہنے لگا۔

"میں اس کے عیب سارے شہر کو بتانا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ جس شخص کو آپ بہت معزز اور شریف سمجھتے ہیں، اس میں کتنے عیب ہیں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "بے عیب صرف اللہ تعالیٰ ذات اور ہمیں کسی بھی شخص کے ان عیبوں کی تشہیر نہیں کرنا چاہیے، جن پر خود اللہ تعالیٰ پردہ ڈال رہا ہو۔"

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

## عظمت و سادگی،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ زمانۂ خلافت میں حضرت عمر فاروقؓ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان اوپر نیچے تین پیوند لگا رکھے تھے۔"

[illegible] نغمہ۔ کراچی

## اقوالِ زریں،

☆ کسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا خبر کہ وہی

آخری امید لے کر چل رہا ہو۔

- کسی چیز کو اتنا مت تراشو کہ اس کا وجود ہی مٹ جائے۔
- جو بات راز میں رکھنا چاہو، اُسے پھر دوستوں سے بھی چھپا کر رکھو۔ کیونکہ دُنیا میں کل کا دشمن آج کا دوست اور آج کا دوست کل دشمن کی لائن میں بھی ہو سکتا ہے۔
- کچھ لوگ ہماری زندگی میں نگاہ کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ مل جاتا ہے۔

سونیا ربانی۔ قاضیاں محلہ بالا

## موتی مالا

- اگر آپ تیس برس کی عمر میں طاقت ور اور چالیس برس میں عقل مند نہیں بنے تو آپ کبھی عقل مند اور طاقت ور بننے کی امید مت رکھیں۔
- لوگوں کو ہماری ضرورت نہیں بلکہ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔
- قوانین کی کثرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ یا تو بادشاہ بہت جابر ہے یا رعایا ہی بے لگام ہے۔
- خاموش رہنا اور بے وقوف شمار ہونا۔ بول کر تمام شبہات کو دُور کرنے سے بہتر ہے۔
- خاموش رہ اور بولنا سیکھ۔ آنکھیں بند کر اور دیکھنا سیکھ۔
- ان اسرار سے پردہ ہٹانے کی کوشش نہ کر جو خدا کی ذات سے متعلق ہوں۔
- اللہ آسمان پر ہے اور اس کے نور کا عکس زمین پر۔ جو لوگ اس کا وظیفہ بجا لاتے ہیں' وہ ان کے قریب تر ہے۔
- اللہ تعالیٰ کا ناشکر گزار نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ناراضی تجھے بڑی آفت میں مبتلا کر دے۔
- فصاحت کی نسبت صاف گوئی زیادہ مؤثر ہے۔ یاد رکھو کہ نیک اعمال کے سوا دُنیا و آخرت میں تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

## روزہ دار ڈاکو

روض الریاحین میں ہے حضرت سیدنا ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں۔ میں قافلے کے ہمراہ ملک شام جا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکوؤں کی جماعت نے ہمیں لوٹ لیا اور سارا مال و اسباب اپنے سردار کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ سامان میں سے ایک شکر اور بادام کی تھیلی نکلی۔ سارے ڈاکوؤں نے نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ مگر ان کے سردار نے ان میں سے کچھ نہ کھایا۔ میں نے پوچھا۔

"سب کھا رہے ہیں مگر آپ جو ان کے سردار ہیں' کیوں کچھ نہ کھایا؟"

اس نے کہا۔ "میں روزے سے ہوں۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "تم لوٹ مار بھی کرتے ہو اور روزہ بھی رکھتے ہو؟"

سردار بولا۔ "اللہ سے صلح کے لیے بھی تو کوئی راہ باقی رکھنی چاہیے۔"

حضرت سیدنا شبلیؒ فرماتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد میں نے اسی ڈاکو کو احرام کی حالت میں طواف خانہ کعبہ میں مشغول دیکھا۔ اس کے چہرے پر عبادات کا نور تھا اور مجاہدات نے اسے کمزور کر دیا تھا۔

میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ "کیا تم وہی شخص نہیں ہو؟"

وہ بولا۔ "جی میں وہی ہوں اور سنیے۔ اسی روزے نے اللہ کے ساتھ میری صلح کروا دی ہے۔"

ثمرین شہزادی۔ ملتان

## عظیم لوگوں کی عظیم باتیں

- طمع کے تین حرف تینوں ہی خالی ہیں۔ کسی میں نقطہ نہیں۔ مطلب یہ کہ طمع سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(حضرت ابن یمین خراسانیؒ)

- دل زبان کی کھیتی ہے' اس سے اچھی باتوں کی تخم ریزی کرو۔ دانے سب نہ اگیں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور اگیں گے۔ (امام شافعیؒ)
- لوگوں کے لیے غائبانہ دُعا کرنا ان کی ملاقات سے بہتر ہے کیونکہ ملاقات میں کبھی نمائش اور ریا پیدا ہو جاتا ہے۔ (حضرت اویس قرنی)
- جو گناہ کا مرتکب ہوا سے آدمی سمجھو۔ جو گناہ کر کے نادم پشیمان ہو اسے ولی سمجھو اور جو گناہ کر کے اترائے اسے شیطان سمجھو (گورو نانک)

صائمہ جیمی۔ کراچی

# دستک دستک دستک

شاہین رشید

## حمیمہ

"کیسی ہو...؟ اور فلم "بول" اور ڈرامہ سیریل "اکبری اصغری" کی کامیابی پر مبارک باد قبول کرو۔"

"تھینک یو شاہین! میں بہت خوش ہوں اپنی فلم کی کامیابی پر۔ پہلی فلم اور وہ بھی اتنی کامیاب' جہاں تک ڈراموں کی بات ہے تو ڈرامے تو اللہ کا شکر ہے' سب ہی پسند کرتے ہیں۔"

"پہلی فلم اور اتنی کامیاب... امید تھی؟"

"بالکل تھی' کیونکہ شعیب منصور جیسے باصلاحیت لوگوں کی ناکامی کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

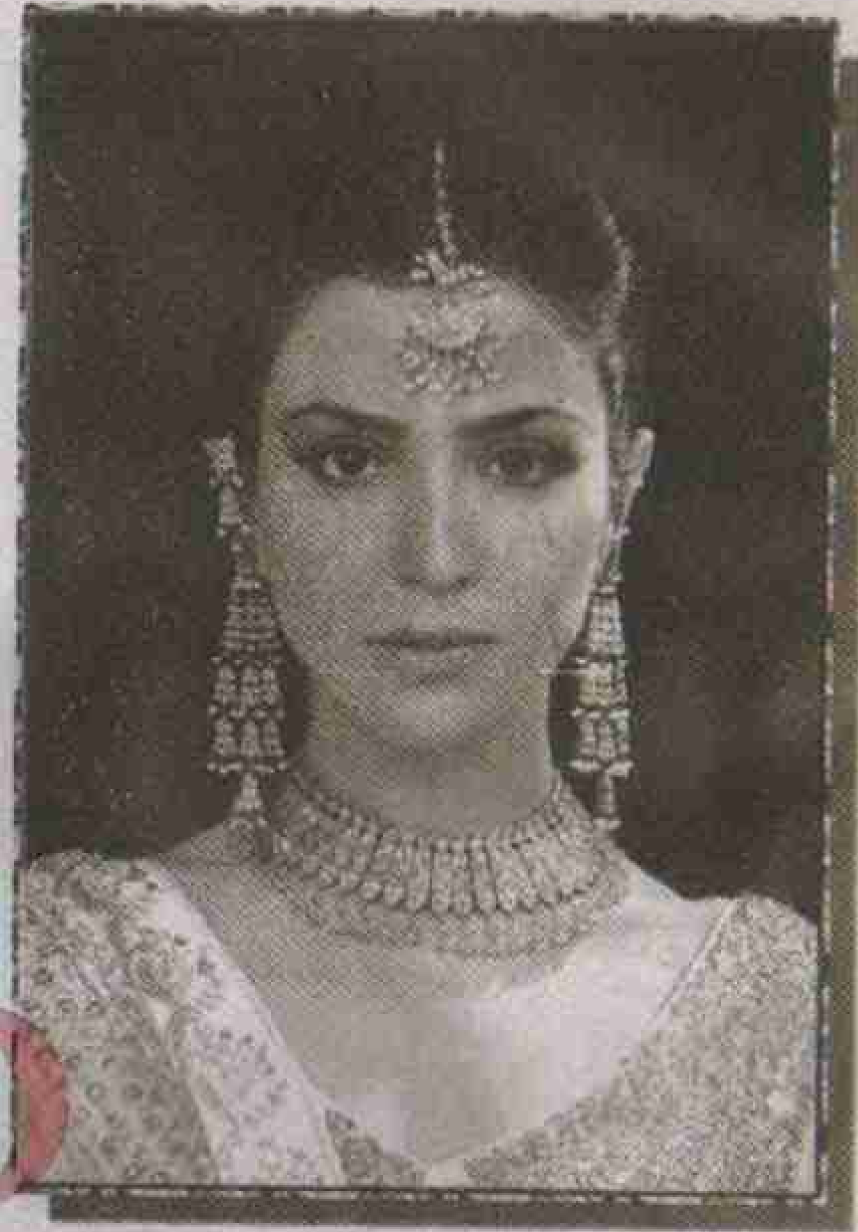

"جب شعیب منصور نے تم سے رابطہ کیا اور مرکزی کردار کے لیے آفر دی تو کیا احساسات تھے؟"

"بہت زیادہ خوشی تھی' پیر زمین پر نہیں لگ رہے تھے' مگر میں نے پھر بھی سب سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ سب سے مراد اپنے گھر والے' اور جب میں نے گھر والوں کو بتایا کہ مجھے شعیب منصور صاحب نے آفر دی ہے تو سب کا ایک ہی جواب تھا کہ آنکھیں بند کرکے ہاں کردو۔ سوچو بھی مت۔"

"پھر مایوسی تو نہیں ہوئی؟"

"ارے نہیں' بلکہ میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے کال کی' میرا انتخاب کیا۔ بس اب آپ لوگ بتائیں گے کہ میری پرفارمنس کیسی ہے۔"

"یہ پہلی آفر تھی یا اس سے پہلے بھی کوئی آفر آچکی ہے؟"

"اس سے پہلے مجھے پاکستان میں ہی فلموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی۔ لیکن آپ کو پتا ہی ہے کہ ہماری انڈسٹری کس قدر زوال پذیر ہے' اسی وجہ سے فیملی کی طرف سے فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں ملی' لیکن شعیب منصور جیسے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔"

"پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور رائٹر کیونکہ "بول" کے رائٹر بھی شعیب منصور ہی ہیں۔"

"جی جی بالکل' قدرت نے انہیں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔"

"تم جیسی اسمارٹ اور خوب صورت لڑکی کو انڈیا والوں نے بلایا۔"

"دیکھیں اس بارے میں' میں ابھی کچھ بھی نہیں کہہ سکتی' جب تک کچھ فائنل نہ ہوجائے' وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر ہی کوئی بات کرے۔"

"پھر بھی اگر موقع ملا تو؟"

"ظاہر ہے کہ اچھے مواقع کون ضائع کرتا ہے.... لیکن اچھی آفر ہی قبول کروں گی' چھوٹی موٹی آفر قبول نہیں کروں گی۔"

"میں نے جب تمہارا انٹرویو کیا تھا' "پیا کا گھر پیارا لگے" کے حوالے سے' تو شمعون کو تم نے ایک آئیڈیل انسان بتایا تھا' پھر اچانک فاصلے کیوں بڑھ گئے؟"

"بالکل کہا تھا' مجھے یاد ہے اور میں نے شمعون کو بہت چاہا' اور شمعون کے حوالے سے جتنے بھی ریلیشن تھے' سب کو نبھایا' مگر بس قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اور یہ رشتہ ختم ہوگیا' سب قسمت کے کھیل ہیں' انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔"

"پھر آئندہ کے لیے کیا ارادے ہیں؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی' فی الحال تو اپنے کیریئر پہ توجہ دے رہی ہوں۔" تمہاری اسمارٹنس کو دیکھ کر بہت سی لڑکیوں کو رشک آتا ہے۔ کیا کرتی ہو؟

"یہ سب قدرتی ہے' میں اسمارٹ رہنے کے لیے کچھ نہیں کرتی۔ مجھے کھانے پینے کا شوق ہے اور میں اپنی پسند کی ہر چیز کھاتی ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ میں پنجابی ہوں اور پنجابی کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ تو بس... قدرت مہربان ہے تو پھر کیا ضرورت ہے' کھانے سے ہاتھ کھینچنے کی' ہاں اگر کبھی موٹی ہوگئی تو کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔"

"کھانے پینے میں کیا پسند ہے؟"

"سب کچھ پسند ہے' پانی بہت پیتی ہوں' چائے بہت پسند ہے' خاص طور پر ڈھابے کی چائے' بھئی اس کا تو مزا ہی کچھ اور ہے' دودھ پتی کی چائے بھی بہت پسند ہے۔"

"اپنی پسندیدہ عادت؟"

"سب کے لیے پوزیٹو میں سوچتی ہوں۔ کسی کی غیبت نہیں کرتی۔ کسی پر تنقید نہیں کرتی' سب کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ہے' اس لیے کسی کی زندگی میں مداخلت بھی نہیں کرتی۔"

## بلال مقصود

"کیسے ہیں بلال... آپ اور آپ کے دوست فیصل کپاڈیا' دونوں کو بہت شہرت ملی ہے' کیسا محسوس کررہے ہیں آپ؟"

"بہت اچھا' بہت محبت دیتے ہیں لوگ اور لوگوں کی پذیرائی سے ہی ہم میں آگے بڑھنے کی ہمت آتی ہے۔"

"بلال! آپ کو اپنے والد کی وجہ سے بھی اس فیلڈ میں آنے کی آسانی ہوئی ہوگی؟"

"بے شک والد صاحب کا بہت بڑا نام ہے' لیکن آپ جانتی ہیں کہ اس فیلڈ میں ٹیلنٹ بولتا ہے۔ اگر ٹیلنٹ نہیں ہوگا تو آپ کتنے دن چل پائیں گے؟ ہم اپنے ٹیلنٹ اور جدوجہد کے ساتھ آگے بڑھے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ہم سونے کا نوالہ لے کر پیدا نہیں ہوئے۔ ہم نے بھی بہت مشکلات اٹھائی ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں ایک نامور فنکار کا بیٹا ہوں' رکشوں اور بسوں میں اور پیدل بھی سفر کیا ہے۔"

"ملکی حالات کی خرابی نے لائیو شو پر اثر تو ڈالا ہوگا۔"

"بالکل ڈالا ہے... لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ ہوجائے' کوئی خدانخواستہ بم بلاسٹ نہ ہوجائے۔ کتنی بھی سیکیورٹی ہو' لوگ آتے

ہوئے گھبراتے ہیں، خاص طور پر کراچی میں۔"

"آپ اتنے مصروف رہتے ہیں، ملک سے باہر بھی آنا جانا لگا رہتا ہے، بیگم اور بچے ڈسٹرب تو ہوتے ہوں گے۔"

"بالکل ہوتے ہیں، لیکن قسمت میں جس انداز میں رزق لکھا ہے، ہمیں جدوجہد کرکے اسے حاصل کرنا ہے اور اب تو خیر گھر والوں کو عادت ہو گئی ہے، اس لیے زیادہ محسوس نہیں کرتے، لیکن جب ہم اپنے ملک میں ہوتے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاریں۔"

"خیر سے شادی کو کتنے سال ہو گئے اور بچے کتنے ہیں؟"

"1995ء میں میری شادی ہوئی اور ماشاءاللہ سے تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔"

"پسند سے ہوئی تھی؟ اور کیا کچھ زیادہ جلدی نہیں ہو گئی آپ کی شادی؟"

"جی! پسند سے ہوئی۔ میری بیگم میرے ساتھ ہی پڑھتی تھیں۔ پسند کو ارینج کر دیا اور ماشاءاللہ بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے۔ اور جہاں تک جلدی کی بات ہے تو ہماری فیلڈ ایسی ہے کہ یہاں فیملی جلدی بنا لینا چاہیے، ویسے بھی فیملی بن جائے تو بندہ ذہنی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں تو کام کرنے میں زیادہ دل لگتا ہے کہ کچھ کرنا ہے۔ ذمہ داریوں کو نبھانا ہے۔"

"بیگم آپ کی طرح میوزک کی دل دادہ ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں۔۔۔ بس سننے کی حد تک پسند ہے انہیں میوزک۔"

"ٹین ایج کے دور میں خیالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی کچھ بننے کی امنگ جنم لیتی ہے تو کبھی کچھ اور۔۔۔ آپ کے خیالات اس وقت کیا تھے؟"

"میں کامرس کا طالب علم تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں بینکر بنوں۔۔۔ پھر اچانک ایک دن خیال آیا کہ نہیں کوئی اور فیلڈ ہونی چاہیے، اس وقت میوزک سے بہت متاثر ہو گیا تھا تو والد صاحب سے کہا کہ میں میوزک کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ابتدا میں تو منع کیا۔ لیکن میرا شوق دیکھ کر انہوں نے اجازت دے دی۔ تب فیصل اور میں نے اپنا میوزک گروپ "اسٹرنگز" کے نام سے متعارف کرایا۔"

"ابتدا میں تو مشکل ہوئی ہو گی؟"

"بالکل۔۔۔ ہر نئے کام میں مشکل ہوتی ہے اور ہمیں بھی ہوئی۔ اس وقت نجی چینلز کا اجرا بھی نہیں ہوا تھا اور چونکہ پی ٹی وی ہی تھا تو پہلے اسے پی ٹی وی پہ متعارف کرایا اور بس پھر آہستہ آہستہ مقبولیت ملتی چلی گئی۔"

"والد صاحب نے کہا نہیں کہ لکھنے کی طرف آجاؤ۔"

"نہیں۔۔۔ کیونکہ لکھنا تو قدرتی صلاحیت ہوتی ہے اور مجھ میں یہ صلاحیت نہیں تھی۔ ہمارے گروپ کے لیے گانے بھی والد صاحب ہی زیادہ تر لکھ کر دیتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ انور مقصود صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں، اچھے مصور، بہترین شاعر، رائٹر۔"

"بالکل جی۔۔۔ ہمارے خاندان کے سب ہی لوگ ماشاءاللہ ذہانت اور صلاحیتوں میں خود کفیل ہیں۔"

## زیبا علی

"زیبا! کیسی ہیں۔۔۔؟ کافی عرصے کے بعد آپ اسکرین پہ اور وہ بھی کسی ڈرامے میں نظر آرہی ہیں۔"

"اللہ کا کرم ہے۔۔۔ اور ایسا نہیں ہے کہ میں کافی عرصے کے بعد اسکرین پہ آرہی ہوں۔ مختلف چینلز سے میرے پروگرام ہوتے رہتے تھے اور ڈرامے بھی کر رہی ہوں۔ چونکہ چینلز کافی ہو گئے ہیں تو اس لیے لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔"

"آج کل ڈرامہ سیریل "تم ہو کہ چپ" میں تمہیں دیکھ رہے ہیں، کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"رسپانس کا اندازہ تو آپ اس بات سے لگائیں کہ آپ نے مجھے کال کی اور دیگر لوگوں کی طرف سے بھی بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔"

"کتنے سال ہو گئے ہیں تمہیں اس فیلڈ میں؟"

"تقریباً گیارہ سال۔ 2000ء میں، میں نے اس فیلڈ میں قدم رکھا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے کامیابیوں کے راستے کھول دیے۔"

"اچھا۔۔۔ کس نے متعارف کرایا اس فیلڈ میں؟"

"کسی نے نہیں۔ اپنی صلاحیتوں سے آئی ہوں۔ ایک دن اخبار میں اشتہار آیا کہ ہمیں خوش شکل اور اسمارٹ ماڈلز کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی قسمت آزمالوں اور اپنی تصاویر بھیج دیں چند دنوں کے بعد ہی بلاوا آگیا۔"

"پہلا کام کیا کیا؟ اداکاری یا ماڈلنگ؟"

"پہلا کام میگزین ماڈلنگ کی، دوسرا کام کمرشل ماڈلنگ جو کہ ایک صابن کی تھی، تیسرا کام اداکاری کا تھا اور یہ تینوں کام جاری ہیں۔ جس وقت میں اس فیلڈ میں آئی۔ اس وقت میں میٹرک کی طالبہ تھی۔"

"رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ رمضان المبارک اور پھر عید اہتمام سے مناتی ہو؟"

"بالکل جی۔۔۔ بہت اہتمام سے مناتی ہوں۔ نماز، روزہ کرنا، پھر اہتمام کے ساتھ عید منانا۔ مجھے سب بہت اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ دنیا میں سب سے اچھا مذہب ہمارا ہے، مگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا، بس اس کا افسوس ہوتا ہے۔"

"کیا آرٹسٹ کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، یا بس واجبی سی تعلیم سے بھی گزارا ہو سکتا ہے؟"

"تعلیم تو ہر فیلڈ کے لیے بہت ضروری ہے، خواہ شوبز ہو یا کوئی اور، تعلیم ہی تو انسان کو شعور دیتی ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔۔۔ کچھ اپنی فیملی کے بارے میں؟"

"جی۔۔۔! میں 20 ستمبر 1984ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، میں نے گریجویشن کیا ہے۔ مصروفیات کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ میرے والد کا نام آصف علی شیخ ہے، ان کا تعلق سکھر سے جبکہ میری والدہ کا تعلق کوئٹہ سے ہے۔"

"والدین کی اکلوتی اولاد ہو، لاڈ پیار نے بگاڑا؟"

"والدین کی بہترین تربیت کی وجہ سے میں بگڑی تو نہیں۔ ہاں ضدی ضرور ہو گئی، مگر ایسی کوئی خواہش نہیں کی جو کہ باعث ندامت ہو، اگرچہ والدین راضی نہیں تھے کہ میں اس فیلڈ میں آؤں، لیکن جب انہوں نے میرے شوق اور لگن کو دیکھا تو مجھے اجازت دے دی۔"

"ضدی لوگوں میں غصہ بھی ہوتا ہے، ایسا ہے کیا؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ ضدی لوگوں میں غصہ واقعی بہت تیز ہوتا ہے، مجھ میں بھی غصہ ہے اور کافی تیز ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ میں بلاوجہ غصہ کروں، کوئی بات ہوتی ہے تو غصہ آتا ہے، ورنہ تو میں خوش مزاج ہوں، کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"اپنی غلطی پہ شرمندہ ہوتی ہیں؟"

"بہت زیادہ۔۔۔ اور پھر اپنے آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔" ☆

# کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالد جیلانی

مریم، سائرہ صغیر احمد ______ شرقپور شریف

عجیب طرح سے سوچا تھا زندگی کے لیے
جینا مرنا تھا صرف اسی کے لیے
وہ مجھ کو تنہا چھوڑ گیا تو یقین آیا
کہ کوئی بھی نہیں مرتا کسی کے لیے

سعدیہ نائلہ رانا ______ کسووال

مجھے ناز ہے کہ میں حسین ہوں جو گلستان کو زوال کیا
مجھے فخر ہے کہ میں عشق ہوں جو جلا نہ دوں تو کمال کیا
مجھے زندگی کی دعا نہ دے، مجھے زندگی کی طلب نہیں
میری موت کو جو ٹال دے اس زندگی کی مجال کیا

سعدیہ، مریم ______ کراچی

نہ ہم رہے دل لگانے کے قابل
نہ دل رہا غم اٹھانے کے قابل
لگا جو بے وفائی کا زخم دل پہ
نہ چھوڑا ہمیں کبھی مسکرانے کے قابل

عنبر عتیق الرحمن ______ لاہور

لمحہ لمحہ ڈس رہا ہے ایک ہی لمحے کا ڈر
زندگی کو کھا گیا ہے ایک دن مرنے کا ڈر
اتنے تھوڑے وقت میں کیا کیا نہ کچھ کرنے کی دھن
اتنی لمبی عمر میں کچھ بھی نہ کر سکنے کا ڈر

مہوش ڈوگر ______ گوجرانوالہ

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بے قرار کا

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی

جو آسماں پہ ہمیشہ رہا ہے آج اسے
ہمیں بتانا ہے کہ اک جگہ زمین بھی ہے
انا پرست ہے وہ جانتے ہیں ہم لیکن
وہ خود بلائے گا اس بات کا یقین بھی ہے

گیلانی سسٹرز ______ کراچی

ساری حقیقتوں کو خواب کر کے
عمر بھر کی خوشیاں سراب کر کے
بدل گیا ہے وہ چاہتوں سے فراز
میری عادتوں کو خراب کر کے

طوبیٰ، نادیہ ______ گجرات

اک حرف تسلی کا، ایک لفظ محبت کا
خود اپنے لیے اس نے لکھا تو بہت رویا
اوروں کے لیے چپ چاپ دھوپ میں بکھرتے ہیں
سیکھے کوئی آداب وفا شگ و شجر سے

صائمہ سلیم سندھو ______ گوجرہ

کیسے کہتے ہو کوئی یاد نہیں خاور
شام ہوتے ہی کبھی دیکھو ذرا صورت اپنی

کرن، بینش ______ کراچی

چاند بدلا ہے کبھی جھیل بدل جانے سے
آئینہ کوئی بھی ہو، عکس تمہارا ہوگا

عذرا، اقصیٰ ______ کراچی

ہے آج بھی ہماری انا کا وہی مزاج
مشکل ہے اپنے درد کا اظہار آج بھی

سدرہ وزیر ______ خوشاب

گئی رتوں کی طرح وہ بھی لوٹ آئے گا
مزاج اس کا بدلتا ہے موسموں کی طرح

عنبر وسیم ______ گوجرانوالہ

ہم موم کی سیڑھی پہ کھڑے سوچ رہے ہیں
سورج سے بغاوت کا صلہ کیسا ملے گا
اب دیکھنا یہ ہے کہ رضا کچے گھڑے کو
دریا سے محبت کا صلہ کیسا ملے گا

سدرہ سمیع، ملتان ______ عبدالحکیم

میں چپ رہوں کبھی بے وجہ ہنس پڑوں محسن
اسے گنوا کے عجب حوصلے تلاش کروں



نسیم سحر ______ گلشن اقبال

یہ اور بات کہ منبر پہ آکے کچھ نہ کہیں
خاموش لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں

نمرہ رزاق ______ ڈیفنس کراچی

تمہاری یاد بھی محسن کسی مفلس کی پونجی ہے
جسے ہم ساتھ رکھتے ہیں جسے ہم روز گنتے ہیں

یاسمین کنول ______ پسرور

اب آئیں یا نہ آئیں ادھر پوچھتے چلو
کیا چاہتی ہے ان کی نظر پوچھتے چلو

نمرہ، اقرا ______ کراچی

بلا جواز کسی اجنبی کے گھر جانا
عجیب لگتا ہے انسان کا چاند پر جانا
مدار محض قرائن پہ کشتیوں کا رہا
کبھی ہوا، کبھی تاروں کو راہبر جانا

کومل عدنان ______ کراچی

ایک اک لمحے پر خود کرتے گزرے
ہم جہاں بھی گئے ڈرتے ڈرتے گزرے

عائشہ، تحریم ______ گوجرہ

باوقار لوگوں کو بے وجہ ستانے کا
انگلیاں اٹھانا تو کام ہے زمانے کا

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑ پکا

جو چاہتے ہو دلوں میں کوئی جگہ رکھنا
محبتوں میں بھی تھوڑا فاصلہ رکھنا
بس اس کی یاد میں مت زندگی رکھنا
دلوں کا راستہ سب کے لیے کشادہ رکھنا

گڑیا شاہ ______ کہروڑ پکا

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے
فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

مایا انعام، حفصہ انعام ______ کراچی

جس شہر میں جگہ جگہ کئی سائباں رہے
دکھ ہے وہاں رہے بھی تو ہم بے اماں رہے
ایسے انا پرست تھے کہ مل نہیں سکے
میں دھرتی ہو کے رہ گیا، وہ آسماں رہے

صغیر فاطمہ ______ ملیر کراچی

حسین آنکھوں کو پڑھنے کا ابھی تک شوق ہے مجھ کو
محبت میں اجڑ کر بھی میری عادت نہیں بدلی

آمنہ اجالا ______ ڈہرکی

نہ قحط آب کا ڈر تھا نہ سیل آب کا خوف
زمینیں ہی ایسی تھیں، بادل ہی یوں برسے تھے
بس اتنا یاد ہے کچھ لوگ بک رہے تھے ظفر
خبر نہیں کہ وہ مہنگے تھے یا کہ سستے تھے

سیدہ رقیہ اسماعیل ______ ملتان

تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم تھے مگر
تیرا چہرہ ہی فقط میری دعاؤں میں رہا

عابدہ بشیر مروت ______ لکی مروت

سونا آنگن، تنہا عورت، لمبی عمر
خالی آنکھیں، بھیگا آنچل، گیلے ہونٹ
اتنا بولو گی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی ہے لڑکی سی لے ہونٹ

مسرت الطاف احمد ______ کراچی

وہ جانتا تھا اس کی ہنسی مجھے پسند ہے فراز
زخم اس نے جب بھی دیا مسکرا کر دیا

سدرہ سعیدی ______ منکیرہ ضلع بھکر

کتابیں عشق کی پڑھ کے نہ سمجھو خود کو عالم تم
یہ دل کے کام دل والوں کو کرنے دو تو اچھا ہے

ثمینہ کوثر ______ فیصل آباد

تم نے انداز محبت تو دیکھا ہے انداز وفا نہیں
پنجرہ کھلنے کے باوجود بھی کچھ پنچھی اڑا نہیں کرتے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

وہ یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہوتا ہے

روز مین رحیم ______ کراچی

ہم نے یہ سوچ کر جاں دی ہے محبت میں فراز
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اس کی

امت الصبور

# تاریخ کے جھروکوں سے

## حضرت صالح علیہ السلام

ثمود ایک مشہور قبیلے کا نام ہے۔ یہ جدلیس کے بھائی ثمود کی نسل ہیں۔ یہ دونوں عاثر کے بیٹے تھے، جو ارم کا بیٹا تھا اور ارم نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کا بیٹا تھا۔

یہ دور قدیم کی خالص عربی قوم سے تھے۔ ان کی رہائش تبوک اور حجاز کے درمیان حجر کے مقام پر تھی جسے مدائن صالح بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع شہر مدین کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ قوم ثمود کے مکانات اس علاقے میں پہاڑوں میں کھدے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہمراہ تبوک جاتے وقت اس مقام سے گزرے تھے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہمراہ تبوک تشریف لے گئے تو مقام حجر میں ثمود کے (ویران) گھروں کے قریب فروکش ہوئے۔ لوگوں نے ان کنوؤں سے پانی لے لیا، جو ثمود کے زیر استعمال رہے تھے۔ انہوں نے (اس پانی سے) آٹا گوندھ لیا اور (گوشت پکانے کے لیے آگ پر) دیگیں چڑھا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے حکم دیا کہ اسے استعمال نہ کیا جائے آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے حکم پر دیگیں الٹ دی گئیں اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیا گیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ و سلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو کر اس کنویں کے پاس جا ٹھہرے جہاں سے اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے ان لوگوں کے (ویران) گھروں میں داخل ہونے سے منع فرمایا جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا اور فرمایا۔

"میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بھی ویسا عذاب نہ آ جائے جیسا ان پر آیا تھا، اس لیے ان کے علاقے میں داخل نہ ہوا کرو۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے مقام حجر میں ارشاد فرمایا: "ان عذاب یافتہ لوگوں کے علاقے میں (داخل ہونا پڑے تو) صرف روتے ہوئے داخل ہوا کرو، اگر رونا نہ آئے تو ان کے علاقے میں داخل نہ ہو۔ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آ جائے جو ان پر نازل ہوا تھا۔"

ثمود عربی قوم تھے اور ان کا زمانہ عاد کے بعد کا ہے۔ لیکن انہوں نے عاد کے واقعات سے عبرت حاصل نہ کی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس قوم کے لوگوں کی عمریں بہت طویل تھیں۔ آدمی مٹی سے گھر بناتا تو اس کی موت سے پہلے وہ گھر گر پڑتا۔ چنانچہ انہوں نے پہاڑ کھود کر گھر بنانے شروع کر دیے۔

اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے اپنے ایک بندے کو نبوت کے منصب پر فائز کر کے ان کی طرف بھیجا۔ اس نبی کا نام صالح بن عبید بن ماسح بن عبید بن حادر بن ثمود بن عاثر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو دعوت حق دی لیکن وہ انکار پر ہی مصر رہے بلکہ آپ کو جادو زدہ کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو کوئی معجزہ یا نشانی پیش کریں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا۔ "اگر میں مطالبہ اسی انداز سے پورا کر دوں جیسے تم نے کہا ہے تو کیا تم واقعی اس دین پر ایمان لے آؤ گے جو میں لایا ہوں اور ان امور میں میری تصدیق کرو گے جنہیں دے کر مجھے مبعوث کیا گیا ہے؟" انہوں نے کہا "ہاں! (ہم تجھ پر ایمان لائیں گے اور تیری باتوں کی تصدیق کریں گے۔")

آپؑ نے ان سے پختہ عہد و پیمان لے لیا۔ تب آپ نے کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان لوگوں کا مطالبہ پورا فرمائے۔ اللہ کے حکم سے وہ چٹان پھٹ گئی اور اس میں سے ایک بہت بڑی حاملہ اونٹنی نکلی، جس میں وہ تمام صفات موجود تھیں، جو مطالبہ کرنے والوں نے بیان کی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے معجزہ ظاہر ہوتے دیکھ لیا تو انہیں اس کی عظمت کا احساس ہوا اور وہ مرعوب ہو گئے۔ یہ اللہ کی قدرت کی ایک واضح نشانی اور حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ چنانچہ قوم کے کچھ لوگ ایمان لے آئے۔ لیکن اکثر لوگ کفر و ضلالت اور ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔

وہ اونٹنی ان میں موجود رہی۔ ان کے علاقے میں جہاں سے چاہتی چرتی اور جب کنویں پر پانی پینے جاتی تو کنویں کا سارا پانی پی لیتی۔ چنانچہ لوگ اپنی باری والے دن اگلے دن کے لیے بھی پانی بھر لیتے تھے۔ وہ لوگ اس کا دودھ پیتے اور وہ سب کے لیے کافی ہو جاتا۔ اس لیے آپؑ نے ان سے فرمایا۔

"(ایک دن) اس کی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے "ہم اونٹنی ان کے لیے آزمائش بنا کر بھیجنے والے ہیں۔" آزمائش اس لحاظ سے تھی کہ کیا وہ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان لاتے ہیں یا نہیں؟

صالح علیہ السلام نے فرمایا۔ "تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک معجزہ آ چکا ہے، یعنی یہ ہی اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے معجزہ ہے، سو اسے (آزاد) چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور تم اسے بری نیت سے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ دردناک عذاب تمہیں پکڑ لے گا۔"

ایک عرصہ تک یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ آخر ان کے سردار جمع ہوئے اور مشورہ کے بعد متفقہ فیصلہ کیا کہ اونٹنی کو قتل کر دیں، کہ اس سے جان چھوٹے اور انہیں سارا پانی مل جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "آخر انہوں نے اونٹنی (کی کونچوں) کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے کہ صالح! جس چیز سے تم ہمیں ڈراتے تھے اگر تم (اللہ کے) پیغمبر ہو تو اسے ہم پر لے آؤ۔" (الاعراف۔ 77.7)

سازشی قوم نے اللہ کے معجزے پر ایمان لانے کی بجائے اس پر ظلم و عدوان کیا اور اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا بندوبست کر دیا۔

جس شخص نے اونٹنی کو قتل کرنے کی ذمہ داری اٹھائی، اس کا نام (قدار بن سالف بن جندع) تھا۔ وہ سرخ فام اور نیلی آنکھوں والا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ سالف کی بیوی سے (صبان) کے ناجائز تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس نے سب لوگوں کے متفقہ فیصلے میں اونٹنی کو قتل کیا تھا۔ اس لیے اس کام کی نسبت ان سب کی طرف کی گئی۔

امام ابن جریر (رحمتہ اللہ) اور دیگر مفسرین کا بیان ہے کہ قوم ثمود میں دو عورتیں تھیں۔ ایک کا نام (صدوق بنت محیا بن زہیر بن مختار) تھا، جو مال دار اور اونچے خاندان کی عورت تھی۔ اس نے قبیلہ اسلم کے ایک آدمی سے نکاح کیا، لیکن پھر طلاق لے لی۔ اس نے اپنے چچا زاد (مصدع بن مہرج بن محیا) کو بلا کر کہا۔ "اگر تم اونٹنی کو قتل کر دو تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

دوسری عورت کا نام (عنیزہ) تھا۔ جو (غنیم بن مجلز) کی بیٹی تھی۔ اس کی کنیت (ام غنم) تھی۔ یہ ایک کافر بڑھیا تھی۔ اس کا خاوند (ذواب بن عمرو) ایک

رئیس تھا۔ اس عورت نے قدار بن سالف سے کہا۔ "یہ میری چار بیٹیاں ہیں۔ اگر تم اونٹنی کو قتل کردو تو جس لڑکی سے چاہو گے شادی کردوں گی۔"

چنانچہ یہ دونوں جوان اس کام کے لیے کمربستہ ہوگئے اور قوم کے اور افراد کو بھی ترغیب دی۔ مزید سات افراد ان کے ساتھ آملے اور یوں کل نو افراد ہوگئے۔

انہوں نے باقی قبیلے کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی تو لوگوں نے تائید کی۔ وہ اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے گھات میں بیٹھ گئے۔ جب وہ پانی پی کر واپس آئی تو مصدع نے' جو چھپ کر بیٹھا ہوا تھا' اس پر تیر چلا دیا' جو اس کی پنڈلی کی ہڈی میں پیوست ہوگیا۔ عنیزہ اور اس کی بیٹیاں بھی قدار کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے آگئیں اور انہیں جوش دلانے کے لیے اپنے چہروں سے نقاب الٹ دیے۔ قدار بن سالف نے جلدی سے اونٹنی پر تلوار سے حملہ کیا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ وہ زمین پر گر پڑی اور زور سے آواز نکالی جس سے اس کا بچہ چوکنا ہوگیا اور دور پہاڑ پر چلا گیا اور تین بار بلبلایا۔ قدار نے اونٹنی کے گلے پر نیزہ مار کر اسے قتل کردیا۔

حضرت عبداللہ بن زمعہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران — اونٹنی کا اور اسے قتل کرنے والے کا ذکر کیا اور فرمایا۔ "اسے قتل کرنے کے لیے ایک دلیر سردار اٹھا' جس کی بات مانی جاتی تھی جیسے۔ (قریش میں) ابوزمعہؓ ہے۔"

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔

"کیا میں تجھے نہ بتاؤں کہ سب سے زیادہ بدبخت کون ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "جی ہاں! فرمائیے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "دو شخص ہیں' ایک تو ثمود کا سرخ فام آدمی جس نے اونٹنی کو قتل کیا تھا اور ایک وہ جو تجھے' اے علی! اس جگہ (یعنی سر پر) ضرب لگائے گا' جس سے یہ (یعنی داڑھی) تر ہوجائے گی۔"

جب ان لوگوں نے اونٹنی کو قتل کیا تو اس پر سب سے پہلے قدار بن سالف (لعنۃ اللہ علیہ) نے حملہ کیا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں' وہ زمین پر گر پڑی۔ پھر سب افراد نے جلدی جلدی تلوار سے اس کے ٹکڑے کردیے۔ جب اس کے بچے نے یہ دیکھا تو بھاگ کر سب سے اونچے پہاڑ پر چڑھ گیا اور تین بار بلبلایا۔ اس لیے حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا۔

"اپنے گھروں میں تین دن اور فائدہ اٹھالو۔"

یعنی انہیں اس دن کے علاوہ تین دن کی مہلت دی گئی۔ انہوں نے اس موکد وعید پر بھی اعتبار نہ کیا' بلکہ شام ہوئی تو انہوں نے پروگرام بنایا کہ حضرت صالح علیہ السلام کو بھی شہید کردیا جائے۔ چنانچہ سب قسمیں کھا کر کہنے لگے۔

"ہم رات کو صالح علیہ السلام کے گھر میں گھس کر آپؑ کو اہل وعیال سمیت شہید کردیں گے۔ پھر اگر آپ کے اقارب نے قصاص یا دیت کا مطالبہ کیا تو ہم مکر جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے قتل نہیں کیا۔"

جن افراد نے حضرت صالح علیہ السلام کو شہید کرنے کی سازش تیار کی تھی' اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کی قوم سے پہلے ہی عذاب نازل فرمادیا اور ان پر پتھر برسا کر کچل ڈالا اور تباہ کردیا۔ جب مہلت کا پہلا دن یعنی جمعرات کا دن آیا تو ان کے چہرے زرد ہوگئے' جیسے صالح علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ شام ہوئی تو انہوں نے کہا۔

"مہلت کا ایک دن تو گزر گیا۔"

جب دوسرے دن یعنی جمعہ کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے سرخ ہوگئے۔ شام ہوئی تو انہوں نے کہا۔

"مہلت کے دو دن گزر گئے۔"

جب مہلت کا تیسرا دن آیا یعنی ہفتے کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے سیاہ ہوگئے۔ شام ہوئی تو انہوں نے کہا۔

"(صالح کی کہی ہوئی) مہلت تو ختم ہوگئی۔" جب



اتوار کی صبح ہوئی تو انہوں نے خوشبو لگائی اور تیار ہو کر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں کون سا عذاب آتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے اور ان پر کس طرف سے عذاب آنے والا ہے۔

جب سورج طلوع ہوا تو آسمان سے ایک شدید آواز آئی اور نیچے سے زلزلہ آگیا۔ چنانچہ تمام افراد کی روحیں پرواز کر گئیں' وہ مر کر بے حس و حرکت اور خاموش ہوگئے۔ وہ اپنے گھروں میں جیسے بیٹھے تھے' ویسے ہی بیٹھے بیٹھے بے جان اجسام میں تبدیل ہوگئے اور حرکت بھی نہ کرسکے۔ ان میں سے صرف ایک لونڈی زندہ بچ گئی جو چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ اس کا نام "کلبہ بنت سلق" تھا اور اسے "ذریعہ" بھی کہتے تھے۔ وہ بھی کافرہ تھی اور صالح علیہ السلام کی سخت دشمن تھی۔ جب اس نے عذاب دیکھا تو اسے چلنے کی طاقت مل گئی چنانچہ وہ انتہائی تیزی سے بھاگی حتیٰ کہ عربوں کے ایک قبیلے کے پاس جا پہنچی۔ اس نے تمام چشم دید واقعہ سنایا اور قوم پر آنے والے عذاب کی خبر دی۔ پھر پانی مانگا۔ جب اس نے پانی پیا تو وہ بھی مر گئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "یوں محسوس ہوتا کہ وہ کبھی یہاں بسے اور آباد ہی نہیں ہوئے۔" یعنی اس طرح فنا ہوگئے گویا کبھی تھے ہی نہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کی تباہی و بربادی پر نہایت غم و حسرت کا اظہار فرمایا۔

"میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچایا تھا اور تمہارا بھلا چاہا تھا۔"

بدر کے کنویں میں جن مقتول کافروں کو پھینکا گیا تھا' اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن بعد ان سے بھی اسی طرح خطاب فرمایا تھا۔ رات کے آخری حصے میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا تھا اور خود سواری پر تشریف فرما ہوچکے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے کنویں والو! تمہارے رب نے تم سے جو وعدہ کیا تھا' کیا تم نے اسے پورا ہوتے دیکھ لیا؟ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ فرمایا تھا' میں نے تو اسے پورا ہوتے دیکھ لیا ہے۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ان لاشوں کو مخاطب کرکے یہ بھی فرمایا تھا۔ "تم اپنے نبی کے لیے اس کا برا خاندان ثابت ہوئے۔ تم نے اس وقت مجھے جھوٹا کہا جب لوگوں نے مجھے سچا مانا' تم نے مجھے اس وقت (وطن سے) نکالا' جب لوگوں نے مجھے جگہ دی' تم نے اس وقت مجھ سے لڑائی کی' جب لوگوں نے میری مدد کی۔ تم اپنے نبی کے لیے نبی کا برا خاندان ثابت ہوئے۔"

بعض علماء رحمتہ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت صالح علیہ السلام حرم شریف میں تشریف لے گئے اور وفات تک وہیں مقیم رہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم جب مقام حجر سے گزرے تو فرمایا۔

"معجزات کا مطالبہ نہ کرو' صالح علیہ السلام کی قوم نے یہ مطالبہ کیا تھا تو وہ (اونٹنی کی صورت میں) ظاہر ہوگیا۔ وہ اس راہ سے پانی پینے آتی تھی اور اس راستے سے واپس جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے رب کا حکم نہ مانتے ہوئے سرکشی کی اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ ایک دن وہ پانی پیتی تھی اور دوسرے دن وہ اس کا دودھ پیتے تھے۔ جب انہوں نے اسے مار ڈالا تو ان پر ایسی سخت چیخ کا عذاب آیا' جس سے تمام لوگ ہلاک ہوگئے' صرف ایک آدمی بچا جو (اس وقت) حرم کی سرزمین میں تھا۔"

صحابہؓ نے عرض کی۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون تھا؟"

فرمایا۔ "وہ ابورغال تھا۔ جب وہ حرم کی حدود سے نکلا تو وہ بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آگیا' جو اس کی قوم پر آیا تھا۔"

آمنت الصبور

## عابد علی کی بے خبری

معروف اداکار و ماڈل ایمان علی فلم "بول" میں شاندار اداکاری کے بعد آج کل پھر لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ نامور اداکار کی بیٹی ہونے کے باوجود ایمان علی نے اس شعبے میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر کامیابی حاصل کی ہے اور طویل جدوجہد کا دریا عبور کیا ہے۔ آج کی معروف اداکارہ و سپر ماڈل کو اپنی جدوجہد کے آغاز میں کوئی نہیں پہچانتا تھا' خود ان کے والد عابد علی بھی نہیں۔ جی ہاں! یہ بالکل سچ ہے۔ عابد علی نے اپنے ایک انٹرویو میں خود اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے قصہ کچھ یوں ہے کہ ....

ایک دن عابد علی اپنی بیگم حمیرا چوہدری کے ہمراہ لانگ ڈرائیو پر نکلے تو ان کی نظر سڑک کے کنارے لگے ایک سائن بورڈ پر پڑی۔ اس میں ماڈل کی تصویر دیکھ کر انہوں نے حمیرا سے اس کی تعریف کی' تب انہوں نے عابد علی کو فخریہ بتایا کہ یہ ان کی اپنی بیٹی ایمان ہے۔

## علی ظفر کی خواہش

معروف گلوکار و اداکار علی ظفر کی مصورانہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کی شریک حیات بھی ان کو اسی فن کی بدولت ملی ہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ علی اپنے پہلے میوزک البم کی ریکارڈنگ کے لیے پیسہ جمع کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لوگوں کے پورٹریٹ بنانے لگے۔ اسی دوران وہاں عائشہ اپنا پورٹریٹ بنوانے آ گئیں اور یوں علی ظفر پورٹریٹ میں رنگ بھرتے بھرتے اپنی حیات کو عائشہ کی تصویر سے سجا بیٹھے۔ اب علی کی خواہش ہے کہ وہ بالی ووڈ کے ممتاز اداکار امیتابھ بچن کی تصویر بھی بنائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ علی کی یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔

## جوہر شناسی

معروف ہدایت کار محسن رضوی نے اپنی زندگی کے ایک دلچسپ واقعے کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ کراچی کی ایک مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک خوب صورت خاتون پر پڑی۔ محسن رضوی کی جوہر شناس نظریں ان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے ان خاتون کو فوراً "ماڈلنگ کی پیشکش کر دی۔ ساتھ ہی اپنا کارڈ دے دیا اور کہا کہ "اگر آپ ماڈلنگ کے لیے



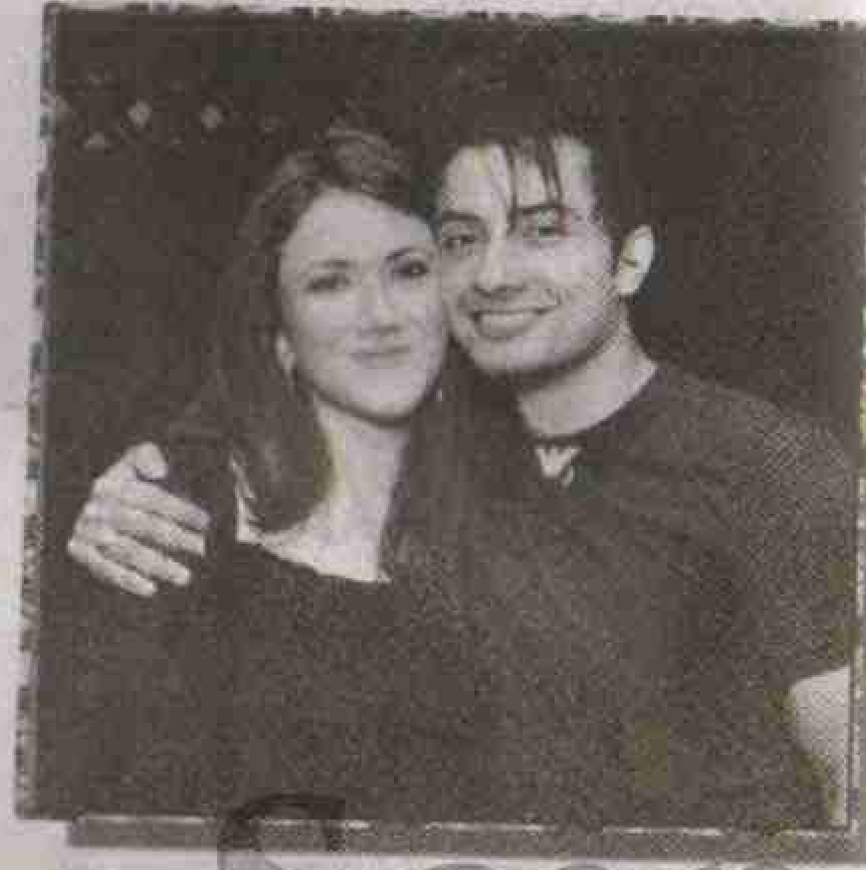

راضی ہوں تو دو دن بعد اپنے والد یا بھائی کے ساتھ میرے دفتر آ جائیں۔" آج وہ خاتون ملک کی معروف ماڈل ہیں۔ سچ ہے قسمت کو مہربان ہونا ہوتا ہے تو وہ راہ چلتے بھی ہو جاتی ہے' ورنہ طویل تر جدوجہد کے پُرخطر سفر بھی رائیگاں جاتے ہیں۔

محسن صاحب! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ان خاتون کا نام بھی بتا دیتے تاکہ ہم اس بات کا تعین تو کر لیتے کہ آپ کی نظریں واقعی جوہر شناس ہیں یا ....؟

## حیرانی

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ عمران عباس اچانک حیران ہو گئے۔ ان کی یہ حیرت کسی ڈرامے کا حصہ نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے ذاتی تاثرات پر مبنی تھی۔ اپنی اس حیرت کا قصہ انہوں نے ایک ٹی وی انٹرویو میں بیان کیا۔ عمران بتاتے ہیں کہ وہ اس وقت حیران رہ گئے' "جب انہیں عظیم اداکار دلیپ کمار کا فون موصول ہوا۔ دلیپ کمار نے عمران کے ڈرامے دیکھ کر انہیں فون کیا اور ان کی بے پناہ تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں بہت خوشی ہو گی کہ آپ جیسا خوبرو اداکار ہماری فلموں میں کام کرے' جو صرف اچھی شکل و صورت کا مالک ہی نہیں' بلکہ اداکاری کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہے۔"

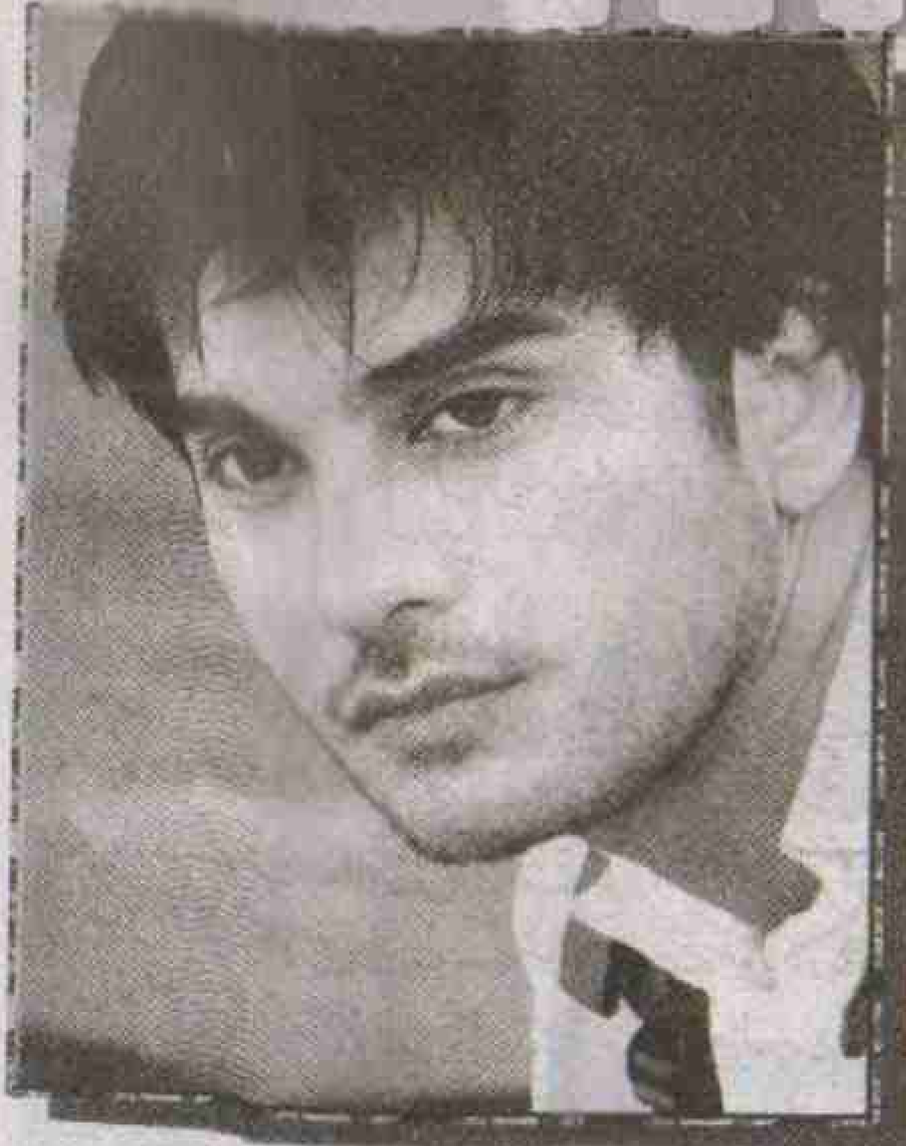

جی ہاں! آپ صحیح سمجھے' دلیپ کمار نے عمران عباس کو اپنی پروڈکشن کے تحت بننے والی ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی ہے۔ لو جی! ہمارے ٹیلنٹ پر ایک اور بھارتی ڈاکہ۔

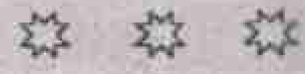

## یہ بیان کالمانہ

★ الیکٹرانک میڈیا جس کے نزدیک گالی بھی ایک خبر ہے اور گولی بھی..... خبر دینے اور فساد پھیلانے کے فرق سے نا آشنا..... سب سے پہلے کی دوڑ میں بھٹکتا..... جن کے لیے ریٹنگ ہی سب کچھ ہے۔ ڈگڈگی بجانے اور بندر نچانے والے کی سطح پر آ گئے۔ نتیجہ کراچی ایک بار پھر خون میں نہا گیا (مشتاق احمد خان۔ نقارہ)

★ امریکہ افغانستان سے جانا چاہتا ہے تو اس طرح کہ طالبان اس کی بات مان کر ایسی حکومت کا حصہ بن جائیں جس کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھ میں ہو۔ واہ! افغانستان نہ ہوا' پاکستان ہو گیا۔ (عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

★ انتخابی نتائج میں کامیابی کا حق پر ہونے کی دلیل نہیں قرآن پاک میں پچیس انبیاء کا تذکرہ ہے، دیگر الہامی کتب اور اسرائیلی روایات کو سامنے رکھا جائے تو ہمیں 35-30 کے لگ بھگ پیغمبروں کے نام اور ان کے تذکرے ملتے ہیں۔ ایک بڑا سوال ہے کہ ان میں سے کتنے انبیاء نے وہ کامیابی حاصل کی جسے دنیاوی نگاہ میں کامیابی کہا جاتا ہے۔ شاید تین یا چار۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسفؑ (محمد ابراہیم عزمی)

★ آزاد کشمیر میں انتخابات میں جو دھاندلی ہوئی ہے وہ اپنی جگہ 20 بار پھانسی سے کم نہیں ہے۔ مثلاً "ایک جگہ ایک خاتون کے چالیس بچے دکھائے گئے اور مزے کی بات کہ چالیس کے چالیس بچوں کے ووٹ بھی کاسٹ ہوئے۔ (عبداللہ طارق سہیل، وغیرہ وغیرہ)

★ امریکا پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب افغانستان، عراق اور لیبیا میں اسے کامیابی نہیں مل سکی تو یہ ایک کثیر آبادی والا نیوکلیر پاور ملک ہے۔ (اجیت ساہی سینیئر جرنلسٹ دہلی)

★ میرا اللہ یہ حکم دیتا ہے کہ اپنے گناہ کو دوسروں کے سامنے بیان کرکے اپنے خلاف گواہ مت پیدا کرو۔ گناہ جب تک بندے اور اللہ کے درمیان رہتا ہے تو توبہ کی قبولیت کے قریب ہوتا ہے، لیکن گواہ بناؤ گے تو مقدمہ درج ہو گیا اور سزا لازم۔ (اوریا مقبول جان حرف راز)

★ ترکی نے ترقی اور خوشحالی مولوی قسم کے سیاست دانوں کے ذریعے ہی حاصل کی۔ (جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)

★ اگرچہ ہمارے امریکا نواز دانش وروں کو یہ بات ہضم نہیں ہوگی لیکن باقی دنیا کو دکھائی دینے والا سچ یہ ہے کہ امریکا نے افغانستان میں جنگ ہار دی ہے۔ افغانستان میں لاکھ کے قریب لاشیں گرانے اور انفرااسٹرکچر اور بستیوں کو ملبے کا ڈھیر بنانے کے سوا اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، الٹا اس کی اپنی معیشت کا دیوالہ پٹ گیا۔ (عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

★ مختاراں مائی نے عالمی سطح پر شہرت کمانے کے بعد سیاست شروع کردی۔ 21 جون 2006ء کو نو سالہ بچی کے ساتھ زیادتی کے کیس پر مختاراں مائی نے عدالت کے بجائے پنچایت بٹھانے کا کہا اور اپنے بھائی حضور بخش کو پنچایت کا سربراہ بنایا۔ حضور بخش نے نو سالہ لڑکی کے ساتھ زیادتی کرنے والے ملزم فیضان کو حکم دیا کہ وہ اپنی نو سالہ بہن کو لڑکی کے بوڑھے باپ سے بیاہ دے۔ (وکی لیکس کا انکشاف)

## بدایوں کے پیڑے اور کراچی کا حلوہ

انور مقصود کی بیگم عمرانہ مقصود اور عامرہ عالم کی کتاب "بدایوں کے پیڑے اور کراچی کا حلوہ" کی تقریب رونمائی گزشتہ دنوں ڈیفنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ جی ہاں! یہ کتاب دو مصنفین کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ عامرہ عالم عمرانہ مقصود کی بہن اور "دوشیزہ" میگزین کی مدیرہ بھی ہیں یہ کتاب دراصل عمرانہ مقصود اور عامرہ عالم کے بچپن کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تقریب رونمائی ایک غیر رسمی تقریب تھی جس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ تقریب اپنے مقررہ وقت پر شروع ہوئی، جس پر ہمیں خوش گوار حیرت ہوئی۔ کتاب پر اظہار خیال کرنے والوں میں فاطمہ ثریا بجیا، زبیدہ طارق، عامرہ عالم، عمرانہ مقصود اور انور مقصود شامل تھے۔ تقریب کے آخر میں لذت کام و دہن کا انتظام کیا گیا تھا جس کی انفرادیت یہ تھی کہ کتاب کے نام کی مناسبت سے میز پر "بدایوں کے پیڑے اور کراچی کا حلوہ" بطور خاص موجود تھے۔ شرکائے تقریب نے ان سے بھرپور انصاف کیا۔

## بقیہ سروے

پہلا سوال عمیرہ احمد سے یہ ہوگا کہ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی ضروری ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

نگہت سیما' سے لکھنا آپ کا شوق' ضرورت یا مقصد؟

رفعت سراج سے۔ کیا آپ میری استاد بن کر مجھے قلم چلانے کا ہنر سکھائیں گی؟

عنیزہ سید سے۔ آپ کے خیال میں عورتوں کو گھر کے اندر اور باہر کتنی خود مختاری ملنی چاہیے۔

عالیہ بخاری سے۔ کیا اعلا خاندان کے اوصاف عام لوگوں میں نہیں پائے جاتے؟ ان لوگوں سے غلطی یا کوئی گناہ ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ ان کی ذات ہی گھٹیا اور نیچ ہے۔ ان کا خون گندہ ہے؟ آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟

نمرہ احمد سے۔ کیا عورت کو اپنی ذات کے خلاف کیے گئے فیصلے پہ مرد کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے یا وہ ہمیشہ اس کے حکم پہ سر جھکاتی رہے۔

راحت جبیں سے۔ عورت کو اپنی ذات کو کس حد تک اہمیت دینی چاہیے؟ کنیز نبوی سے شاہ عبداللطیف بھٹائی نے عورت کی جن خوبیوں کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے' آپ ان خوبیوں کو اپنی ذات میں کس حد تک دیکھتی ہیں؟

رخسانہ نگار عدنان سے۔ لکھنے کے لیے آپ نے اپنی زندگی سے کن چیزوں کو نکال کر باہر پھینکا؟

### شائستہ اکبر...... گڈو

آپ کے سوالات ہمیشہ منفرد ہوتے ہیں اور ہم ان کو لکھنے اور جوابات دینے میں بہت انجوائے کرتے ہیں۔

1۔ میں نے سب سے زیادہ "فریا عبدالرحمان" کو اپنے دل کے بہت قریب سمجھا۔ اس لیے محبتیں کرنے والی فری سے میرا دوستی کرنے کو دل چاہا۔ مجھے فرحت اشتیاق کی فریا عبدالرحمان سے بھی بہت محبت ہے اور اس کردار کو تخلیق کرنے والی فرحت اشتیاق سے بھی۔

2۔ بہت انوکھا سوال ہے۔ اگر میں کسی ایسی تقریب میں جاؤں' جہاں مصنفین کا اجتماع ہو تو میں اپنی فیورٹ مصنفہ فرحت اشتیاق سے یہ سوال کروں گی' "کہ وہ کچھ اپنی زندگی کے بارے میں لکھیں۔ کچھ اپنی دل کی لکھیں پوری سچائی کے ساتھ۔"

### شہابیہ گل...... عیسیٰ خیل

عیسیٰ خیل میانوالی کی ایک چھوٹی سی تحصیل ہے۔ کافی پسماندہ علاقہ ہے' تعلیم کی سہولتیں بھی محدود ہیں۔ میں نے حال ہی میں بی اے کا امتحان دیا ہے۔

1۔ یوں تو شعاع کی بے شمار کہانیاں دل پہ نقش ہیں۔ فرحت اشتیاق کی "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر" مجھے بہت پسند ہے۔ اس تحریر میں فریا عبدالرحمان کا کردار ایسا تھا کہ جس سے مجھے خاص دلی لگاؤ محسوس ہوا' کیونکہ اسپینش باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کی سوچ خالص مشرقی لڑکیوں جیسی تھی اور اس نے اپنی ڈائری میں جو الفاظ لکھے' وہ مجھے ازبر ہو گئے کہ

"محبت ہم لڑکیوں کے بس کا روگ نہیں۔ ہم کرلیں تو نبھانا مشکل' نبھالیں تو زندگی گزارنا مشکل۔"

وہ جو لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتی ہیں' ان کے سامنے کوئی کیونکر کچھ بول سکتا ہے۔ بہرحال! ہم نے اچانک ایک شدت پسند اپنے اصولوں پر اٹل اور سمجھوتا نہ کرنے والی جذبوں کی انتہا کو چھوتی ہوئی ایک رائٹر کے قریب پہنچتے ہی سوال داغ دیا۔

"سالار (پیر کامل) کا ایڈریس مل سکتا ہے۔ عمیرہ جی!

(ہاہاہا)

### طاہرہ نواز...... کوٹ ادو

1۔ ہماری تمام مصنفین بڑی محنت اور بڑی محبت سے کہانیاں تخلیق کرتی ہیں۔ عمیرہ' نمرہ' فرحت' کنیز نبوی' رخسانہ نگار اور باقی سب کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے۔ "متاع جاں کی" سفیہ سجاد' "قراقرم کا تاج محل" کی "پریشے" وغیرہ سب سے دوستی تو کہانی پڑھنے کے دوران ہی ہو جاتی ہے۔

2۔ کاش کہ کوئی ایسا موقع ملے جہاں تمام مصنفین جمع ہوں اور ہم بھی انہیں دیکھ سکیں۔ ان سے کچھ پوچھ سکیں۔ ان سے مل کر میں تو اس قدر خوشی سے حواس باختہ ہو جاؤں گی سوال و جواب کی زحمت ہی نہیں کروں گی۔ اس کے علاوہ شعاع کو اپنی 26 ویں سالگرہ مبارک ہو شعاع کے لیے۔



تیری حیات کا ہر لمحہ شادماں گزرے
بہاریں سجدہ کریں تو جہاں جہاں گزرے
خدا نصیب کرے تجھ کو دائمی خوشیاں
تو سرخرو رہے جب بھی امتحاں گزرے

### مسز عبدالوحید...... لاہور

1۔ شعاع کی تمام مصنفین کی تحریریں قابل تعریف ہیں۔ ان کی تعریف کرنا' کوزے میں دریا بند کر دینے کے مترادف ہے۔

آسیہ رزاقی کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں ان کی کہانی "پہلی نظر کا انعام" کی "آنسہ" کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ نگہت سیما کی تحریر جو کہ نومبر 2004ء میں چھپی تھی ہی کی علیزہ کا کردار ناول کا نام تھا "ایک تھی علیزہ" جو کہ آج تک یاد ہے۔ اس میں اس کی ذہانت اور سادگی و معصومیت بہت پسند آئی۔

فرحت کے تو کیا ہی کہنے ویل ڈن فرحت! ان کی تحریر "وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر" کی "فریا" سے ملنے کو دل چاہا اور اس کے دکھ پر ساتھ رونا چاہا۔ فریا کی سعادت مندی پسند آئی۔

رفعت سراج کی "دل دیا دہلیز" کی "روشانے" اور اس کا غصہ بھرا انداز بہت بھایا۔ نایاب جیلانی کی تحریر "پرکھ" میں "ملشہ" کا کردار اور اس کی سعادت مندی اور دوسروں کا خیال رکھنے کا جذبہ۔

نمرہ بخاری کی تمام تحریریں اور کردار اپنی طرز میں بہت مختلف اور اچھوتے ہوتے ہیں' جن میں پنجاب کی گرم زمینوں کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔

کنیز نبوی کی تحریر "جن صدائیں سو جھرو" کی "ماروی" رخسانہ نگار کی تحریر اب سفر کا استعارہ اور ہے کی ہیروئین کینہ کا کردار اور صبر بے مثال تھا۔

رخسانہ ہی کی تحریر "دھند کے پار" کی "نائلہ" کا کردار بہت ہی بے مثال تھا جو کہ کبھی نہ بھولے گا۔

نمرہ احمد کی تمام تحریریں بہت ہی بے مثال ہیں جو کہ ہمیشہ ہی ناقابل فراموش رہیں گی "قراقرم کا تاج محل" ایک یادگار تحریر اور ادب کی دنیا کا تاج محل' اس کی ڈاکٹر پریشے جہاں زیب کا کردار اور "پہلی راجپوتاں کی ملکہ" میں "مایا فرینڈز" کا کردار اور رائٹر کا بیان اس کی پرسنالٹی کے بارے میں بے ساختہ ملنے کو دل چاہا۔

راحت کی تحریر "زرد موسم" کی "ایمن" اور "سفر تمام ہوا" میں "رجا کا کردار" جو کہ ایک ابنارمل لڑکی کا کردار تھا' ناقابل فراموش تھا۔ میں نے اس میں راحت کے فن کی انتہا دیکھی۔ راحت کی منظر کشی کی بہترین صلاحیت کی وجہ سے اس کہانی کے کرداروں کے گھر تک خیالی دنیا میں محفوظ ہو گئے۔ راحت کی تحریروں میں سے "منظر بدل گیا ہے" کی "لیلیٰ" اک البیلی پگڈنڈی" ہے۔ "یہ موسم سبز پتوں کا" یادگار تحریریں ہیں۔

عنیزہ سید کی تحریر "بیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے" کی "لالہ رخ" اور عمر لنگھیاں' پیہاں پار" کی آمنہ کا کردار مندرجہ بالا تمام کرداروں سے ان کی اپنی اپنی خوبیوں کی بناء پر ملنے کو دل چاہا تمام مصنفین کی اور بھی کافی زیادہ تحریریں ہیں جو کہ ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہیں۔

2۔ کاش یہ سچ ہو تا کہ تمام رائٹرز میرے سامنے ہیں اور میں ان سے مل رہی ہوں۔ سب سے پہلے میں راحت سے پوچھتی کہ اتنی اچھی منظر نگاری کہاں سے سیکھی کہ "بہار پھولوں میں اتر آئی" ان کی تحریروں سے ہی مجھے پھولوں کی مہک آتی ہے۔

فرحت کے پاس محبت کی چاشنی و مٹھاس کی آج کی دنیا میں اتنی فراوانی' I Love farhat' وہ اتنا میٹھا کیسے لکھ لیتی ہیں۔

نمرہ بخاری سے ضرور پوچھوں گی کہ پاکستان ریلوے کی وہ اتنی مداح کیوں ہیں۔ میں انہیں کہوں گی کہ وہ ایک اچھی سی دادی اور نانی مجھے بھی لا دیں۔ مجھے ان رشتوں کا پیار نہیں ملا' خاص کر دادا اور دادی۔

نمرہ احمد سے کہوں گی کہ مجھے پریشے سے ملوا دیں نمرہ اتنی انفارمیشن کہاں سے لاتی ہیں۔

نگہت سے کہوں گی' اپنی تحریر کی روانی مجھے دے دیں۔

عمیرہ کے ہاتھ چوموں گی' جس نے پیر کامل تحریر کیا۔

عنیزہ کی تحریروں میں جو فسوں خیزی ہے' وہ کیسے آجاتی ہے۔

فاخرہ سے کہوں گی کہ دوبارہ آجاؤ ہماری دنیا میں۔

میمونہ سے کہوں گی کہ "تیری راہ میں رل گئی وے" کی ذوباریہ جیسے کردار دوبارہ کیوں نہیں تخلیق کیے۔

# رمضان کے پکوان

خالدہ جیلانی

## چکن پکوڑے

اجزا:

| | |
|---|---|
| بغیر ہڈی کا چکن | 1/2، 1 پاؤ |
| پیاز باریک | 1 عدد |
| لہسن | 3 جوے |
| سبز مرچ | 2 عدد |
| سرخ مرچ | 1/2 چائے کا چمچ |
| بیسن | 1/2 پاؤ |
| پسا ہوا زیرہ | 1 چائے کا چمچ |
| پسا گرم مسالا | 1/2 چائے کا چمچ |
| میٹھا سوڈا | 1 چٹکی |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل | تلنے کے لیے |

ترکیب:

پیاز، لہسن، سبز مرچ آدھا کپ پانی میں بلینڈ کرکے پیسٹ بنالیں۔ ایک برتن میں بیسن، زیرہ، گرم مسالا، سرخ مرچ، نمک اور میٹھا سوڈا مکس کرلیں۔ اب اس میں چکن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے ڈالیں اور اچھی طرح مکس کرلیں تاکہ چکن پر بیسن کی تہہ بن جائے۔ تیل گرم کرکے گولڈن براؤن ہونے تک تلیں۔ کیچپ یا املی کی کھٹی چٹنی کے ساتھ خود بھی کھائیں اور گھر والوں کو بھی افطاری پر پکوڑوں کا نیا مزا ٹیسٹ کروائیں۔

## چکن نگٹس

اجزا:

| | |
|---|---|
| مرغی کا قیمہ | 1/2 کلو |
| انڈا | 1 عدد |
| پاپے کا چورا | 1 کپ |
| بریڈ کرمز | 3/4 کپ |
| پارسلے کٹا ہوا | 2 کھانے کے چمچ |
| سفید مرچ پاؤڈر | حسب ذائقہ |

ترکیب:

ایک پیالے میں مرغی کا قیمہ، انڈا، بریڈ کرمز (ڈبل روٹی کا چورا)، پارسلے، نمک اور سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کریں اور چھوٹے چھوٹے نگٹس بنالیں۔

پاپے کے چورے میں اچھی طرح لپیٹیں پھر فرائی پان میں تیل گرم کرکے اس میں تیار کیے ہوئے نگٹس ڈال کر درمیانی آنچ پر گولڈن ہونے تک تلیں۔ مزیدار چکن نگٹس تیار ہیں۔ ٹوکیچپ کے ساتھ افطار پر پیش کریں۔

## چنا چاٹ

اجزا:

| | |
|---|---|
| کابلی چنے ابلے ہوئے | 1/2 کلو |
| ہری پیاز | 6 عدد |
| لیموں کا رس | 2 چائے کے چمچ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| پسی سیاہ مرچ | حسب ذائقہ |
| زیتون کا تیل | 2 کھانے کے چمچ |
| پارسلے کٹا ہوا | 4 کھانے کے چمچ |

ترکیب:

چنوں کا پانی نتھار کر ایک طرف رکھ لیں۔ ہری پیاز کے سفید حصے سلائس کی طرح کاٹ لیں جبکہ ہرے حصے کو تقریباً "3 انچ لمبے کاٹ لیں۔

ایک بڑے برتن میں زیتون کا تیل اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب اس میں چنے، ہری پیاز (دونوں حصے) اور پارسلے ڈال کر مکس کریں۔

آخر میں نمک اور پسی ہوئی کالی مرچ ڈال کر ہلکا سا الٹ پلٹ کریں۔ ساتھ ہی لیموں کا رس بھی اوپر چھڑک دیں۔ اس سال رمضان میں افطار پر چاٹ کا نیا ذائقہ متعارف کروائیں۔

## آملیٹ

اجزا:

| | |
|---|---|
| انڈے | 4 عدد |
| نمک | حسب ذائقہ |
| پسی سیاہ مرچ | حسب ذائقہ |
| تیل | تلنے کے لیے |

ترکیب:

انڈوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس میں پسی ہوئی سیاہ مرچ اور نمک ڈال کر مزید پھینٹ لیں۔ ایک فرائی پان میں تیل گرم کرکے انڈے کا آمیزہ ڈال دیں اور کم از کم 60 سیکنڈ تک اس کے سیٹ ہونے تک انتظار کریں۔ جب ایک سائیڈ مناسب براؤن ہو جائے تو چمچے کی مدد سے پلٹ دیں۔ جب دونوں اطراف سے پک جائے تو اتار لیں۔ سحری کے لیے جھٹ پٹ تیار ہونے والی آسان ترکیب اس سال رمضان المبارک میں ضرور استعمال کریں۔

## کیری کا مربہ

ضروری اجزا:

| | |
|---|---|
| کیریاں اچھی والی | دو کلو |
| چینی | ڈیڑھ کلو |
| الائچی سبز | بارہ عدد |
| گھی | ایک پاؤ |

کیریاں دھو کر خشک کرلیں۔ پھر ان کو چھیلیں اور چار ٹکڑے کرلیں۔ گٹھلی نکال دیں۔ اب ایک پتیلی میں گھی گرم کریں اور اس میں الائچی کے دانے ڈال دیں۔ جب کڑکڑا جائے تو اس میں دو سیر پانی ڈال کر پکائیں۔ دو چار ابال آنے کے بعد اس میں کٹی ہوئی کیریاں ڈال دیں۔ پھر دو منٹ پکنے کے بعد چینی ڈال دیں اور آدھ گھنٹہ پکنے دیں۔ جب کیریاں گل جائیں تو اتار لیں۔ ٹھنڈا کرکے شیشے کے جار میں محفوظ کرلیں۔

# رمضان المبارک میں صحت بخش غذائیں

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ ہمارے مذہب میں ہمیشہ تھوڑی بھوک چھوڑ کر کھانا کھانے کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ طبی ماہرین بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ بھوک رکھ کر کھانا ہمارے جسم کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ رمضان کا مہینہ ہمیں قدرت کی طرف سے یہ مشق اختیار کرنے کے لیے فراہم ہوا ہے۔ تاہم اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہم رمضان میں عام دنوں سے کہیں زیادہ مقدار میں خوراک استعمال کر کے روزے کے روحانی اور طبی فوائد سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔ سحرو افطار کے وقت ہماری یہ ہی کوشش ہوتی ہے کہ دنیا جہان کی نعمتیں اپنے دسترخوان کی زینت بنالیں۔ ہم سحری میں کھجلہ، پھینی، انڈے، پراٹھے اور افطار میں پکوڑے، سموسے اور رولز وغیرہ تناول کر کے جسم میں زائد مقدار میں کیلوریز جمع کر لیتے ہیں۔ اسی زائد خوراک کی بدولت روزے میں بھی بدہضمی اور طبیعت میں گرانی کی شکایت ہو جاتی ہے ہمیں چاہیے کہ مناسب مقدار میں متوازن غذا کا استعمال کریں تاکہ پورا مہینہ تمام امور کی مستعدی سے انجام دہی کے ساتھ ساتھ خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت بھی کر سکیں۔

پیاری بہنو! آج ہم آپ کو رمضان المبارک کے لیے چند اہم باتوں اور مشوروں سے آگاہ کر رہے ہیں کہ جنہیں اپنا کر آپ روزوں کے صحیح فیوض و برکات سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے حسن و خوب صورتی کو بھی ماند پڑنے سے بچا سکیں گی بلکہ چہرے کی تروتازگی و شادابی میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ اضافہ کر سکیں گی اور ضرورت سے زائد کیلوریز کو چربی کی تہ کی صورت میں جسم پر چڑھانے سے بھی محفوظ رہیں گی۔

1 سحرو افطار میں مرغن اور ثقیل [illegible] کرنے کے بجائے سادہ اور غذائیت سے بھرپور اشیا کا انتخاب کریں۔ کھجلہ، پھینی، سموسے، رول اور گھی میں تیار کردہ دیگر پرتکلف غذائیں نظام ہضم پر بوجھ ثابت ہوتی ہیں، ان کو اعتدال میں رہتے ہوئے استعمال کریں۔

2 سحرو افطار میں کھجور بہ طور خاص شامل کریں۔ کھجور کا استعمال برکت کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین اور مکمل غذا بھی ہے۔ اس میں شامل طاقت ور غذائی اجزا جسم کو فوری توانائی فراہم کرتے ہیں۔

3 پھل اور سبزیاں بہ کثرت استعمال کریں کیونکہ یہ سادہ اور صحت بخش غذا ہے، لہٰذا افطار میں فروٹ چاٹ، چھولوں کی چاٹ اور تازہ سبزیوں کا سلاد استعمال کریں۔ سحری میں سبزیاں اور ترکاریاں بطور سالن استعمال کرنا روزے کے دوران بدہضمی اور گرانی سے محفوظ رکھے گا۔

4 طبی ماہرین دہی کو ایک مکمل غذا قرار دیتے ہیں۔ سحرو افطار میں دہی اور لسی کا استعمال دن بھر پیاس سے محفوظ رکھتا ہے اور توانائی کے بہترین حصول کا باعث بھی ہے۔ تازہ ترین جاپانی تحقیق کے مطابق روزانہ دہی کھانے سے مسوڑھے صحت مند رہتے ہیں۔ نیز بال، ناخن اور جلد بھی چمک دار اور تروتازہ رہتی ہے۔ دہی کا باقاعدہ استعمال جگر، معدہ، فساد خون اور آنتوں کے امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ پیٹ کی تمام تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ نیز دہی کی لسی گردوں اور شوگر کے مریضوں کے لیے بھی مفید ہے۔

5 بہتر صحت اور چمکتی جلد کے لیے روزانہ کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ روزوں کے [illegible] پانی نہ پینے سے جسم میں پانی کی کمی [illegible] افطار اور ان دونوں کے درمیانی اوقات میں پانی خوب استعمال کریں تاکہ آپ کی جلد [illegible] سے محفوظ رہ سکے۔ ✡